

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ص

صَاحِبُ الْحَوْتِ

حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔ (۱۸/۳۸)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”یونسؑ“۔

صالح علیہ السلام

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادیِ اولیٰ کے بعد کا ہے (دیکھئے عنوان ہودؑ)۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیِ قریٰ کہتے تھے۔ حِجْر ان کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ ان کا علاقہ بڑا پرفضا اور زرخیز تھا (۳۶/۳۷)۔ یہ لوگ میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے تھے جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (۳۷/۳۸)۔

اس قوم کی طرف، انہی کے بھائی بند، حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (۳۷/۳۸)۔ انہوں نے ان تک وہی پیغام پہنچایا جو اس سے پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ اپنی اپنی قوم تک پہنچا چکے تھے (دیکھئے عنوانات نوح اور ہود)۔ یعنی بِتَّقُوا اللَّهَ اَعْبُدُوْهُ وَاَلِهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (۳۷/۳۸)۔ ”اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ نہیں“۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لَا تَعْبُدُوْا فِی الْاَرْضِ مُمْسِدِیْنَ (۳۷/۳۸)۔ ”ملک میں سرکشی کرتے ہوئے فساد نہ پھیلاتے پھرو“۔ حسب معمول مترفین کے طبقہ (سردارانِ قوم) نے اس دعوت کی مخالفت کی (۳۷/۳۸)۔

اس زمانے میں موسیٰ اور چہرا گاہیں ، چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے ۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مختص کر لیتے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے ۔ حضرت صالحؑ نے سرداران قوم سے کہا کہ رزق کے یہ سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں ۔ یہ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑ سکتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوگا ۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو ۔ وہ اس پر بھی راضی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی ۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑ دیتا ہوں ۔ تم نے اگر اسے آزاد چرنے اور اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے معاہدے میں سچے ہو ۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش کہن پر قائم ہو ۔ (سجۃ) ۔ انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا (سجۃ) ۔ اور خدا کے عذاب نے (جو کڑک اور زلزلہ کی شکل میں نمودار ہوا) انہیں تباہ کر دیا (سجۃ) ۔

(طبعی حوادث ، مثلاً طوفان آب ۔ آندھی ۔ زلزلہ وغیرہ) ”خدا کا عذاب“ کس طرح بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں باب حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجئے ۔

ص ب ا

صَبَاتٌ - بِصَبَاتٍ - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا۔ اس کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں ۔ صَبَاتٌ نَابٌ التَّبَعِيَّةُ - اونٹ کی کچلی نکل آئی (ابن فارس) ۔ نیز کسی کے خلاف بغاوت کرنے اور دشمنی کرنے کے لئے صَبَاتٌ عَلَيْهِ کہتے ہیں * - صَبَاتٌ النَّجْمُ - ستارہ نکل آیا * ۔

الصَّبَابِيُّونَ - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے * ۔ صاحب محیط کے نزدیک یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتا تھا جس طرح مسلمان کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں ۔ بعض کا

خیال ہے کہ یہ ستارہ پرست یعنی مشرک قوم تھی*۔ صاحب المنار کا بھی یہی خیال ہے، اگرچہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل ملت ہیں جو مشہور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے عقائد بڑے مبہم سے ہیں**۔ قرآن کریم میں صَابِیُّنَ کا ذکر (۲/۶۲) میں آیا ہے۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ الصابیئون، حضرت نوحؑ کے دین کی پیروی کرنے والی قوم تھی۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ در حقیقت الکیسانی (Elkesaites) فرقہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہوا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب قروغ حاصل ہوا۔ گناہوں کو دھونے کے لئے پانی میں پیتسمہ لینا یا غسل کرنا ان کا امتیازی نشان تھا۔ اس جہت سے عرب انہیں ”مغسلہ“ کہتے تھے۔ یہودیوں کے ایسینی فرقہ نے اس جدید مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ (Sampsenes) یا (Sampsites) فرقہ جو چوتھی صدی عیسوی میں بحر میت کے قرب و جوار میں پایا جاتا تھا، الکیسانی ہی تھا۔ یہ لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے اور ہاتھ منہ دھو کر یا غسل کر کے اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس لفظ کے لغوی معنی، ”سورج کی مانند“ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ الکیسانی عام نجوم جانتا تھا اس لئے اس کے فرقہ کو ستاروں سے خاص دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت، عرب اس فرقہ سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں ”صابئین“ کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ مشہور تھا کہ الکیسانی نے اپنی الہامی کتاب کو اپنے جس جانشین کے سپرد کیا تھا اس کا نام (Sobiai) تھا۔ ممکن ہے اسی سے انہیں (Sabians) کہا جاتا ہو۔ یا ان کے، پانی میں پیتسمہ لینے کی وجہ سے۔ اراسی زبان میں اس سے یہی مفہوم تھا۔

ص ب ب

صَبَّ الْمَاءُ - اسنے اوپر سے پانی گرا دیا۔ فَصَبَّ - چنانچہ پانی گر گیا (لازم و متعدی)۔ الصَّبَابَةُ تھوڑی سی پینے کی چیز جو برتن میں باقی رہ جائے۔ الصَّبَبُ - نہر یا راستہ کا ڈھلوان اور نیچے کی طرف جانے والا حصہ۔ ڈھلوان زمین۔ اصْبَبُوا - لوگ ڈھلوان اور نشیبی زمین پر چلے۔ صَبَّ الرَّجُلُ - آدمی مٹا دیا گیا***۔

سورة عبس میں ہے اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ہم نے اوپر سے پانی برسایا۔ سورة فجر میں ہے فَصَبَّ عَلَيْنِهِمْ رِشْقًا سَوْطًا عَذَابٍ (۱۳) تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ سورة حج میں ہے - يُمْصِبُ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۶) - انکے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی گرایا جائیگا۔ انکے اکڑے ہوئے سروں کو جھکا کر انکی قوتوں کو ہراگندہ کر دیا جائیگا۔

ص ب ح

الصُّبْحُ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگوں میں سے ایک رنگ کے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل یہ سرخ رنگ کو کہتے ہیں اور صبح کو صُبْحُ* اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سرخ ہوتی ہے۔ اور مِصْبَاحُ* (چراغ کو) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی سرخ ہوتا ہے۔ الصُّبْحُ*۔ فجر یا دن کا ابتدائی حصہ*۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس وقت کو کہتے ہیں جب افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔ صَبَاحُ*۔ اصْبَاحُ* کے بھی یہی معنی ہیں*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ صَبَاحُ* دن کی روشنی کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ تینوں الفاظ آئے ہیں (۱۸)؛ (۳۷)؛ (۶۷)۔ مَصْبُوحُ*۔ وہ جو صبح کے وقت میں داخل ہو*۔ فَاتَّخَذَ تَهُمُ الْقَصْبِجَةَ مَصْبُوحِينَ (۱۸)۔ صبح ہوتے ہی انہیں سخت آواز نے آلیا۔ اَلْمِصْبَاحُ*۔ چراغ، نیز بنی کی لو*۔ (۲۵)۔ جمع مَصَابِيحُ*۔ ستارے (۱۲)۔ صَبَّحَ*۔ کسی کے پاس صبح کے وقت پہنچنا* (۵۴)۔ اصْبَحَ*۔ ہو گیا (یعنی کان اور ستار کے معنوں میں)۔ اصْبَحَ فُلَانٌ عَالِمًا۔ فلان آدمی عالم ہو گیا*۔ فَاتَّصَّبَحَ مِنَ الْخَمْسِ رُبَّنَ (۵) وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ فَاتَّصَّبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِمْ اخْوَانًا (۱۲)۔ تم خدا کی نعمت (قرآن کریم) کے ذریعے بھائی بھائی بن گئے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اصْبَحَ کے عام معنی تو ”ہو گیا“ ہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نسبت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے ایسا ہو گیا۔ وہ شروع ہی میں ایسا ہو گیا۔

ص ب ر

صَبْرٌ* کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا*۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی،

اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔ اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو الصَّبْرُ کہلاتا ہے۔ اور پہاڑ کو بھی الصَّبْرُ کہتے ہیں*۔ اَلْأَصْبِرَةُ۔ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے ہیں جو صبح شام باقاعدہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آجائیں اور ان سے دور نہ رہیں***۔ اَلصَّبْرَةُ۔ (ص کی تینوں حرکات کے ساتھ) لوہے یا پتھر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں (جو ایک مقام پر جم کر پڑا رہتا ہے)۔ اَلصَّبْرَةُ۔ اس مٹی وغیرہ کو کہتے ہیں جو اس لٹے کشتی میں رکھ دی جاتی ہے کہ اس سے کشتی جھکولے نہ کھائے**۔ جس سے اس کا توازن قائم رہے۔ ان الفاظ سے صَبْرٌ کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی سعی و کاوش کا نتیجہ بہت عمدہ نکلتا ہے اسلئے الصَّبْرَةُ۔ غلہ کے ڈھیر کو کہتے ہیں* جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو*۔ غور کیجئے کہ یہ کس قدر مسلسل محنت اور استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جم کر ایک جگہ قائم رہنے کی جہت سے یہ لفظ کسی کسو روکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اسلئے صَبْرٌ کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں (ابن فارس)۔ یا کسی کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانا۔ بِمِیْنِ الصَّبْرِ۔ اس قسم کو کہتے ہیں جو کسی کو زبردستی (مجبور کر کے) کھلائی جائے*۔

سورة بقرہ میں ہے فَمَا أَصْبَرَ هُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۲۵)۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ کے مقابلہ کی تاب کس قدر ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انہیں آگ کے عذاب کو جم کر برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں جد رات کا مفہوم آجاتا ہے۔

* قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ (۲/۱۶)۔ ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کیلئے نہیں رہ سکتے۔ اسی سورة (بقرہ) میں ہے رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا (۲/۲۵)۔ بھان "ثَبِّتْ" أَقْدَامَنَا نے صبر کے معنوں کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی ثابت قدم رہنا۔ سورة آل عمران میں صَابِرِينَ کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے فَمَا وَهَنُوا أَلَمًا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (۳/۱۴۵)۔ انہیں

خدا کی راہ میں جس قدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو مست گام ہوئے ، نہ ان میں کمزوری آئی ، اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے ۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر ”ثَبِّتْ“ اَقْدَامُنَا سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۳۶) ۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ یہ (رسولؐ) ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا تو لَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهِمْ ۔ اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم مستقل مزاجی سے ان کی پرستش پر قائم رہتے ۔ یہی معنی سورۃ ص میں وَاصْبِرْ وَاَعْلٰی اٰلِیٰہِتِکُمْ (۳۸) کے ہیں ۔ (۱۴۱) میں صَبَرْنَا بِمَقَابِلِہٖ جَزَّ عَنَّا آیا ہے ۔ جَزَّ ع کے معنی ہیں رمی کو درمیان سے کاٹ دینا ۔ لہذا صَبَرٌ معنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا ہونگے ۔ سورۃ کہف و حجرات میں صبر کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے جس کے لئے ہم کہتے ہیں کہ بے صبری کیوں ہوئے ہو؟ (Dont Be Impatient) ۔ ذرا ٹھہرو ۔ یونہی بے چین مت ہو ۔ (۱۸۸ ; ۳۹) ۔ سورۃ انفال میں ہے کہ اِنْ یَّکُنْ مِنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (۱۵۰) اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آجائیں گے ۔ انہی کو الصَّابِرِیْنَ رَفِی الثَّوَابِ سَاعِ وَالضَّرَّاءِ (۱۶۲) کہا گیا ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ (۱۹۱) خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو ۔

یہ ہے وہ صَبَرٌ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِیْزُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (۱۸۸) ۔ اپنی قوتوں کی پوری نشو و نما اور اعتدال و تناسب کے لئے صبر اور صلوٰۃ کی راہ اختیار کرو ۔ اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ۔ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں ، اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں ۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَٰوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ (۱۸۷) ۔ یہ ہے صَبَرٌ کا قرآنی مفہوم ۔ اس کے برعکس صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں ۔ ہمارے ہاں صبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس ، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے ۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بیچارگی میں کہتے ہیں کہ ۔ ”اچھا ۔ جو تمہارے جی میں آئے کر لو ۔ میں صبر کے سوا کیا کر سکتا ہوں“ ۔ اور اسی صبر کی تلقین یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ ”میاں ! صبر کرو ۔ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے“ ۔

یعنی صبر انتہائی بیچارگی کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چارگی میں سپر ڈال دینا۔

مختصراً یہ کہ صَبْرٌ کے معنی ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کار بند رہنا اور اسکے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اس طرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ قرآن کریم میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ اصْبِرُوا وَصَابِرُوا (۱۶۹)۔ اصْبِرُوا کے معنی ہیں ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پر قائم رہنا، اور صَابِرُوا کے معنی ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنا۔ یا دوسروں کے مقابلہ میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جب تک وہ (قرآنی مفہوم میں) الصَّابِرُ نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ”صابر“ و شاعر، ہوا سے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔

ص ب ع

الصَّبْعُ کے معنی ہیں انگلی۔ نیز انگلی کے بالائی پور کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اصْبَاعُ آتی ہے۔* (جیسے قرآن کریم میں ہے ۲۹)۔ صَبْعٌ فَلَانًا عَلٰی فَلَانٍ کے معنی ہیں اس نے انگلی کے اشارے سے اس کی راہنمائی اُس دوسرے شخص کی طرف کر دی*۔

ص ب غ

الصَّبْغُ کے بنیادی معنی تغیر و تبدل، یعنی تبدیلی پیدا کر دینے، کے ہیں۔ اسی سے الصَّبْغُ اور الصَّبِغُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کپڑا وغیرہ رنگا جائے۔ صَبَغَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں کپڑا رنگنا۔ الصَّبْغُ رَنَگِیز کو کہتے ہیں۔ (نیز کذاب کو جو باتوں میں رنگ آمیزی کرے)۔ الصَّبِغَةُ رَنگنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ نیز دین و ملت کو بھی**۔

چونکہ رَنگنے کے لئے کپڑے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے، اس لئے صَبَغَ يَدَهُ بِالْمَاءِ کے معنی ہیں اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبویا۔ صَبَغَ فَلَانًا فِي النَّعِيْمِ۔ فلان شخص کو نعمتوں میں ڈبو دیا۔ اسی نہج سے سالن کو

صِبْغٌ کہتے ہیں ، کیونکہ اس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاتی ہے * - (۲۳)۔
عیسائی اپنے بچوں کو پیتسمہ دینے کے لئے پانی میں غوطہ دیتے ہیں (یا رنگ
چھڑکتے ہیں تو) اسے صِبْغَةً یا اصْطِبَاغٌ کہا جاتا ہے *۔

قرآن کریم میں ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَنَّحْنُ اَحْسَنُ مِنْ اللّٰهِ صِبْغَةً
(۱۳۸)۔ اللہ کا رنگ۔ اس رنگ سے زیادہ حسن و زیبائی پیدا کرنے والا رنگ
اور کون سا ہو سکتا ہے! سوال یہ ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد کیا ہے؟ اس
کا جواب آیت کے باقی حصے نے خود ہی دے دیا۔ وَنَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ
(۱۳۸) یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت اختیار کر لینا۔ ایسی
اطاعت جس طرح رنگ کپڑے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ہے اور
اس میں یکسر تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا قوانین خداوندی کی ہم آہنگی
سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے رگ و ریشہ
میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ ایک بالکل ”دوسرا“ انسان بن جاتا ہے۔ یعنی
اس کی مضر صلاحیتیں نشو و نما پا لیتی ہیں اور اس میں صفاتِ خداوندی کا
رنگ منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جس طرح اللہ کی ذات میں مختلف اور
متضاد قسم کی صفات (مثلاً غفور و رحیم اور جبار و قہار) اس طرح متوازن طور پر
جمع ہیں کہ ان میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ (انہی کو الاسماء الحسنی
کہتے ہیں۔ یعنی مختلف صفات کا حسن کا رانہ انداز سے یکجا ہونا)۔ اسی
طرح اس انسان کے اندر یہی متضاد صفات پورے توازن کے ساتھ یک جا
رہتی ہیں اور ان میں کبھی کشمکش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ چیز صرف معاشرہ کے
اندر ممکن ہے۔ اس لئے صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد کوئی ایسی ”روحانیت“ نہیں
جسے خانقاہوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے یا اس میں کسی باطنی
طریق سے ترقی کی جائے۔ یہ نام ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے
کا جو قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ اور نَحْنُ
لَہٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸) کے یہی معنی ہیں اور انہی کے نتیجہ کا نام صِبْغَةَ اللّٰهِ
ہے۔ ابن قتیبہ نے اس کے معنی دَرَبْنُ اللّٰهِ کہے ہیں **۔

ص ب و

الصَّبْوَةُ۔ ابتدائے شباب کی نادانی۔ عشق بازی۔ صَبَتِ النَّحْلَةُ۔
کھجور کا مادہ درخت، دور کے نر کھجور کے درخت کی طرف جھکا۔ اَصْبَتْهُ
النَّحْرُ۔ عورت نے اس مرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اپنی طرف مائل کیا۔

الصَّحْبِيُّ - وہ بچہ جس کا دودھ نہ چھڑایا گیا ہو۔ یا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو
صَبَاً فُلَانٌ يَصْبُو - فُلَان آدمی کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے
سے کام کرنے لگ گیا* - سورة يوسف میں ہے أَصْبُ لَالِيهِينَ (۱۲) - میں
ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور لڑکوں کی سی نا سمجھی کی باتیں کرنے لگ
جاؤں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) مائل کرنا -
جھکانا۔ جھکنا۔ اور (۲) کم عمری۔ مطلب اس سے ہوگا عقل و فکری رو سے نہیں
بلکہ محض جذبات کے تابع، بچوں کی طرح، کسی چیز کی طرف مائل ہو جانا -

ص ح ب

صَحْبٍ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگ جانا -
أَصْحَبْتُهُ الشَّيْئِي - میں نے اسے اس چیز کے ساتھ لگا دیا - صَحْبَةٌ - وہ
اس کے ساتھ رہا - لیکن اس میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب کم مرتبہ آدمی
کسی بڑے مرتبہ والے کے ساتھ رہے تو اس وقت "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" صَحَابِ الْأَعْلَى
بولتے ہیں - اس کے برعکس بڑا آدمی چھوٹے کا مُصَاحِب نہیں کہلاتیگا،
حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں - الْأَصْحَابَةُ وَالْمُصَاحِبَةُ
کے معنی ہیں ساتھ رہنا - اس میں یہ تخصیص ہے کہ یہ ساتھ رہنا لمبے عرصہ کے
لئے ہونا چاہئے - اگر لمبا عرصہ نہیں تو اسے اُجْتِمَاع کہینگے* - ابن
فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے یا قریب رہنے کے
ہوتے ہیں -

أَصْحَابُ الرَّجُلِ وَلَهُ کے معنی ہیں وہ اس آدمی کا مطیع و فرمانبردار
ہو گیا - الْمُصَاحِبُ - ہمیشہ ساتھ رہنے والا - مطیع و فرمانبردار ساتھی* -
أَصْحَابُ فُلَانًا کے معنی ہیں، اس کی حفاظت کی - چنانچہ قرآن کریم میں
ہے وَلَا هُمْ مِمَّنْ يُصْحَبُونَ (۲۱) - ہمارے عذاب سے ان کی کوئی
حفاظت نہیں کر سکے گا - الْأَصْحَابُ (جمع أَصْحَابُ*) - کسی کے ساتھ
مسلل رہنے والا، چیز کا مالک - وہ شخص جو اس میں تصرف کا مالک ہو** -
ساتھ رہنے (معاشرت) کے اعتبار سے بیوی کو صَاحِبَةٌ (۱۰۰) کہا گیا ہے -

قرآن کریم میں أَصْحَابُ النَّارِ اور أَصْحَابُ الْجَنَّةِ آیا ہے -
أَصْحَابُ کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ مادی
مقامات کا نام نہیں جن میں رہنا ہوگا - یہ کیفیات کا نام ہے جو انسان کے
ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور لگی رہیں گی - یہی صَحْبٍ کے بنیادی معنی ہیں -

انہی کو اصحابُ التَّيْمَنَةِ (۵۱) اور اصحابُ الشِّمَالِ (۵۲) کہا گیا ہے۔ یعنی یمن و سعادت کے مالک اور شامت زدہ لوگ۔ سورۃ ذاریات میں اصحابِ یَمِیْنِ (۵۱) سے مراد ہیں انہی جیسے لوگ۔ راغب نے کہا ہے کہ صاحبُ ہر اُس ساتھ رہنے والے کو کہہ دیا جاتا ہے جو مستقل کسی انسان یا حیوان یا مکان یا زمان کے ساتھ رہے۔ خواہ یہ ساتھ رہنا جسمانی طور پر ہو یا فکری طور پر۔ صاحبُ الثَّوْتِ (۶۸)۔ ”مچھلی والا“۔ یعنی جسکے ساتھ مچھلی کا واقعہ گزرا تھا۔ یعنی ذَا النُّوْنِ (۲۱)۔

قرآن کریم میں اصحابُ التَّيْمَنَةِ - اصحابُ الشِّمَالِ - اصحابُ الْاُخْدُوْدِ - اصحابُ الْاَلَاٰیِکَةِ - اصحابُ الْعِجْرِ - مختلف پارٹیوں اور قوموں کے لئے آیا ہے جن کی تفصیل قرآن کریم کے متعلقہ مقامات میں ملے گی۔ علاوہ ازیں اصحابُ الْکَهْفِ وَ الرِّقْعِیْمِ کا قصہ سورۃ کہف میں آیا ہے۔ (ان سب کے تشریحی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

سورۃ توبہ میں اُس واقعہ کا ذکر ہے جب نبی اکرمؐ (ہجرت کے وقت) ایک غار میں تھے اور آپ کے ہمراہ ایک ”ساتھی“ تھا۔ اس ”ساتھی“ کے متعلق کہا گیا ہے اِذْ یَقُوْلُ لِصَّاحِبِیْہِ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۱)۔ ”جب (رسول اللہؐ نے) اپنے ساتھی سے کہا کہ مت گھبراؤ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے“۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اسی بنا پر حضورؐ کے باقی ساتھیوں کو بھی صحابہؓ کہا جاتا ہے۔

ص ح ف

الصَّحِیْفُ - روئے زمین - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کشادگی اور وسعت بتائے ہیں۔ اَلِصَّحَّافُ - چھوٹے چھوٹے حوض جو پانی جمع کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ اَلصَّحْفَةُ بڑا پیالہ۔ پھیلا ہوا چوڑا پیالہ جس سے پانچ آدمی سیر ہو کر دوڑھ یا پانی پی سکیں*۔ اَلصَّحِیْفَةُ (جمع اَلصَّحَائِفُ وَالصَّحُفُ)۔ لکھا ہوا کاغذ۔ یہ لفظ عرف عام میں چہرہ اور کتاب کے ورق کے لئے بھی بولا جاتا ہے**۔ یہ دراصل ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں***۔ اَلْمَصْحَفُ (سیم کی تینوں حرکات کے ساتھ**)۔ متعدد صحیفوں (لکھے ہوئے اوراق) کا مجموعہ***۔ اَلْمَصْحِیْفُ - قرآن کریم کو اشتباہ حروف کی وجہ سے اس طرح پڑھنا یا روایت کرنا جس طرح وہ قرآن کریم میں نہیں***۔ قرآن کریم میں صَحَّافُ (واحد صَحْفَةُ)

بڑے بڑے طباق یا پیالوں کے لئے آیا ہے۔ (۲۳)۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے
 يَتَلَوُاْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۶۸)۔ جو پاکیزہ ضعیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔
 ان لکھی ہوئی آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے جو ہر قسم کے اسقام و نقائص
 سے پاک اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہیں۔ غور کیجئے۔ قرآنی آیات
 کو صحت کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ شروع ہی سے لکھی
 جاتی تھیں۔ اسکی تفسیر (۱۵-۱۸) میں کر دی، جہاں فی صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ
 کہہ کر یہ بتا دی کہ مَكْرَمَةٌ کرامت سے اسکی تشریح کر دی کہ
 وہ، واجب العزت والتکریم کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے
 کہ نبی اکرم ﷺ پورے قرآن کریم کو لکھا کر اُمت کو دیکر گئے تھے۔
 یہ صحیح نہیں کہ اسے بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے جمع کیا تھا۔ قرآن کریم کے
 علاوہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی کتابوں کو صُحُفٍ اِبْرَآهِمِ
 وَمُوسٰی (۱۹) کہا گیا ہے۔ اور عام لکھی ہوئی چیزوں کے لئے یہ لفظ
 (۱۰) اور (۲۴) میں آیا ہے۔

ص خ خ

الصَّخْصُ۔ لوہے کو لوہے پر یا کسی اور سخت چیز کو سخت چیز پر
 زور سے مارنا۔ (جیسے کارخانوں میں ہوتا ہے)۔ نیز اس طرح دو سخت چیزوں
 کے لگنے سے پیدا ہونے والی آواز اسی سے الصَّخَاخَةُ سخت اور کسخت آواز
 کو کہتے ہیں جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ سخت مصیبت کو بھی کہتے ہیں۔
 چنانچہ صَخَّشِيْ فُلَانٌ بَعْظِيَّةٍ کے معنی ہیں اس نے مجھ پر بہت
 بڑا اہتمام لگایا۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کیلئے آیا ہے فَيَاْذَاجْعَاَتِ الصَّخَاخَةُ
 (۸۸)۔ مہبوت کر دینے والی مصیبت۔ اور اگر اس میں جنگ کی طرف بھی
 اشارہ ہے تو پھر ہتھیاروں کی جھنکار کا پہلو بھی اس میں مضمر ہے (اور
 ہماری Machine Age - مشینی دور، تو ہے ہی صَخَاخَةُ)۔

ص خ ر

الصَّخْرَةُ۔ (جمع صَخَرٌ) بڑا سخت پتھر یا چٹان کا ٹکڑا۔ الصَّخَاخَةُ۔
 لوہے پر لوہا مارنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ (یہ صَخَاخَةُ کے ہم معنی
 ہے۔ دیکھئے عنوان ص - خ - خ)

سورة کسوف میں ہے اِذْ اَوْبَسْنَا اِلَى الصَّخْرِ (۱۸)۔ جب ہم نے بڑے پتھر (یا چٹان) کے ٹکڑے کی پناہ لی تھی۔

سورة فجر میں قوم ثمود کے متعلق ہے جَاءُوا الصَّخِرَ بِالنَّوَادِرِ (۹) انہوں نے وادی میں بڑی بڑی چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ صَخْرَةٌ ہر پتھر کو کہیں کہیں، صرف بڑی چٹان کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔

ص د د

صَدَّقَتْ عَنْهُ - يَصْدُقُ - صَدُّ وُدًّا - کسی سے رو گردانی کرنا۔ اعراض ہر تنہا * - رَأَيْتَ الثَّمَنَاتِ فَيَقِينُ يَصْدُقُ وَنَ عَتِيكَ صَدُّ وُدًّا (۳۱)۔ تو منافقین کو دیکھئے گا کہ وہ تجھ سے پورا پورا اعراض کرتے ہیں۔ منہ پھیر لیتے ہیں۔ صَدَّقَتْ عَنْهُ - يَصْدُقُ - صَدًّا - اسے کسی چیز سے باز رکھا، ہٹایا، پھیر دیا، روک دیا * - وَصَدَّقَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۳۲)۔ اللہ کی راہ سے روکنا۔

صَدَّقَ - يَصْدُقُ صَدْرُ يَدًّا - اس نے شور و غوغا کیا۔ چیخ پکاری * - اِذَا قَمَوْا مَكَانَهُ يَصْدُقُ وَنَ (۳۳) تیری قوم اس پر چلا اٹھتی ہے۔

صَدْرُ يَدًّا - کھولتا ہوا گرم پانی - زخم سے رسنے والا خون آلود ہانی - جہنمیوں کی کھالوں سے ٹپکنے والا ہانی۔ نیز پیپ کو بھی کہتے ہیں * - جہنم کے ہانی کو مَاءِ صَدْرِ يَدِّ (۱۶) کہا گیا ہے۔ کھیتوں کی نشوونما ہمیشہ ٹھنڈے ہانی سے ہوتی ہے۔ کھولتا ہوا گرم پانی ہودوں کو جلا دیتا ہے اور ان کی نشوونما ختم ہو جاتی ہے۔ اسلئے جہنم کی زندگی میں انسانوں کو جو کچھ ملتا ہے اس سے ان کی جسمانی زندگی توقائم رہتی ہے لیکن کشت انسانیت یکسر جھلس کر رہ جاتی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ مَاءِ حَمِيمًا (۱۵) کہا گیا ہے۔ انسانیت کی نشوونما رک جانے کا نام جہنم ہے (دیکھئے عنوان ج-ح-م)

ص د ر

الصَّدْرُ - سینے کو کہتے ہیں (جمع صُدُورٌ ہے)۔ پھر ہر چیز کے اعلیٰ، مقدم اور اگلے حصہ کو کہنے لگ گئے۔ صَدْرُ الْقَوْمِ - قوم کا رئیس **۔

صَدَرَ - يَصْدُرُ - لوٹنا - واپس ہونا - یہ درحقیقت جانوروں کے ہانی
ہی کسر واپس آنے کیلئے بولا جاتا ہے - وَرُودٌ - ہانی پینے کیلئے گھاٹ پر
جانا ، اور صَدُورٌ - واپس آنا - الصَّادِرُ - لوٹنے والا* -

لہذا اس لفظ کے معنی آگے جانا - نکلنا اور لوٹنا ہیں - نکل پڑنے کے
معنوں میں یہ لفظ (۱۶) میں آیا ہے - اَصْدَرَ - واپس لے جانا ، لوٹانا - جانوروں
کو ہانی پلا کر واپس لے جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۸) میں آیا ہے -

صَدْرٌ* (جمع صُدُورٌ*) کا لفظ قرآن کریم میں دل کے معنوں میں
آیا ہے - اِنْ تَخَفُوا مِثْلِي صُدُورٌ كُمْ* (۳۸) - راغب نے لکھا ہے کہ
قرآن کریم میں جہاں اللہ نے اَلْقَلْبُ کہا ہے تو اس سے مراد علم و عقل ہے
اور جہاں صَدْرٌ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس میں علم و عقل اور جذبات
سب شامل ہیں** - لیکن یہ کلیہ نہیں -

قرآن کریم نے اپنے آپ کو شفاءٌ لِّلْمَیْمَنِ الصَّدْرِ (۱۵) کہا
ہے - یعنی تمام ذہنی اور نفسیاتی امراض کے لئے شفا - صاحب محیط نے
بَنَاتُ الصَّدْرِ کے معنی تفکرات لکھے ہیں*** -

(شَرْحِ صَدْرِ کے لئے دیکھئے عنوان ش - ۷ - ح)

ص ۸ ع

الصَّادِعُ* - کسی سخت چیز میں شکاف ڈالنا**** - ابن فارس نے کہا
ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں ”تڑپ“ پڑ جانا ، کسی چیز کا کھل جانا
اور اس میں پھٹن پیدا ہو جانا یا ہال آ جانا ہیں - اَلصَّادِعُ* - لوگوں کی
جماعت - چیز کا ایک ٹکڑا - پھاڑی ہوئی چیز کا آدھا حصہ - صَدَّعَ صَدَّعًا - اس
نے اسے پھاڑ دیا - آدھا آدھا کر دیا - اَلْمَصْدَاعُ* سخت زمین میں نرم
راستے - تیروں کی انیاں - الصَّادِعُ* - دردِ سر - وہ درد جس سے سر پھٹا جا رہا
ہو - تَصَدَّعَ الْقَوْمُ* واصْدَعَهُمْ قوم متفرق ہو گئی - صَدَّعَ الرَّجُلُ* -
اس کے سر میں درد ہوا* -

سورۃ حجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ
وَاعْرِضْ هِنَ الْمَشْرِكِیْنِ (۱۵) - آیت کا دوسرا ٹکڑا پہلے کی تشریح
کر رہا ہے - یعنی اب ان مشرکین عرب سے اعراض برتو - ان سے کفارہ کشی
کرلو - اور اپنی الگ جماعتی تنظیم کرو - بعض نے اس کے معنی یہ بھی

لکھے ہیں کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اسے کھول کر بیان کرو۔ (لیکن ہمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ موزوں ہے)۔ سورۃ روم میں ہے **يَتَوَسَّيْذُ بِصَدِّعَوْنٍ** (۳۳)۔ جس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔ سورۃ واقعہ میں ہے **لَا يُصَدِّعَوْنَ عَنْهَا** (۵۶)۔ اس سے درد سر نہیں ہوگا۔ دماغی خلل نہیں ہوگا۔ سورۃ حشر میں ہے **خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا** (۴۱) ڈکڑے ڈکڑے ہو جانے والا۔ پھٹا ہوا۔ سورۃ طارق میں ہے **وَالْأَرْضُ ذَاتُ الصَّدْعِ** (۸۶)۔ ”زمین جو پودوں کے اگنے کے وقت پھٹ جاتی ہے“۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کائنات میں ہر شے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (بِالْحَقِّ)۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض عمل تخریبی بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تخریب درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہے۔ مثلاً ہم زمین میں تخم ریزی کرتے ہیں تو اس کے بعد دانہ پھٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ زمین بھی شق ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ تخریبی عمل ہے۔ لیکن اس سے فصل کی ابتداء ہوتی ہے جو یکسر تعمیری نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر تعمیر سے پہلے تخریبی عمل ہوتا ہے۔ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** سے پہلے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی پروگرام میں صرف لا ہی لا ہو تو وہ تخریب ہی تخریب پیدا کرتا ہے۔ اسلئے

لَا وَإِلَّا ساز و برگ امتاں نفی ہے اثبات مرگِ امتاں
لہذا، ارض کا ذات الصدد ع۔ ہونا، انسانی نشو و نما کے لئے ہے۔

ص د ف

الصَّدْفُ۔ سیپی۔ ہر بلند عبارت یا دیوار یا پہاڑ*۔ ابن فارس نے **الصَّدْفُ** کے معنی پہاڑ کا کنارہ یا جانب کٹے ہیں کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے **إِذَا مَسَّوْا بَيْنَ الصَّدْفَيْنِ** (۹۶)۔ یہاں **صَدْفَيْنِ** کے معنی دو بلند پہاڑ ہیں۔ **الصَّدْفُ**۔ گھوڑے یا اونٹ کی ٹانگوں کی کچی*۔ ٹیڑھے پن کے اعتبار سے **صَدْفُ عَنَّة** کے معنی کسی سے اعراض ہر تنہا۔ منہ موڑ لینا ہوتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ **عَنْ** آئیگا تو اس کے معنی منہ پھیر لینے کے ہو جائیں گے (۱۵۸)۔ بغیر **عَنْ** کے بھی یہ معنی آجاتے ہیں۔ **صَدْفُ فَلَانٍ** وہ جھکانیز اس نے منہ پھیر لیا۔ جیسے قرآن کریم میں ہے **ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ** (۶۶)۔ یہ لوگ اس پر بھی اعراض برتتے اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ **الصَّدْفُ وَفُ**۔ اس عذرت کو کہتے ہیں جو اپنا رخ دکھائے اور پھر منہ پھیر لے*۔

ص د ق

صِدْقٌ - کِذْبٌ کی ضد ہے۔ جیسا کہ کِذْبٌ کے عنوان میں لکھا گیا ہے، جب انسان کا دل اور اسکی زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کِذْبٌ کہتے ہیں، خواہ وہ بات جسے وہ بیان کر رہا ہے، سچی ہی ہو۔ اس لئے صِدْقٌ کے معنی ہونگے، دل و زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا۔ اسی کو سچ کہتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک شکل اور بھی ہے۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ غلط ہے، لیکن اسے جو کچھ معلوم ہے اسے وہ ٹھیک ٹھیک بیان کر رہا ہے۔ اس صورت میں اس کے دل اور زبان میں تو ہم آہنگی ہوگی، لیکن اسکی بات غلط ہوگی۔ اس شخص کو ہم جھوٹا نہیں کہہینگے، البتہ اس کی بات کو غلط کہہینگے۔ نیز صِدْقٌ کے معنی قوت اور شدت کے بھی آتے ہیں*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہی قوت کے ہیں اور سچ کو الصِدْقُ اسی لئے کہتے ہیں کہ سچ میں فی نفسہ قوت ہوتی ہے، اور جھوٹ بودا اور کمزور ہوتا ہے۔ شَىءٌ صِدْقٌ - ٹھوس اور سخت چیز کو، اور رُحٌ صِدْقٌ مضبوط نیزہ کو کہتے ہیں۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئینگے ان میں ان بنیادی معانی کا پہلو مضمحل ہوگا۔ اسے ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے۔

الصَّدِيقُ - دوست کو کہتے ہیں۔ الصِّدِّيقُ - بہت سچ بولنے والا۔ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ سچ کا اس قدر خوگر کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔ نیز صِدِّيقُ وہ ہے جو اپنے قول و اعتقاد میں سچا ہو اور اس کی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔ اس لئے کہ صِدْقٌ کے معنی ہیں سچ کر کے دکھا دینا۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر آتی ہے)، الصَّدَقَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں دی جائے*۔ بعض کا خیال ہے کہ صَدَقَةٌ وہ ہے جو واجب نہ ہو بلکہ محض بطور خیرات دیا جائے، اور زَكَاةٌ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ جیسا کہ زَكَاةٌ کے عنوان (ز۔ ک۔ و) میں بیان ہو چکا ہے، جب قرآنی نظام اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب معاشرہ (یا نوع انسانی) کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معین رقم افراد پر واجب قرار دینا ہے،

* تاج و راغب -

جو عام حالات میں وصول کسری جاتی ہے۔ (اس کے لئے زکوٰۃ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کر لیا گیا ہے)۔ لیکن ہنگامی حالات (Emergency) میں افراد سے اپیل کی جاتی ہے۔ جو کچھ وہ اس طرح دیتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے (۹۰؛ ۹۱)۔

صدق کے معنی ہیں اس نے جو کچھ کہا اس پر عمل کر کے اسے سچ کر دکھایا*۔ سورۃ احزاب میں ہے مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (۳۳)۔ مومنوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ (۱۵۰)۔ ”یقیناً اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا“۔ سورۃ زمر میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ (۳۹)۔ ”حمد، اللہ کیلئے ہے جس نے اس وعدہ کو جو اس نے ہم سے کیا تھا سچ کر دکھایا“۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ نیکی اور کشادگی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ یہ ہے کہ تم صحیح تصورات حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انہیں سچ کر کے دکھا دو۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے، اُولَئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوا (۲۴)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ہے جو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کر سکے (۲۱۱)۔ اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ہے۔

کسی واجب کام کے نہ کر سکنے کی وجہ سے جو کچھ بطور کفارہ دیا جاتا ہے اسے بھی صدقہ کہا گیا ہے (۲۹۶)۔ سورۃ بقرہ میں صدقات کا لفظ التبرؤا (سود) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۴۶)۔ یعنی تبرؤا تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارا واجب ہے اس سے زیادہ لو، اور صدقہ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر واجب ہے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) اس سے بھی زیادہ دو۔ اسی لئے کہا ہے کہ یَتَحَقَّ اللَّهُ التَّبرُّؤا وَیُتْرَبِی الصَّدَقَاتِ (۲۴۶) تبرؤا (جسے تم بزعم خویش سمجھتے ہو کہ ہم نے زیادہ وصول کر لیا) تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔ اور صدقات (جسے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خواہ مخواہ دیدیا) بہت بڑھتے ہیں۔ اور تصدق و اصدق کے معنی ہیں جو کچھ کسی پر تمہارا واجب ہے اسے بھی چھوڑ دینا، بطیب خاطر دیدینا،

صدقہ کر دینا۔ مثلاً اگر قرضدار غریب ہو گیا ہے تو اسے قرض معاف کر دیا جائے (۲۸۰/۲) نیز (۹۳/۲) - عورتوں کا مہر بھی صدقہ ہے (۲/۲) لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ دال کے ضمہ (پیش) سے آیا ہے۔ یعنی صدقہ۔ واضح رہے کہ مہر کوئی متعین رقم نہیں جس کے عوض عورت کو خریدا جاتا ہے۔ یہ محض ایک تحفہ (Gift) ہے جسے بطیب خاطر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا دینا ضروری ہے۔ (مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ صدقہ میں اخلاص (صدق) اور حق و دوستی اور رفاقت (صداقت) کا مفہوم مضمون ہے۔ صدیق (۲۱/۲) - دوست کو کہتے ہیں (۲۱/۲) (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو مبیناً صدیق عطا کیا (۱۰۸/۱)۔ اس کے معنی ہیں ایسی سرزمین جو قوتوں اور توانائیوں، خوشگوار یوں اور صلاحیتوں (Potentialities) سے بھری ہوئی تھی۔ (صاحب تاج العروس نے اس کے معنی مَنَزَلًا صَالِحًا لکھے ہیں)۔

قرآن کریم میں صدق اور صدق دوٹوں الفاظ ”سچ“ ”کرد کھا دینے“ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (صدق کی مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں۔ نیز سورۃ الفتح میں ہے) لَقَدْ صَدَّقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْشَّرْعَ بَيِّنَاتٍ لِّتَحَقِّقَ... (۲۸/۲) ”یقیناً اللہ اپنے رسولؐ کے خواب کو عنقریب سچا کر دکھائیگا“۔ اور سورۃ صافات میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے قَدْ صَدَّقْتَ الشَّرْعَ بَيِّنَاتٍ (۳۰۵/۱) ”تو نے خواب کو سچ کر دکھا یا“۔ اسی صدق سے مُصَدِّق ہے جس کے معنی ہیں سچ کر کے دکھا دینے والا (۳۸/۱)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ مُصَدِّقٌ لِّمَا نَزَّلْنَا مِنْكُم (۲۱/۲) ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اہل کتاب کے پاس ان کی مڑھومہ کتابیں بالکل سچی ہیں۔ یہ معنی اس لئے غلط ہیں کہ خود قرآن کریم میں ان کتابوں کی بابت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تحریف والحاق ہو چکا ہے۔ لہذا جن کتابوں کو قرآن کریم خود معترف قرار دے رہا ہو وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے؟ دراصل (مُصَدِّقٌ لِّمَا نَزَّلْنَا مِنْكُم) میں ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ عام اخلاقی اصول دنیا کی ہر قوم کے پاس بالعموم موجود ہیں۔ سب کی تعلیم یہ ہے کہ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔

* صدق بمعنی صدق یعنی تصدیق کی، بھی آتا ہے۔ آیت (۲۸/۲) میں اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے رسولؐ کے دیکھے ہوئے خواب کی تصدیق کی اور اسے بتایا کہ تمہارا یہ خواب سچ ہو کر رہے گا۔ (راغب و کشاف)

چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیم محض نظری حیثیت سے موجود ہے۔ کوئی عملی نظام ایسا نہیں جو اس تعلیم کو سچا کر کے دکھائے۔ قرآن کریم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ یہ صرف اس تعلیم کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا عملی نظام بھی دیتا ہے جس میں یہ تعلیم سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ ظالم کبھی ہنپ نہیں سکتا، لیکن اس کے باوجود ہم ظالموں کو ہنپتا دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ إِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الظَّالِمُونَ (۱۱۶) لیکن وہ اس کے ساتھ ایک عملی نظام ایسا دیتا ہے جس میں یہ اہم حقیقت (کہ ظالم کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی) عملاً سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یعنی وہ اخلاقی اصول جو دنیا میں محض نظری تعلیم بن کر رہ چکے ہیں قرآنی نظام میں ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے آجائینگے، اور اس طرح دنیا دیکھ لے گی کہ وہ اصول فی الواقعہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم ان اصولوں کو سچ کر کے دکھا دینے والا ہے۔ جو اقوام عالم کے ہاں موجود ہیں اور ان اصولوں کو بھی جو ان کے علاوہ، قرآن کریم میں آئے ہیں اور جن سے آسمانی ہدایت عالمگیر اور مکمل ہوئی ہے نیز اس اعتبار سے بھی کہ کتب سابقہ (توراة و انجیل) میں ایسے آئے والے نبیؑ کے متعلق جس قدر نشانات مذکور تھے قرآن کریم نے ان سب کو نبی اکرمؐ کے ظہور میں سچا ثابت کر دیا۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے (اپنی کتاب مفردات القرآن میں) اس سلسلہ میں بڑی مفید بحث کی ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں :-

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ | یہ دو کلمے ہیں جن کا مفہوم اکثر لوگوں نے نہیں سمجھا۔ انہوں نے خیال کر لیا کہ قرآن کریم نے تعریف و تبدیل شدہ کتابوں کی شہادت دی ہے۔ مُصَدِّقًا کا لفظ شبہ کا موجب ہو سکتا تھا کیونکہ تَصَدِّقُ کا لفظ اس مفہوم کے لئے مشترک ہو سکتا ہے۔ اور بَيْنَ يَدَيْهِ کے مفہوم کو لوگوں نے اس لئے نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ لوگ عربیت سے واقف نہیں رہے۔

واضح رہے کہ صَدَّقَهُ کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی آدمی یا بات کی سچائی کی شہادت دینا، اور دوسرے معنی یہ کہ اس نے اسے اسکی

توقعات میں سچا بنا دیا۔ حماہ میں ہے :-

فَدَّتْ نَفْسِي وَنَسَلْتُ يَمِينِي

فَوَارِسَ صَدَّقْتُ فِيهِمْ ظَنُّونِي

میری جان اور وہ تمام چیزیں جو میرے قبضہ میں ہیں ان شہسواروں پر قربان جن کے متعلق میرے تمام خیالات (قوعات) سچ ثابت ہو گئے۔

اسی معنی میں قرآن کریم میں آیا ہے وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ (۳۰) اور ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا ظن سچ کر دکھایا۔ سو انہوں نے اس کی پیروی کی۔

اگر آپ اس لفظ کے مواقع استعمال پر غور کریں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں، کیونکہ نبی اکرمؐ اور قرآن کریم بالکل اسی طرح آئے جس طرح تورات نے خبر دی تھی۔ لہذا آپ کی اور قرآن کریم کی آمد نے تورات کو سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد اگر وہ لوگ قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی تکذیب کرتے ہیں تو انکی طرف سے یہ خود ان کی اپنی کتابوں کی تکذیب ہوگی [اس کے بعد علامہ فراہیؒ نے بتایا ہے کہ امام رازی وغیرہ نے ان آیات کے مفہوم میں کس طرح غلطی کھائی ہے، اور صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ہم بحث کے اس حصے کو چھوڑتے ہیں۔ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس بحث کو ان کی مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۶۴ تا ۶۷ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں]

علاوہ ان کے جنکا پہلے ذکر آچکا ہے، صَدَقَ کی مختلف شکلیں قرآن کریم میں اس طرح آئی ہیں۔ سچ کہنا۔ تصدیق کرنا۔ صَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (۵۶)۔ سچ کر دکھانا۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا (۱۲۴)۔ نیز لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّسُلَ (۲۸)۔ قَدْ صَدَّقَ (۱۳) ایسی سبقت جو شرف و فضیلت کو لئے ہو۔ مَدْخُلٌ صِدْقٍ اور مَخْرَجٌ صِدْقٍ (۸۰)۔ شرف و فضیلت کے ساتھ آگے بڑھنا اور شرف و فضیلت کے ساتھ مناسب وقت پر پیچھے ہٹنا۔ یا سچائی کے ساتھ کسی معاملہ وغیرہ میں داخل ہونا اور سچائی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونا اور نکلنا۔ لِسَانَ صِدْقٍ (۲۱) شرف و فضیلت کی بناء پر حقیقی شہرت۔ مَقْعَدُ صِدْقٍ (۵۵) ٹھہرنے کا ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں۔ صَادِقٌ (۱۱) سچا۔ مخلص۔ اَصْدَقُ۔ صادق تر، زیادہ سچا (۸)۔ تَصْدِيقٌ۔ سچ کر کے دکھانا (۱۱۱) مُتَّصِدٌ کسی کو کچھ بطور بخشش دیدینے والا یا جو کچھ اس کا کسی پر واجب (Due) ہو اسے چھوڑ دینے والا (۱۲)۔ سورۃ حدید میں صدقہ دینے والوں کو مُتَّصِدٌ کہا گیا ہے (۵۹) یعنی جو کچھ واجب ہے اس کے علاوہ اور بھی دینے والے۔ یہ سب اس لئے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو سچا کر

دکھائیں کہ ان کا فریضہ زندگی دوسروں کی نشوونما کرنا ہے۔ کَذَّبَ کے مقابلہ میں صَدَّقَ (صَدَّقَ) میں آیا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ صَدَّقَ کسی شکل میں بھی استعمال ہو، اس میں دل کی ہم آہنگی اور رضامندی کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کیا جائے یا دیا جائے وہ بھی دل کی رضامندی اور خوشنودی لئے ہو اور جو کچھ مانا اور تسلیم کیا جائے وہ بھی بطیب خاطر ہو۔ اس میں جبر و اکراہ کا شائبہ تک نہ ہو۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہی وہ عمل ہے جو وجہ تقویت ہو سکتا ہے، خود اس کام کے کرنے والے کے لئے بھی اور نوع انسانی کے لئے بھی۔ اس لئے اس کی رو سے صَدَّقَ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ص د ی

الصَّادِی - کے بہت سے معنے ہیں، جن میں سے ایک معنے ہیں صَدَاۃً باز گشت (جو کسی مکان یا پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آئے)۔ اَصْدَی الْجَبَلُ۔ پہاڑ نے صدا کا جواب دیا۔ الصَّادِی - مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں۔ اَلتَّصْدِیۃُ - ڈالیاں پیٹنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ التَّصْدِیۃُ ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صدی کی طرح ہو، یعنی جس سے کوئی مفہوم نہ نکلتا ہو یا جس میں غنا و خوش الحانی نہ ہو**۔ قرآن کریم میں ہے کہ (عہد جبرائیل علیہ کے عربوں کی صَلَوة*) مَکَاءً وَتَّصْدِیۃً (ہم) کے سوا کچھ نہیں رہ گئی تھی۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم ہے بے معنے آواز اور حرکت**۔ (اس آیت کے مفہوم کے لئے عنوان م - ک - و دیکھئے)۔ صَادَاۃً - سامنے آنا۔ تَّصْدِیۃً لَہُ - سر اٹھائے ہوئے کسی کے سامنے آنا۔ بار بار کسی کے سامنے آنا۔ صَدَاۃً باز گشت کی طرح کسی کی طرف ہلنا، درپے ہو جانا۔ متوجہ ہونا***۔ فَاَنْتَ لَہُ تَّصْدِیۃً (ہم)۔ تو اس کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوتا ہے۔

ص ر ح

الصَّرَاحُ - ہر چیز میں سے خالص۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خالص چیز کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ کَأْسٌ صَّرَاحٌ - وہ پیالہ (شراب وغیرہ کا)

* تاج - ** راغب - *** محیط

جو خالص ہو اور اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔ اَلتَّصْوِرُ بِحْ*۔ (لازم اور متعدی) معاملہ کو واضح کر دینا۔ معاملہ کا کھل جانا۔ صاف اور خالص ہو جانا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر ہونے اور کھل جانے کے لکھے ہیں۔ لَبَنٌ صَرٌّ بِحْ*۔ خالص دودھ جس کے جھاگ بیٹھ چکے ہوں۔ اَلْبَشَرُ اَحْيَاةٌ*۔ خالص شراب۔ اَلصَّرُّ اَحْيَاةٌ*۔ شراب کا برتن۔ اَلصَّرُّ حَتٌّ*۔ زمین کا اوپر کا حصہ۔ ہشتِ زمین جو ہموار ہو۔ اَلصَّرُّ حٌ*۔ بلند، منقش و مزین شاندار مکان جو دوسرے گھروں سے منفرد اور الگ ہو۔ بلند عمارت۔ اس کے بعد یہ لفظ محل کے لئے استعمال ہوئے لگا*۔

سورۃ نمل میں ہے اِنَّهٗ صَرُّحٌ مَّعْرُوْدٌ مِّنْ قَوَارِرٍۭۢ بِرٍۭ (۲۴)۔ یہاں اس کے معنی محل کے ہیں۔ اور سورۃ مومن میں صَرُّحًا (۲۶)۔ بلند عمارت کے لئے آیا ہے۔

ص ر خ

اَلصَّرُّ اَخٌ*۔ سخت آواز یا فریاد کو کہتے ہیں۔ اَلصَّرُّ حَتٌّ*۔ مصیبت یا فریاد کے وقت سخت چیخ مارنا۔ اَلصَّرُّ اَخٌ*۔ فریاد کرنے والا۔ نیز فریادی کی مدد کے لئے پہنچنے والا۔ (فریاد رس)۔ اَلصَّرُّ بِحْ* کے بھی یہی معنی ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا صَرٌّ بِحْ لَهُمْ (۳۶)۔ ان کا کوئی فریاد رس نہ ہوگا۔ صَرٌّ بِحْ* مصدر بھی ہے یعنی اس کے معنی فریاد رسی، چیخ و پکار بھی ہیں۔ اَلْمُصَّرُّ خٌ*۔ فریاد رس، پکار پر مدد کے لئے پہنچنے والا۔ وَمَا اَنَّا بِمُصَّرِّ خِكُمْ (۱۴۴)۔

اَصْطَرَّخَ*۔ چیخنا۔ چلانا (مدد کے لئے)۔ وَهَمٌ يَصْطَرَّخُوْنَ فَيَهْمًا (۳۵)۔ وہ اس میں مدد کے لئے چیخیں چلاؤں گے۔ دھائی دینگے۔ فریاد اور واویلا کریں گے۔

اِسْتَصْرَخَ*۔ کسی سے مدد مانگنا۔ مدد کے لئے چلانا (۲۸)۔

ص ر ر

اَلتَّصْرِیَّةُ*۔ اَلتَّصْرِیَّةُ سردی یا سردی کی شدت****۔ وہ سردی (ہالا) جس سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں***۔ زجاج نے کہا ہے کہ اَلتَّصْرِیَّةُ*۔ سخت چیخنے اور چلانے کو کہتے ہیں۔ رَرِّحْ* صِرٌّ وَ صَرٌّ صَرٌّ*۔ سخت آواز والی

* تاج و راغب۔ ** تاج و محیط نیز ابن فارس۔ *** لین۔ **** تاج۔

تیز ہوا - ابن عباس نے کہا ہے کہ سخت گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں*۔
 لیکن صَرَّ کے بنیادی معنی باندھنے کے ہیں - (راغب نے کہا ہے کہ) صَرَّ صَرَّ کا لفظ بھی اسی صَرَّ سے نکلا ہے اس لئے کہ ٹھنڈ سے بھی چیزیں بندھ کر جم جاتی ہیں**۔ اسی سے اَصْرَارُ ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر سختی سے جم جانا۔ اَلصَّرَّةُ - اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھی جاتی ہے**۔ اور اس طرح باندھی ہوئی نقدی کو اَلصَّرَرِیَّةُ کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے ان معانی کے علاوہ، اس کے معنی بلند اور اونچا ہونا بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ اَلصَّرِارُ ان اونچے مکانوں کو کہتے ہیں جن تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔

قرآن کریم میں سخت سردی کے لئے یہ لفظ (۳/۱۱۶) میں آیا ہے۔
 (۵۲/۱۹) میں رَّبُّحًا صَرَّ صَرًّا آیا ہے۔ سورة الذَّارِیَّتِ میں رَفِی صَرَّةٍ (۵۱/۴۹) کے معنی ہیں تعجب سے کچھ بولتی ہوئی۔ لیکن اس میں شدت کے معنی ہونگے۔ اس کے معنی منہ بسورنے کے بھی آتے ہیں*۔ اس کے معنی چیخ و ہکار، شور و غل، تکلیف کی شدت بھی ہیں*۔ نیز کسی چیز کی بھی شدت۔ مثلاً حیرت کی شدت، فرط تعجب۔

سورة آل عمران میں ہے وَكَلَّمَ يُصْرِتُّوْا (۳/۳۵)۔ وہ اصرار نہیں کرتے۔ جم کر نہیں بیٹھ جاتے۔ غلطی کا احساس ہو جانے پر اس کام سے فوراً ہٹ جاتے ہیں۔

ص ر ط

صِرَاطُ - عام عرب اسے صِرَاطُ پڑھتے ہیں۔ صاد کے ساتھ (صِرَاطُ) قریش کا لغت ہے۔ صِرَاطُ کے معنی ہیں کسی چیز کو بغیر چبائے نگل جانا۔ چنانچہ صِرَاطُ (اور صِرَاطُ) اس لمبی تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹنے والی ہو۔ گویا وہ جس چیز پر پڑتی ہے اسے نگل جاتی ہے۔ اسی نہج سے کھلے اور واضح راستہ کو بھی صِرَاطُ کہتے ہیں۔ (یسا تو تلوار کے سیدھے اور لمبے ہونے کی وجہ سے۔ اور یا اس لئے کہ چلنے والا اسے نگلتا چلا جاتا ہے۔ یا وہ راستہ ہزارہا راہروں کو نگلتا چلا جاتا ہے)***۔

قرآن کریم نے اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱/۵) کو دوسرے مقام پر طَرِیْقُ مُسْتَقِیْمٌ (۱۰۴/۲) کہہ کر صِرَاطُ کے معنی طَرِیْقُ (راستہ) بتا دیے ہیں۔ (مُسْتَقِیْمٌ کے معنوں کیلئے دیکھئے عنوان ق۔ و۔ م)۔
 (قرآن کریم میں ”پل صراط“ کا کوئی ذکر نہیں)۔

* تاج - ** راغب - *** تاج - دیکھئے عنوان صرط و صراط۔

ص ر ع

الصَّرْعُ - الصَّرْعُ - زمین پر ہنک دینا - پچھاڑ دینا - الصَّرْعَةُ - وہ شخص جو لوگوں کو بہت زیادہ پچھاڑتا ہو - الصَّرْعُ - پچھاڑا ہوا - اس کی جمع صَرَاعِی آتی ہے * -

قرآن کریم میں ہے فَتَنَّاكَ الْقَوْمَ فَيَمْهَتَا صَرَاعِی (۱۹) یعنی تم دیکھو گے کہ لوگ اس میں پچھڑے پڑے ہیں - الصَّرْعُ - مرگی کی بیماری کو کہتے ہیں - الصَّرْعُ - الصَّرْعُ - مثل - برابر کا - هَمَّامًا صَرَاعَانِ - وہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور برابر کے ہیں - اَلْمِصْرَاعَانِ مِّنَ الْبَابِ - دروازے کے دونوں پٹ - اَلْمِصْرَاعَانِ مِّنَ الشَّعْرِ - شعر کے دونوں مصرعے * -

ص ر ف

الصَّرْفُ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا اسے کسی دوسری چیز کے ساتھ تبدیل کر دینا - یعنی یا تو خود اسکی حالت میں تبدیلی پیدا کر دینا یا اسے کسی اور چیز سے بدل دینا * - نیز لَوْنًا دینا - رخ پھیر دینا - هُنا دینا * - صَرْفَ الصَّيْبَانِ مِّنَ الْمَكْتَبِ - بچوں کو مکتب سے لوٹا دیا - واپس کر دیا - صَرْفَ التَّرْسُولِ - قاصد کو جہاں سے وہ آیا تھا وہیں واپس کر دیا * - تَصْرِيفُ الْاَلَامِ - معاملات کا الٹ پھیر اور انکو ایک دوسرے کی جگہ رکھنا - اَلْمَصْرِفُ - پلٹنے کی جگہ - هُنا کی جگہ - تَصْرِيفُ الرِّيحِ - ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف سوڑ دینا - اَلْمَصْرِفُ رُكْ كَیَا - پلٹ گیا - صَرْفُ الْخَمْرِ اور تَصْرِيفُ الْخَمْرِ - خالص شراب (کچھ ملائے بغیر) پی جانا - اسی سے اَلْمَصْرِفُ - خالص چاندی کو کہتے ہیں اور اَلْمَصْرِفُ وَالْمَصْرِفُ - سکے ہر کھنے والے، یا سکوں کے تبادلہ کرنے والے کو - قرآن کریم میں تَصْرِيفُ الرِّيحِ (۱۶۳) متعدد مقامات میں آیا ہے - یعنی ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانا - یا ان کی حالت بدل دینا - سورة بنی اسرائیل میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَاهُ فِي هَذَا الْقُرْآنِ (۱۶۳) نیز (۱۶۳) - ہمنے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے - لِيَتَذَكَّرُوا (۱۶۳) تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سے سمجھ

* تاج و محیط و راغب - ** راغب - *** تاج - **** محیط -

سکیں۔ تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں۔ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اس کے متعدد گوشے سامنے آجائیں۔ یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں ”تکرار“ ٹھہراتی ہیں۔

سورة الفرقان میں ہے کہ جن لوگوں کی تم پرستش کرتے ہو وہی تمہیں جھٹلائیں گے کہ ہم نے تمہیں اپنی پرستش کیلئے نہیں کہا تھا فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا (۲۹) سو تم میں اس کی قدرت نہیں ہوگی کہ ان کی بات کا رد کر سکو۔ یا ہمارے عذاب کو دوسری طرف پھیر دو۔ یا اپنے آپ کو اس پوزیشن سے ہٹا سکو۔ سورة کہف میں ہے وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهُمْ مَصْرَفًا (۱۸)۔ کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں وہ اس عذاب سے ہٹ کر پناہ لے سکیں۔

سورة يوسف میں ہے فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ (۱۲)۔ تو خدا نے اس (یوسف) سے ان عورتوں کی سازش کو ہٹا دیا، اس کا رخ پھیر دیا۔ یعنی اسے انکی سازشوں کے نقصان سے محفوظ رکھا۔ سورة احقاف میں ہے اِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ (۳۹) ہم نے انکا رخ تیری طرف پھیر دیا۔ ان دونوں آیتوں سے صَرْفَ عَنِّ اور صَرْفَ اِلَی کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورة ہود میں عذاب کے متعلق ہے۔ لَیْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ (۱۱)۔ وہ ان سے دوسری طرف نہیں پھریگا۔ ان سے ٹلیگا نہیں۔ سورة توبہ میں اِنصَرَفَ آیا ہے (۱۲)۔ یعنی پھر جانا۔ اور صَرْفَ پھیر دینا۔

ص ر م

صَرَمَ - یَصْرِمُ - اسنے (رسی یا پھلوں کے خوشہ وغیرہ کو) کاٹ کر الگ کر دیا۔ صَرَمَ النَّخْلُ - اسنے کھجور کے پھل کاٹ لئے۔ صَرَمَ النَّخْلُ - رسی ٹوٹ گئی۔ أَصْرَمَ النَّخْلُ - کھجوروں کے پھل کاٹنے کا وقت آگیا۔ الصَّرَامُ - وہ زمین جس کی کھیتی کاٹ لی گئی ہو۔ الصَّرَامُ - کاٹا ہوا، مقطوع۔ کالی زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ رات اور دن کو بھی صَرَامٌ کہتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کٹ جاتا ہے۔ الصَّرَامُ - کاٹنے والا۔ نیز شیر کو بھی کہتے ہیں۔ اِنصِرَامٌ - منقطع ہونا*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی قطع کرنا ہی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ لَبِصْرٌ مُّنتَهَا مُصْبِحِينَ (۱۷)۔ وہ صبح ہونے ہی اس کی فصل کاٹیں گے۔ ذرا آگے چل

کر ہے ان "کُنْتُمْ صَارِمِينَ" (۲۴) - فصل کاٹنے والے - اور دو آیتیں پیچھے ہے - فَاَصْبَحَتْ كَالصَّارِمِ (۲۵) وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے اس کے پھل کاٹ لئے گئے ہوں - اسی کو سورۃ انبیاء میں حَصِيدًا سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۱) - (عموماً کھیتی کے لئے حصاد اور باغ کے لئے صرم آتا ہے) - ویسے الصَّارِمِ رات کو بھی کہتے ہیں * ، اور بالعموم وہ سیاہ ہوتی ہے لہذا سوختہ بختی کی نشانی ہے - آیت (۲۵) میں اگر اس جہت سے معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ باغ جل کر رات کی طرح سیاہ ہو گیا -

ص ط ر

دیکھئے س - ط - ر

ص ع د

صَعِدَ (فِي السَّجْدِ أَوِ السَّجْدِ) وَ صَعِدَ عَلَيْهِ وَفِيهِ - وہ (سیڑھی یا پہاڑ وغیرہ) کے اوپر چڑھا - لیکن صرف چلے جانے کیلئے بھی بولتے ہیں - أَصْعَدَ فِي الْأَرْضِ - وہ دور تک چلا، یا گھوما** - قرآن کریم میں ہے اِذْ تَصْعَدُونَ (۱۵۲) - جب تم دور نکلے جا رہے تھے - الصَّعِيدُ زمین کو کہتے ہیں - (۱۵۳ : ۱۵۴) - مٹی اور غبار کو بھی کہتے ہیں - نیز زمین کے بالائی حصہ کو - اوپر چڑھنے میں چونکہ سانس پھول جاتی ہے اسلئے اسر دشوار اور گراں کیلئے صَعُوْدٌ بولتے ہیں - تَصْعَدُ نَبِيٌّ ذَالِكِ الشَّيْءِ - مجھ پر یہ شے بہت ہی مشکل اور گراں ہو گئی** - صَعْدٌ - شدید - سخت** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور مشقت کے ہیں -

سورۃ جن میں ہے يَتَسَلَّكُهُ عَذَابًا صَعَدًا (۹۲) اسے سخت عذاب میں داخل کرتا ہے - یہی معنی صَعُوْدٌ کے ہیں (۹۲) - سورۃ انعام میں ہے کہ اسلام، سینے کی کشاد سے حاصل ہوتا ہے - تنگی نظر اور تنگی خیال جب اسلام کا تصور کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے كَاَنَّمَا يَصْعَقُ فِي السَّمَاءِ (۱۲۶) گویا وہ بڑا زور لگا کر بلندی پر چڑھ رہا ہے - ایسی چڑھائی جس کے متعلق پتہ ہی نہیں کہ کہاں جا کر ختم ہو -

سورۃ فاطر میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ - خوشگوار نظریہ، حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے - لیکن اس طرح اسکی رفتار انسانی حساب کے مطابق بہت سست ہوتی ہے - وَالْعَمَلُ

* راغب - ابن فارس نے بھی یہی معانی لکھے ہیں - ** تاج و محیط -

الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۱)۔ عمل صالح اسے بلند کرتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریات زندگی میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتے جائیں۔ اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہو جائیں تو ان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں۔ (تدبیر امور کے سلسلہ میں ثُمَّ يَمْزُجُ الْبَیْضَ آیا ہے۔ ۳۲)۔

ص ع ر

الصَّعَرُ۔ اونٹوں میں ایک بیماری ہوتی ہے جس سے ان کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ نیز تکبر اور اکڑ۔ صَعِرَ (وَجَّهَهُ)۔ يَصْعَرُ۔ صَعَرًا۔ چہرہ کا ٹیڑھا ہو جانا، ایک طرف کو مڑ جانا۔ الصَّعَارُ۔ مغرور و متکبر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا اور رخسار کو جھکائے رکھتا ہے اور لوگوں سے رخ پھیرتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑ جانے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے لَا تَصْعَعِرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱)۔ تکبر کی بنا پر لوگوں سے اعراض اور روگردانی نہ کرو۔ لوگوں سے بے رخی نہ برتو۔

ص ع ق

صَاعِقَةٌ۔ بجلی کی کڑک**۔ جمع صَوَاعِقُ۔ صرف سخت آواز کو بھی کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ حِمَارٌ صَعِيقٌ۔ اس گدھے کو کہتے ہیں جو نہایت سخت آواز کے ساتھ رینکے۔ بیہوش ہو کر گر جانے کو بھی صَعِيقٌ کہتے ہیں**۔ اور عقل و خرد کے جانے رہنے کو بھی**۔ سورة بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَاتَّخَذْنَاكُمْ صَاعِقَةً (۴۰) تو وہاں اس سے مراد بے ہوش ہو کر گر جانا ہیں (نیز دیکھئے عنوان ب۔ ع۔ ث اور م۔ و۔ ت) صَاعِقَتِ الرِّقَّةِ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کنواں ڈھ جائے اور چاروں طرف سے مٹی اس میں گرنے لگے**۔

* تاج نیز راعب و محیط۔ ** تاج و محیط۔

ہر مہلک عذاب کو بھی صَاعِقَۃً کہتے ہیں۔ اور موت کو بھی *۔
 بجلی کی کڑک کے معنوں میں یہ لفظ (۲۹) میں آیا ہے۔ اور ہلاکت کے
 معنوں میں سورۃ الطور میں جہاں کہا ہے کہ فَذَرْنَهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا
 يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ (۵۲)۔ اس میں ان کی اجتماعی بربادی
 اور قومی تباہی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ سورۃ زمر میں جہاں نفخہ صور کا ذکر
 ہے وہاں کہا ہے فَصَاحِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ
 (۳۹/۶۸)۔ صاحب تاج العروس نے اس کے معنی عقل و شعور سے محروم ہو جانے
 کے بھی لکھے ہیں **۔ (نفخ صور کے لئے ن۔ ف۔ غ اور ص۔ و۔ کے عنوانات
 دیکھئے)۔ سورۃ اعراف میں ہے وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا (۱۳۳)۔ اور موسیٰ
 غش کھا کر گر پڑا۔

ص غ ر

الصَّغِيرُ۔ الصَّغَارَةُ۔ کِبَرٌ اور عِظَمٌ کی ضد ہے۔ چھوٹا ہونا ***۔
 (عمر و جسامت میں یا قدر و منزلت میں)۔ الصَّغَارُ ذلت و رسوائی۔ محکومی ***۔
 سورۃ اعراف میں ہے فَتَاخَرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصَّٰغِرِیْنَ (۱۳)۔ نکل جا۔
 تیرے حصے میں کبریائی (بڑائی) نہیں آئے گی۔ کبریائی قانون خداوندی
 کی اطاعت سے نصیب ہوتی ہے۔ اس سے سرکشی برتنے کا نتیجہ ذلت و رسوائی
 ہے۔ سورۃ انعام میں مجرمین کے متعلق ہے صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۱۲۵)۔ انہیں
 قانون خداوندی کے سامنے جھکنا پڑیگا۔ چھوٹا بننا ہوگا۔ اس کا محکوم ہونا ہوگا۔
 (واضح رہے کہ یہ جھکنا اور محکومی بطیب خاطر نہیں ہوگی بلکہ بے بسی
 کی وجہ سے مجبوراً ہوگی۔ مجرم قانون کے سامنے مجبوراً جھکتا ہے)۔ نیز (۱۱۹)
 اور (۲۴)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ صَاغِرٌ وَّن کے معنی ہیں سرکشی چھوڑ
 کر، کسی مملکت میں امن پسند شہری کی حیثیت سے محکوم (یا رعایا) بن کر
 رہنا۔ یہ مفہوم سورۃ توبہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ
 اہل کتاب میں سے جو لوگ سرکشی برتیں اور جنگ پر اتر آئیں ****۔ ان کے

*تاج و محیط۔ **لین بحوالہ تاج۔ ***تاج۔

**** یہ چیز کہ قرآن کریم ان لوگوں کے خلاف جنگ کی اجازت دیتا ہے جو
 سرکشی اختیار کر کے جنگ پر اتر آئیں، قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے۔ قرآن
 کریم کی رو سے جنگ سے مقصود سرکش اور ظالم کو حق و انصاف کے سامنے
 جھکانا ہے اور پس۔

خلاف جنگ کرو۔ حَتَّٰی يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ يَذَرُوهُمْ صَاغِرُونَ (۹۱)۔ تا آنکہ وہ اُس امن و آسائش کے بدلے میں جو اسلامی مملکت میں رہنے سے انہیں نصیب ہوگی، شہری ٹیکس دینا اور ہر امن رعایا کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیں۔ ان کا اسلامی مملکت میں برابر کی حیثیت سے نہیں بلکہ محکوم کی حیثیت سے رہنا ان کے لئے چھوٹا ہو جانا ہے۔ لیکن یہ چھوٹا ہونا سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا، ورنہ انہیں وہ تمام حقوق انسانیت حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم ہر فرزند آدم کو عطا کرتا ہے۔ لیکن وہ امور مملکت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

سورۃ بقرہ میں ہے صَغِيرًا اَوْ كَبِيرًا (۲۸۳)۔ اس کے معنی ہیں تھوڑا یا بہت۔ اصْغَرُ۔ زیادہ چھوٹا (۱۱)۔

ص غ و (ی)

صَغَا يَصْغُو وَيَصْغَى يَصْغِي۔ مائل ہونا۔ جھکنا۔ صَغَتِ الشَّمْسُ۔ سورج مائل بغروب ہوا۔ صَاغِيَةً الرِّجْلُ۔ آدمی کے طرف دار اور حمایتی۔ صِغْوَةٌ مَعَكَ۔ اس کا میلان و رجحان تیری طرف ہے۔ اصْغَى حَقُّهُ۔ اس نے اپنا حق کم کر دیا*۔

قرآن کریم میں ہے وَ لِيَتَصَغَّى إِلَيْهِ أَفْئِدَةٌ..... (۱۱۶) تاکہ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں۔ (نیز ۱۱)۔

ص ف ح

الصَّفْحُ۔ ہر چیز کا چوڑا پہلو۔ اس کی چوڑی سطح۔ جانب اور پہلو۔ الصَّفْحُ مِنَ السَّيْفِ۔ تلوار کی چوڑائی۔ (دھار نہیں بلکہ چوڑا حصہ)۔ الْمُصَفَّحُ۔ چوڑی چیز۔ الصَّفْحَةُ۔ چوڑائی کے اعتبار سے کاغذ کی سطح کو کہتے ہیں۔ الْمُصَفَّحَةُ۔ ہاتھ ملانا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چوڑائی کے ہیں۔

صَفَحَ۔ اپنے منہ کو موڑ کر چہرے کا چوڑا حصہ (ایک جانب) دوسرے کے سامنے کرنا۔ یعنی اس سے اعراض برتنا۔ پہلو تہی کرنا۔ صَفَحَ عَنْهُ۔ اسے چھوڑ دیا۔ معاف کر دیا۔ یہ عَفُو سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے کیونکہ عَفُو میں کسی کو مجرم قرار دے کر معاف کرنا ہوتا ہے اور صَفَحَ میں اسے مجرم گردانا ہی نہیں جاتا ہے**۔ سورۃ بقرہ میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ (۱۱۶)۔

سورۃ زخرف میں ہے اَفَتَضَرُّبُ عَنَّا كَثُرَ صَفْحًا (۴۳)۔
 کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تم سے اعراض برتنے ہوئے ان تاریخی حقائق کو
 تم سے پھیر دینگے؟ سورۃ حجر میں ہے فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵)۔
 ان سے نہایت جمال آفریں انداز سے کنارہ کش ہو کر (اپنی جداگانہ تنظیم
 کرتے جاؤ)۔ (۱۵)۔ یعنی وَ اَهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۲۳)۔ قرآن کریم
 کا انداز معاشرت ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی سے بنا کر رکھنا
 تو ایک طرف، اگر کسی سے کنارہ کش ہونا ہو تو بھی نہایت حسن کارانہ
 انداز سے، بڑی خوبصورتی سے، جمال آفرینی کے اسلوب سے الگ ہو۔ جو ضابطہ
 حیات کسی سے کنارہ کشی کی صورت میں اس انداز کی تلقین کرتا ہو، خور
 کیجئے کہ وہ دوستداری اور رفاقت کے تعلقات کو کن ہلندیوں تک لے جاتا
 ہوگا اور ان میں کس قدر حسن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوگا؟

ص ف د

صَفَدٌ - صِفَادٌ (جمع آصْفَادٌ) - چمڑے کا تسمہ یا سوہے کی زنجیر
 جس سے قیدی کو باندھا جائے - بندھن - بندش - نیز گلے کا طوق یا پٹہ جو
 چمڑے کا بنا ہوتا تھا - صَفْدَةٌ - يَصْفِدُهُ - کسی کو زنجیر وغیرہ سے باندھنا -
 جکڑنا - الصَّفْدُ - عطیہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سے انسان معطی
 کا زیر بار احسان ہو کر مروت کی زنجیر میں بندھ جاتا ہے * - ابن فارس نے اس
 کے بنیادی معنی (۱) باندھنا (۲) عطا کرنا لکھے ہیں -

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے - مَقْرَنِينَ فِي الْأَصْفَادِ
 (۳۹) - وہ زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہونگے -

ص ف ر

الصَّفْرَاءُ - زردی - پیلا پن - الصَّفْرَاءُ - سونا ** - یہ آصْفَرُ کا
 مسونٹ بھی ہے - اس صورت میں اس کے معنی ”پیلے رنگ والی“ ہونگے -

الصَّفْرُ - خالی چیز ** - صَفِيرٌ اِنَاؤُهُ - اس کا برتن خالی ہو گیا - محاورہ
 میں اس کے معنی ہوتے ہیں - ”اس کے موشی ہلاک ہو گئے“ - (ابن فارس)

الصَّفِيرُ - ہر آواز نکالنے والا پرندہ - الصَّفِيرُ - موشیوں کو ہانی کے لئے
 بلانے کی آواز ** - سیٹی کی آواز -

* تاج - محیط - راغب - ** تاج

سورة بقرہ میں، بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے کہ وہ صفراء تھی یعنی اس کا رنگ زرد تھا (۲/۶۶)۔ اور سورة مرسلات میں جہنم کے شعلوں کو جِہِلَّتْ صُفْرًا۔ زرد اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جِہِلَّتْ صُفْرًا سیاہ اونٹوں کو کہا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی سیاہ اونٹ ایسا نہیں ہوتا جسکی سیاہی زردی میں ڈوبی ہوئی نہ ہو۔ ایسی ہی زردی کے لئے یہاں صُفْرًا کہا گیا ہے * (۳۳/۳۳)۔ سورة زمر میں زرد کے لئے مُصْفَرًّا آیا ہے (۳۹/۳۹)۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی پانچ چھ لکھے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ مندرجہ بالا معنوں ہی میں آیا ہے۔

ص ف ف

الصَّفِّۙفُ۔ التَّصْفِیۙفُ۔ صف بندی کرنا۔ صف بنانا۔ الصَّفِیۙفُ۔ صف (قطار) میں کھڑا ہونا۔ الصَّفِیۙفُ۔ وہ لوگ جو لائن لگا کر کھڑے ہوں **۔ راغب نے کہا ہے کہ ایک سیدھی لکیر پر آدمیوں کو کھڑا کرنا یا درختوں وغیرہ کو لگانا صَفٌّ کہلاتا ہے۔ سورة کہف میں ہے وَعَرَّضُوْا اَعْلٰی رَبِّکَ صَفًّا (۱۸/۱۸)۔ وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کئے جائیں گے۔ الصَّفِیۙفُ۔ پرندوں کا فضا میں اپنے بازو پھیلا دینا اور انہیں حرکت نہ دینا۔ صَفَافَاتُ۔ بازو پھیلانے ہوئے **۔ سورة نور میں ہے وَالطَّیۡرُ صَفَافَاتٍ (۲۴/۲۴)۔ پرندے جو فضا میں ہر پھیلائے ہوں (صَفَافَاتُ کا واحد صَفَافَةٌ ہے)۔ الصَّفَافَاتُ۔ صف بستہ جماعتیں (۳۱/۳۱)۔ صَوَافٍ (صَوَافِیۙفُ) صف میں کھڑے ہوئے اونٹ (۲۶/۲۶)۔ یہ بھی صَفَافَةٌ کی جمع ہے۔ مَصْفُوۡفَةٌ۔ صف میں لگائے ہوئے (۵۲/۵۲)۔ الصَّفِیۙفُطُفُ۔ سپاٹ اور ہموار زمین جس کا گھاس وغیرہ سب صاف کر دیا گیا ہو **۔ قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۰/۲۰) ہموار میدان۔ صَفْقَةُ الشَّارِ۔ گھر کا برآمدہ *۔

ص ف ن

الصَّفۡفَنُ۔ دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ مل جائیں ***۔ صَفۡفَنَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے اپنے دونوں پاؤں ایک لائن میں رکھے ****۔ صَفۡفَنَ الْفَرَسُ۔ یَصَفۡفِنُ۔ صَفۡفَوۡنَا۔ گھوڑے کا اس طرح کھڑا ہونا کہ اس کے تین پاؤں زمین پر ہوں اور چوتھے

* تاج۔ ** تاج و راغب۔ *** راغب۔ **** محیط

ہاؤں کا سٹم اس طرح اٹھا ہو کہ اس کا لگلا حصہ (کنارہ) زمین کو مس کرتا رہے۔ * اس طرح کھڑا ہونے والا گھوڑا صَوَافِنُ کہلاتا ہے، جمع صَوَافِنُ و صَوَافِنَاتُ۔ عربوں کے ہاں اس قسم کے گھوڑے اعلیٰ درجہ کے شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں الصَّافِنَاتُ الْجَيَادُ (۳۹)۔ ایسے ہی اصل گھوڑوں کے لئے آیا ہے۔

ص ف و

الصَّافُوُ۔ الصَّافَاءُ۔ کسی چیز کا صاف اور خالص حصہ۔ راغب نے کہا ہے کہ الصَّافَاءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونا یہی اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ صَفْوَةٌ کُلٌّ شَيْءٌ۔ ہر چیز کا خالص حصہ۔

يَوْمَ صَافٍ وَصَفْوَانٍ۔ وہ خنک دن جس میں نہ بادل ہوں اور نہ ہی فضا غبار آلودہ ہو۔ صَافٍ اور خالص چیز کا لئے لینا۔ انتخاب کر لینا۔ اصْطِفَاءُ۔ اسے مخلص سمجھا۔ اسے چنا۔ انتخاب کیا۔ الصَّافِيَّةُ (جمع صَفَايَا) مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لئے منتخب کر لے۔ **

الصَّافِيَّةُ (جمع صَفَوَاتٍ وَصَفَا) بڑا صاف، چکنا پتھر جس پر کچھ نہ اگ سکے۔ الصَّافُوَانَةُ (جمع صَفْوَانٍ) کے بھی یہی معنی ہیں *۔ (۲۶/۴)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسم جمع ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الصَّافُوَانُ کے معنی بڑی چٹان ہوں اور اس کے ایک ٹکڑے کو صَفْوَانَةُ کہا جاتا ہو۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الْاَدْنٰى (۱۲۱) ہم نے اسے دنیا میں آمیزشوں سے پاک کر کے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کر لیا۔ مختلف انبیائے کرام کے متعلق فرمایا وَلَاقَهُمْ عِندَ نَسَاْلِمِ الْاَمْصُطَفٰى (۳۸)۔ یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب افرادِ انسانیہ ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اصْطَفٰكُمْ (۱۶)۔ یعنی چن لینا۔ دوسروں سے الگ کر کے مختص کر لینا اور ترجیح و فضیلت دینا۔

سورۃ بقرہ میں الصَّافَاوَالْمَرْوَةُ کو مین شَمَائِرِ اللہ کہا گیا ہے۔ (۱۵۸)۔ یہ مکہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔

سورۃ محمد میں ہے عَسٰىلِ مُصْطَفٰى (۱۵) صاف کیا ہوا شہد۔

ص کی کی

صَکَّۃٌ - کسی چیز، بالخصوص چوڑی چیز کے ذریعے زور سے مارنا۔
صَکَّۃُ الْبَابِ - اس نے دروازہ بند کر دیا۔ صَکَّۃً - اسنے اسے دھکا دیا *۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے فَصَکَّکَتْ وَجْهَهَا (۵۱)۔ اسنے اپنے چہرہ پر ہاتھ مارا۔ لیکن یہ عمل ازور تعجب تھا۔ جیسا کہ آیت (۱۱) سے ظاہر ہوتا ہے۔

ص ل ب

الصَّلْبُ - الصَّلِيبُ - مضبوط اور سخت۔ هُوَ صَلْبٌ بَنِي دَرِينِه۔ وہ اپنے دین میں سخت اور مضبوط ہے۔ صَلْبٌ - اس نے اسے سخت اور مضبوط بنا دیا۔ الصَّلْبُ - ریڑھ کی ہڈی *۔ (جمع اصْلَابٌ) ابن فارس نے کہا ہے کہ پشت کو بھی اس کی قوت اور سختی کی وجہ سے صَلْبٌ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ اَبْنَانُکُمْ الَّذِیْنَ مِیْنُ اصْلَابِکُمْ (۴۳)۔ تمہارے وہ بیٹے جو تمہاری اپنی ”پیٹھ“ (صلب) سے ہوں۔

الصَّلْبُ - آدمی کو مار دینے کے لئے لٹکانا۔ سولی چڑھا دینا۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ الصَّلَابُ - مردے کے ناک یا منہ میں سے جو پانی سا نکلتا ہے اسے کہتے ہیں۔ نیز وہ چکنائی جو ہڈیوں سے نکالی جائے *۔ ابن فارس نے صَلْبٌ کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سولی پر چڑھائے ہوئے کو اس لئے صَلْبٌ کہتے ہیں کہ اس کے چہرے پر چکنائی آ جاتی ہے۔ پھر سولی کو بھی صَلْبٌ کہتے ہیں۔ لیکن راغب کی توجیہ بہتر نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ (عیسائیوں کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق) صلیب کی شکل یوں ہوتی تھی۔



مجرم کو اس تختے پر لٹکا کر اس کے دونوں ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں گاڑ دیتے تھے اور اسے اسی حالت میں رہتے دیا جاتا تھا۔ تاآنکہ وہ درد و کرب اور ضعف و نقاہت سے دم توڑ دے۔

یہودیوں کے نزدیک صلیب پر مارنا لعنتی کی موت تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے (حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر لٹکا کر (معاذ اللہ) لعنتی

کی موت مار دیا۔ عیسائی اگرچہ (صلیب کی موت کو لعنتی کی موت نہیں کہتے لیکن) اس کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی۔ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں کی تردید میں کہا کہ یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے۔ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۱۵۷)۔ اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا۔ اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا۔ اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی،۔ حضرت عیسیٰؑ وہاں سے پہلے ہی تشریف لے جا چکے تھے اور انہوں نے جس شخص کو گرفتار کیا تھا وہ کسوٹی اور تھا۔ (تفصیل میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت اور فساد فی الارض کی مختلف سزائیں (حسب نوعیت جرم) بتائی گئی ہیں۔ ان میں ایک يُصَلَّبُوْا (۳۳) بھی ہے۔ یعنی صلیب پر لٹکوا دینا۔ سولی دیدینا۔ صَلَّبَ۔ ایک آدمی کو سولی دینے کے لئے۔ اور صَلَّابٌ۔ زیادہ آدمیوں کو سولی دینے کے لئے بولا جاتا ہے۔

ص ل ح

أَصْلَحَ الْيَوْمَ کے معنی ہیں أَحْسَنَ الْيَوْمِ۔ یعنی اس نے ایسا کام کیا جس سے اس (دوسرے آدمی) کی خرابی، نقص یا کمی دور ہو گئی۔ حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام کرنا۔ اسی لئے الصِّلَاحُ باہمی امن و سلامتی اور مسالمت کو کہتے ہیں، کیونکہ زمانہ جنگ کی بد نسبت، صلح و امن میں معاملات کے اندر توازن قائم رہتا ہے*۔ الصِّلَاح کے معنی ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضے کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا**۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حالت میں ہونا۔ بالکل مناسب، درست، یا ترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا***۔

سورة اعراف میں صبیح و سالم اور تندرست بچے کے لئے صَلَاحًا کا لفظ آیا ہے (۱۶۰)۔ یعنی ایسا بچہ جو ہر لحاظ سے مناسب اور درست ہو۔ سورة انبیاء میں، جہاں حضرت زکریا کے ہاں بڑھاہے کے زمانے میں اولاد پیدا ہونے کا ذکر ہے، وہاں کہا ہے وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۹۶)۔ ہم نے اس کی بیوی سے اس نقص کو دور کر دیا جو اولاد پیدا کرنے سے مانع تھا۔ سورة نور میں وَالصَّالِحِينَ مِّنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (۲۴) کے معنی ہیں وہ

غلام اور لونڈیاں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں - سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس وقت ہمارے باپ کی ساری توجہ یوسفؑ (اور اس کے بھائی) کی طرف ہے۔ اگر یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے تو پھر موجودہ نا ہمواری دور ہو جائیگی۔ وَ تَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (۲۱) - اور بعد میں ہم ایسا گروہ باقی رہ جائیں گے جن میں کوئی نا ہمواری نہیں رہے گی، اور ہمارے کام سنور جائیں گے۔ یہاں صالحین کے لفظ نے اس کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی نا ہمواریاں دور ہو جانا۔ معاملات کا سنور جانا۔

قرآن کریم میں حَسَنَات کے مقابلہ میں سَيِّئَات کا لفظ اکثر آیا ہے۔ اور (۲۸۴-۸۱) میں سَيِّئَةٌ کے مقابل میں عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آیا ہے۔ لہذا اعمال صالحہ اور حسنات ہم معنی ہیں۔ اس لئے دوسرے مقام پر سَنَ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ کے مقابل میں سَنَ أَسَاءَ آیا ہے (۲۹)۔ (س۔ و۔ ا۔ اور ح۔ س۔ ن کے عنوانات میں ان الفاظ کے معنی سامنے آجائیں گے)۔ لہذا اہمالِ صالحہ کے معنی ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور نا ہمواریاں دور ہو جائیں۔ جو زندگی کی خوشگوار یوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ ٹھیک وہ کام کرنا جو اُس وقت کے حالات کے عین مطابق اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو۔ فساد اس کی ضد ہے (اس کے لئے عنوان ف۔ س۔ د دیکھئے)۔

قرآن کریم نے فَسَادٌ اور صِلَاحٌ کو ٹھیک ایک دوسرے کے مقابل میں استعمال کیا ہے۔ (۲۱)۔ سورۃ قصص میں مَصْلِحِينَ کے مقابلہ میں جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ آیا ہے (۲۹)۔ اسی سورت میں ذرا آگے، یہ مادہ خوش معاملگی کے معنوں میں آیا ہے (۲۸)۔

قرآن کریم میں آپ شروع سے اخیر تک دیکھیں گے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آیا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ وہ اعمال جن کا سرچشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو میکانیکی طور پر (Mechanically) سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے، جو اُسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال

بلا ایمان ہے نتیجہ ہوتے ہیں۔ سورۃ روم میں قرآن کریم نے مَنّ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابلہ میں مَنّ كَفَرَ لَا كَرَ (۳۰/۳۰)۔ اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان، ایمان نہیں ہوتا۔

نیز اعمال بھی وہی اعمال صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمال صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں همواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نوع انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دیدی۔ اعمال صالحہ سے اس کی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، کیونکہ اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان لاینفک شرط ہے۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقین محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے متعین کیا ہے اور اعمال صالحہ، ان اقدار کے تحفظ کو کہتے ہیں، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی۔ اسی کو بالفاظ دیگر کیریئر کہا جائیگا۔ لہذا کیریئر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔ یہ یقین علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

ص ل د

الصِّلْدُ - الصِّلْدُ*۔ ٹھوس چکنا پتھر*۔ (۲۶/۲۶) - الصِّلْدُ آءٌ سخت ٹھوس زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو سکے*۔ صِلْوُ د*۔ بیخیل آدمی - رَأْسُ صِلْدُ*۔ وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں*۔ لہذا الصِّلْدُ وہ چٹان ہوگی جس پر ذرا سی مٹی بھی باقی نہ رہے۔ سورۃ بقرہ کی محولہ بالا آیت میں یہ معاق واضح ہیں۔

ص ل ص ل

الصِّلْصَالُ*۔ خالص گیلی مٹی جس میں ریت مل جائے اور پھر خشک ہونے پر اس میں سے آواز آنے لگ جائے۔ جب اسے آگ میں پکا لیا جائے تو اسے قَخْخَارُ* کہتے ہیں۔ یعنی خشک کچی ٹھیکری صِّلْصَالُ* ہوگی۔ اور پختہ ٹھیکری قَخْخَارُ**۔

*تاج۔ **تاج و راغب۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۱۵۹)۔ ہم نے انسان کو کھنکھنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تری اور تھوڑا سا پانی شامل ہوتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی جرثومے (Life Cells) محسوس طور پر، پانی اور مٹی کے اسی امتزاج سے سامنے آتے ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے کہیں طِیْنٌ* (۳۲) اور کہیں طِین لازب (۳۶) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی انسان کی حیاتِ طبعی کا محسوس نقطہ آغاز۔

ص ل و (ی)

اگرچہ صَلَوۃ اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص - ل - و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص - ل - ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صَلَوۃ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس عنوان میں سادہ کے آخر کا ”واو“ اور ”ی“ دونوں ہی آگئے ہیں۔ ویسے ہم نے (ص - ل - ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے۔ چونکہ ”صلوۃ“ دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم، اور اس کے مباحث خاص غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کرینگے۔

(۱) الصَّلَاۃ - پشت کا درمیانی حصہ - کولہے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دم لگے - دم کے دونوں جانب کے حصے صَلَوَانِ کہلاتے ہیں۔ اس کی جمع صَلَوَاتٌ* یا أَصْلَآءٌ* آتی ہے*۔ صَلَاۃ - یَصْلُوۃ - صَلَوَاۃ کے معنی ہیں صَلَاۃ (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا - صَلَوَاتُہ - میں نے اس کے صَلَاۃ پر مارا۔

(۲) الصَّلَاۃ کی نسبت سے، صَلَی الْفَرَسُ* تَصْلِیۃً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں، دوسرے نمبر کا گھوڑا، پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں، پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں۔ اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو، سابق* کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو آلتِ مُصَلِّی*۔ اس سے صَلَی کے معنی ہیں

*تاج۔

اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا۔ چنانچہ حضرت علی رضی کی ایک روایت میں ہے سَبَقَ رَسُولُ اللَّهِ - وَ صَلَّى أَبُو بَكْرٍ وَ ثَلَاثَ عُمَرَاءَ وَ خَبِطْتُنَا فِي مَنَّةٍ - ”رسول اللہ پہلے تشریف لے گئے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکرؓ اور ان کے پیچھے عمرؓ بھی چلے گئے۔ اور ہمیں فتنوں نے بد حواس کر دیا“۔

(۳) تاج میں ہے کہہ صلی و اصطلاحی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو ہے لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْمُصَلِّينَ (۲۴۰)۔ ”ہم مصلین میں سے نہیں تھے“۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ”ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے“۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جہت سے صلوٰۃ کے معنی ہونگے احکام۔ الہی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا اور کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ لہذا تَصَلِّيَةٍ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے۔

(۴) ان تصریحات سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سہجہ لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین، مکمل ترین، مستحکم ترین، اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے ”روحنا“ کہہ کر پکارا ہے۔ دیکھئے عنوان روح)۔ یہ ذات، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو ”الاسماء الحسنی“ سے تعبیر کیا ہے۔ لہذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے)

وہ یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱) - یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزل مقصود تک لے جائے۔ اور سورۃ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱) - ”میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے“ - یعنی جس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لہذا صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر (علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا۔

(۵) سورۃ نور میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرِ صَفَّٰتٍ - کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوةَہٗ وَتَسْبِيحَہٗ (۲۴)۔ ”کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ اور پر پھیلانے ہوئے پرند بھی۔ ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے“ - یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے۔ اسکی جدوجہد کے دوائر کونسے ہیں۔ اسی چیز کو انکی صلوٰۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تَسْبِيْحٌ کے لئے دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلی طور پر نہیں دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ جہانتک اسکی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، انسان ان چیزوں کا علم، عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کر سکتا ہے لیکن جہانتک اس کی ”انسانیت“ کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ لہذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اسکی ”صلوٰۃ و تسبیح“ کیا ہے، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اسے قرآن کریم نے اِقَامَتِ صَلٰوة کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۲)۔ یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا۔

لیکن وحی کے دئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اِقَامَتِ صَلٰوة) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہو سکتا ہے۔

بھی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسکی لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔
 حَتَّٰثُكُمَا اِيْكَ اِسْلَامِيْ مَمْلَكَتِ كَا فَرِيضَه هِيْ بِهٖ بَتَايَا هِيَ الْقَدْرُ يَنْ لَّانُ مَسْكَنَتُهُمْ
 فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ
 وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۴)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں
 اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے (زکوٰۃ
 کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان زک و)۔ اور معروف کا حکم دینگے اور منکر سے
 روکینگے،، انہی کو دوسری جگہ اَلْاَرَكَعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ (۱۱۲) کہا
 ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے۔ سجدہ کرنے والے۔ (رُكُوعٌ اور سَجْدَةٌ
 کیلئے دیکھئے عنوانات۔ ر۔ ک۔ ع اور س۔ ج۔ د)۔ اور یہی وجہ ہے کہ
 دوسری جگہ اقامتِ صلوٰۃ اور امورِ مملکت کیلئے باہمی مشاورت کا اکھٹا ذکر
 کیا گیا ہے۔ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآمَرُوْهُمْ شُورٰی بَيْنَهُمْ (۲۸)۔ وہ
 اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔
 اور چونکہ جماعتِ مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانینِ خداوندی (کتابِ اللہ)
 کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اسلئے سورۃ اعراف میں تَمَسَّكُ بِالْكِتَابِ
 اور اَقَامَتِ الصَّلٰوةَ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (۱۰۰)۔ لہذا اقامتِ صلوٰۃ
 سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جس میں تمام افراد، قرآن کریم
 کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں، اور یوں کتابِ اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں۔
 اس مقصد کی مزید وضاحت کیلئے قرآن کریم میں صَلَّی کے مقابلہ میں تَوَلَّی کا
 لفظ آیا ہے (۵۰۰)۔ تَوَلَّی کے معنی ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا۔ گریز کی
 راہیں نکالنا۔ پھر جانا۔ منہ موڑ لینا۔ اس لئے صَلَّی کے معنی ہوئے قوانینِ خداوندی
 کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا۔ نظامِ خداوندی کے متعین کردہ فرائض
 منصبی کو ادا کرتے جانا۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اسی اعتبار سے کہا
 ہے کہ صلوٰۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے، رخ کرنے اور متوجہ
 ہونے کے ہیں (مفردات القرآن)۔ سورۃ علق میں ہے۔ اَرَاَيْتَ الَّذِي يَنْهٰی
 عَبْدًا اِذَا صَلَّی (۱۰۱)۔ یعنی جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا
 کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اسکی راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا
 نہیں جسکو یہ محیط نہ ہو۔ چنانچہ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ
 سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلَّوْتُکِ تَامِرُکِ اَنْ نَّشْرُکَ مَا یَعْبُدُ
 اَبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَاؤُ (۱۱) ”کیا تیری صلوٰۃ
 تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ

دادا اختیار کئے چلے آ رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں؟“؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلوة ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے۔ اس سے بھی صلوة کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں، قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوة ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے یا وحی خداوندی کے مطابق؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام ”اقامت صلوة“ ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں ”اقامت صلوة“ اور ”اتباع جذبات“ کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

فَخَلَّفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ (۱۹۱)۔ (انبیائے کرام کے بعد)، ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلوة کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے، گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلوة کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلوة کا قائم رکھنا ہے۔ سورۃ انعام میں ”محافظة صلوة“ کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے۔ (۱۶۶)۔ اسی بنا پر ابن قتیبہ نے الصَّلَاةَ کے معنی الصَّلَاتِینَ* کہنے ہیں*۔ یعنی اقامت صلوة درحقیقت اقامت دین ہے۔

(۶) الصَّلَاتِی کے معنی آگ اور ایندھن کے ہیں۔ اس سے صَلَّی عَمَّصَاهُ عَلَی النَّارِ کے معنی ہیں، اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا۔ سلب ماخذ کے اعتبار سے صَلَّی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس نے آگ کو ہٹایا اور دور کیا۔ (روح المعانی)۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلوة کے معنی ہونگے اپنی خامیوں کو رفع کرنا۔ صاحب المنار نے کہا ہے کہ صلوة قولاً و عملاً اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے، نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راہنمائی) کے محتاج ہیں۔ اسی جہت سے قرطبی نے کہا ہے کہ صلوة درحقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ہیں۔

* القرطبی - جلد اول - صفحہ ۱۳، یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دئے ہیں۔

(۷) صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں*۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا۔ کائنات کو مستغز کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

(۸) الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں**۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشو و نما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوة کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشو و نما ہوتی جائے۔

(۹) صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے، وہ قریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) يَا يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۹۰)

”اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔ اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔ اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔“ اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو۔

(ب) سورة نساء میں ہے يَا يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ - حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴۳)۔

”اے ایمان والو! تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالتِ سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تا آنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)۔“ اس کے بعد پھر تیمم کا ذکر ہے۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ بحث الگ ہے)۔

(ج) نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ إِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقِمْ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ مِّنْهُمْ مَّعَكَ

وَلْيَتَاخَذُوا أَسْلِحَتَهُمْ - فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ
وَرَائِكُمْ - وَلَتَنَاتِ طَائِفَةٌ أُخْرَى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا
مَعَكُمْ وَلْيَتَاخَذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ (۱۰۴) -
”اور جب تو ان کے درمیان ہو۔ پھر ان کے لئے قیام صلوٰۃ کرے۔ تو چاہئے
کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار
لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور چاہئے
کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلوٰۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلوٰۃ ادا کریں۔
اور وہ اپنے بچاؤ (کاسمان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔“ اس کے بعد ۵۷ فاتحہ
قُضِيَ بَيْنَكُمْ الصَّلَاةُ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ
جُنُوبِكُمْ - فَإِذَا طُمَأْنِنْتُمْ فَاقِمُْوا الصَّلَاةَ (۱۰۴) -
”پھر جب تم صلوٰۃ ادا کر چکو تو کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے جس طرح جی چاہے
اللہ کا ذکر کرو۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلوٰۃ کرو۔“
اس سے پہلی آیت یہ ہے فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ
يَفْتِنَنَّكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا (۱۰۴) - ”اور جب تم زمین میں
سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے ہرج کی بات نہیں کہ تم صلوٰۃ کو کم
کر لو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔“ اس
ضمن میں (۱۰۴) بھی دیکھئے۔

صلوٰۃ کے کم کرنے کا طریق (۱۰۴) میں بیان ہو چکا ہے۔

(د) سورة مائدة میں ہے وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَٰذَا
هُزُوًا وَلَعِبًا (۵۸) - ”اور جب تم صلوٰۃ کے لئے آواز دیتے
ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں۔“ سورة الجمعة
میں ہے إِذَا نَادَىٰ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ
ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ - ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُونَ - فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ
وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَشِيرَ الرَّعَلَاتِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ (۹۱) - ”جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلوٰۃ
کے لئے بلایا جائے تو ”اللہ کے ذکر“ کی طرف جلدی آ جایا کرو اور کاروبار
کو چھوڑ دیا کرو۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم اس حقیقت کو
محسوس کر لو گے کہ) یہ تمہارے لئے (کے قدر) بہتر ہے۔ پھر جب صلوٰۃ
ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔ اور

”اللہ کا بہت ذکر کرو“۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ“۔ اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشا نظر آجاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں سے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ (۲۱/۱)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوة کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ (ع۔ ب۔ د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائیگا، قرآن کریم کی رو سے ”خدا کی عبادت“ سے مفہوم اس قسم کی ”پرستش“ یا ”ہوجا پاٹ“ نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ”عبادت“ کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت۔ یا ”اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے“۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت، زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا: وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۲۸/۱)۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور اقامتِ صلوة کرتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں“۔ ان آیات میں، اطاعت خداوندی۔ اقامتِ صلوة اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی، اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہونگے۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ”اقامتِ صلوة“ ہی کا ایک حصہ ہونگے۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ (ر۔ ک۔ ع) اور (س۔ ج۔ د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے، انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے، اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ، خوشی، تعجب، عزم و ارادہ، ہاں اور نہ،

وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذباتِ عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ”سر تسلیم خم“ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے، اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں، بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے، وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار، اجتماعی شکل میں ہو، تو اظہار جذبات کی مجسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دینگا۔ احترام و عظمت، انقیاد و اطاعت، اور فرماں پذیری و خضوع و سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذباتِ اطاعت و تسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلوٰۃ) جسے قرآن کریم، جماعتِ مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جسطرح آجکل ہمارے ہاں جلسوں کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسم ادا کر دی جاتی ہے)۔ (وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ - وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ) ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر، قرآن کریم نے انہیں کیتاباً مَوْقُوتاً (مقرر) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ”خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ“۔ اور دوسرے معنی ہیں ”ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے“۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے، تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہو جاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو، ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو، اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وَاتَّخَذُوا كِتَابًا نَّيْمًا)۔

یوں تو جماعتِ مومنین کی ساری زندگی—دن—رات—صبح—شام—قوانین خداوندی کی اطاعت اور انکے نفاذ کی تگ و تاز میں گذرتی ہے، لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں۔ ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے، جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ”سعد و نحس“ کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ سورج نکلنے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہئے۔ دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک اجتماعات صلوٰۃ کا تعلق ہے۔ اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ . . . (۲۸) ”تم دلوک الشمس“ سے رات کی تاریکی تک اقامتِ صلوٰۃ کر سکتے ہو۔ اور صبح کے وقت کا قرآن بھی۔ (د۔ ل۔ ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ”دلوک“ میں، صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے، بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے۔ نصف النہار تک پہنچنے، مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہو جانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو۔ ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود، ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ”وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ“ (۱۱۳)۔ ”دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامتِ صلوٰۃ کرو“۔

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ کیا گیا ہے، وبسے اقامتِ دین کے سلسلہ میں جماعتِ مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح، تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن، رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے۔ دیکھئے (۱۶۰) و (۱۶۱) و (۱۶۲) وغیرہ۔

سورۃ نور میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر (ضمنیاً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تمہاری (Privacy)

کے اوقات میں ، اجازت لیکر کمرے کے اندر آیا کریں ۔ یعنی مِّنْ قَبْلِ صَلَوةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَوةِ الْعِشَاءِ (۲۳/۵۸) ”صلوٰۃ الفجر سے پہلے۔ اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیتے ہو۔ اور صلوٰۃ العشاء کے بعد“۔ اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اجتماعات صلوٰۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے۔ جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لیکر کیا ہے۔

جہاں تک صلوٰۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے ، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو (۳/۳)۔ دوسرے مقام میں ہے وَلَا تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكُمْ وَلَا تَخَافُتْ يَهَا۔ وَأَبْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (۱۱۰/۱)۔ ”اور اپنی صلوٰۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے۔ ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر“ بعض لوگوں کا خیال ہے اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے۔ نماز نہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا۔ ”ذکر“ کے متعلق قرآن کریم میں بہ صراحت موجود ہے (۲۵/۲) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہئے۔ یہ آواز بلند نہیں۔ (ذکر سے مراد ، قانون خداوندی کی یاد دہی)۔ اسلئے مندرجہ بالا آیت میں صلوٰۃ سے مراد ”نماز“ ہی ہو سکتی ہے۔ قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلوٰۃ سے مراد اجتماعات صلوٰۃ ہیں۔ (اس کے لئے فعل صَلَّی - يَصَلِّي آتا ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں ”اقیموا الصلوٰۃ“ کہا ہے وہاں ، یہ ہیئتِ مجموعی ، اس سے مراد ہے ، اقامتِ دین۔ (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل و استحکام)۔ قوانین و احکام خداوندی کا اتباع۔ ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبدِ مومن پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعاتِ صلوٰۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں۔ متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود کیا ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں ”مصلین“ آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعتِ مومنین (بہ ہیئتِ مجموعی) ہے یا صرف اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شرکت کرنے والے ، اس لئے کہ قرآن کریم نے ان ”مصلین“ کا بھی ذکر کیا ہے جو شرفِ انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے (۲۴/۲۵)۔ اور ان کا بھی جن کے لئے تباہی ہے (۲۴/۲۶)۔

(۱۰) صَلَّیْ عَلَیْہِ - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا - دعا دینا - حوصلہ افزائی کرنا - پروان چڑھانا - نشوونما دینا - کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا *۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علی کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورہ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهٗ (۳۳)۔ ”خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں“۔ یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبرائے نہیں۔ حوصلہ نہیں ہمارے، بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ (۱۵۷)۔ یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تہنیت ہیں۔ انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے۔ ان کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتُهٗ يَصَلُّوْنَ عَلٰی النَّبِیِّ (۵۶)۔ خدا اور اس کے ملائکہ نبیؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ یَاۤیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳)۔ ”اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبیؐ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اسکی مدد کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو“۔ (۱۵۷)۔ وَتَعَزَّوْهُ وَتُقَرِّوْهُ (۹۶)۔ (تاکہ) تم اسکی مدد کرو۔ اسکی عزت و توقیر کرو۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے وَتَعَزَّوْهُ وَنُصِّرْوْهُ (۱۵۷)۔ ”جنہوں نے اسکی تائید و تعظیم کی۔ اسکی مدد کی“۔ اس طرح کہ وَاتَّبِعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهٗ (۱۵۷) ”جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا“۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوْا عَلَیْہِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صَلَوَاتٌ جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرمؐ پر۔ اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوة و سلام نبی اکرمؐ پر۔

آپ نے غور فرمایا کہ صَلَّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرمؐ لیکر تشریف لائے تھے۔ دوسری طرف نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعتِ مومنین کے افراد، اتفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لیکر آئیں تو اسے قبول کر، وَصَلِّ عَلَیْہِمْ۔ اِنْ صَلَّوْتَکَ سَکَنَ لِقَہُمْ۔ (۱۳۱)۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کر۔ اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)، تحسین و تہریک (Appreciation)، ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے۔ وہ اس اتفاق فی سبیل اللہ کو قُرْبَاتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ (۱۳۲) کا موجب سمجھتے ہیں۔ یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین و تہریک اور حوصلہ افزائی کا موجب۔ ("قرب خداوندی" کے لئے ق۔ ر۔ ب کا عنوان دیکھئے)۔

(۱۱) لغت عبرانی میں صَلَوَاتٌ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں۔ (۱۳۰) میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔

صلی

صَلَّى اللّٰحِظَ یَصَلِّیْہِ بِالنَّارِ صَلَّیَا۔ اسنے گوشت کو بھون لیا۔ اسنے گوشت کو بھوننے کیلئے اسے آگ میں ڈال دیا *۔

الصَّلَیُّ کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں۔ صَلَّی بِالنَّارِ۔ اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی۔ وہ آگ میں جلا۔ صَلَّیْتُ الشَّقَاةَ۔ میں نے بکری کو بھون لیا **۔ أَصْلَاہُ النَّارَ وَصَلَاہُ۔ اس نے اسے جلنے کیلئے آگ میں داخل کر دیا۔ اسکا ٹھکانہ آگ میں بنا دیا ***۔

الصَّلَاةُ۔ بھنی ہوئی چیز۔ آگ جلانے کیلئے ایندھن *۔

صَالَ۔ وہ جو آگ میں بھنے۔ جو جہنم کی طرف جانے۔ مَنُ هُوَ صَالَ الْجَحِیْمِ (۱۳۳)۔ الصَّلَیُّ : جانا، آگ کی تکلیف برداشت کرنا (۱۳۴)۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے الَّذِیْ یَصَلِّی النَّارَ الْکُبْرٰی (۸۴) جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوتا (یا بھتا) ہے۔

سورۃ حاقہ میں ہے ثُمَّ الْجَحِیْمُ صَلَّوْہُ (۱۳۵)۔ پھر اسے جہنم میں داخل کرو۔ سورۃ مدثر میں ہے مَا صَلَّیْہِ سَقَرٌ (۳۶)۔ میں اسے دوزخ میں

داخل کرونگا۔ سورہ واقعہ میں ہے تَصْلِيَةً جَحِيمٍ (۵۶) جہنم میں جلانا۔ اَصْطَلَتْ (اَصْطَلَتْ) آگ تاپنا اور اس سے گرمی حاصل کرنا۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (۲۴)۔

ص م ت

الصَّمْتُ*۔ الصَّمُوتُ*۔ الصَّمَاتُ*۔ خاموش ہونا۔ (سَكَتَ اور صَمَتَ کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان س۔ ک۔ ت) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابہام اور اغلاق کے ہوتے ہیں۔ اَنْتُمْ صَامِتُونَ (۶۳) تم چپکے رہو۔ الصَّمَاتُ*۔ سونے چاندی (یعنی نہ بولنے والی دولت) کو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف النّاطِقُ*۔ وہ دولت جو جانوروں کی شکل میں ہو۔ الصَّمُوتُ*۔ گڑ جانے والی تلوار۔ حَائِطٌ مَّصْمُوتٌ*۔ وہ دیوار جس میں کوئی روشن دان، دروازہ یا شگاف نہ ہو*۔

ص م د

الصَّعْدُ*۔ بلند جگہ جو، سخت ہو لیکن اتنی اونچی نہ ہو کہ پہاڑ کی حد تک پہنچ جائے۔ الصَّعْدَةُ*۔ پتھر کی محکم چٹان۔ الصَّعْدُ*۔ وہ سردار جسکی اطاعت کی جائے اور جسکے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ وہ ہستی جس کی طرف ضروریات کیلئے رجوع کیا جائے۔ وہ ہستی جس سے کوئی مستغنی نہ ہو سکے۔ وہ شخص جسے جنگ میں نہ بھوک ستاتی ہو نہ پیاس۔ نَاقَةُ مِصْمَدٍ*۔ وہ اونٹنی جو سردی کی شدت اور چارہ کے کم ہونے کے باوجود برابر دودھ دیتی رہے*۔ صِمْدٌ التَّمِيحَاتِ*۔ ہل کی وہ لکڑی جسے ہل چلانے وقت ہالی ہاتھ سے پکڑتا ہے*۔ الصَّعْدُ*۔ قصد اور ارادہ کرنا*۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے الصَّعْدُ* آیا ہے۔ اللہ الصَّعْدُ* (۱۱۲)۔ ”اللہ ہی صمد ہے“۔ الصَّعْدُ* کے ان معانی پر غور کیجئے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے خدا کے متعلق کیسا وسیع اور بلند تصور پیش کیا ہے۔ یعنی ایسی بلند اور محکم چٹان کہ جب ہر طرف سے سیلاب کا پانی گھیر لے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے تو لوگ اسکی طرف رجوع کریں اور انہیں وعان پناہ مل جائے۔ نیز وہ ذات جو دوسروں کی تمام ضروریات کو تو پورا کرے لیکن خود ان سب سے مستغنی ہو۔ نیز، اسکی نوازشات غیر منقطع ہوں اور اسکی ربوبیت مسلسل جاری رہے۔

جو قوم اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر لے اسکے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں بھوک اور پیاس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو اور دوسروں کی نشوونما میں سردی اور قحط بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں۔ چٹان کی طرح محکم اور سب سے آسروں کا آخری سہارا۔ اور قابل اعتماد آسرا۔ لیکن دوسروں کے سہاروں سے مستغنی۔

خدا کے متعلق قرآن کریم نے قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ - اللَّهُ الصَّمَدُ (۱:۱۶۲) کہہ کر ایک اور بلند حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ أَحَدٌ کے معنی ہیں منفرد۔ یگانہ (Unique)۔ اس انفرادیت میں مخلوق سے ہے ہمگی (Transcendence) کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن صمدیت کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کی ایک ایک سانس اسکی ربوبیت سے وابستہ ہے۔ اس سے اسکی باہمگی (Immanence) کا پہلو نمایاں ہے۔ لہذا وہ ذات باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ یہی صفت مومن کی ہونی چاہیئے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ در قافلہ ہے ہمہ شویا ہمہ رو

یعنی أَحَدٌ بَاقٍ اور صَمَدٌ بَاقٍ دونوں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور بلند ترین ہے۔ یعنی (The Most Developed, Complete, and Perfect Personality) اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے، لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں۔ صفات خداوندی (الاسماء الحسنی) جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، ذات خداوندی کے مختلف گوشے (Facets) ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہیں۔ (مثلاً هُوَ لَا وَقُلْ)۔ لیکن دوسری صفات ایسی ہیں جو (حدود بشریت کے اندر) انسانی ذات میں منعکس ہو سکتی ہیں۔ ان میں صمدیت بھی شامل ہے۔ یعنی جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائیگی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ہوتی جائیگی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائیگی۔ حریت اور استغناء (Freedom and Independance) ذات کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ہیں۔ (مزید تفصیل ر۔ و۔ ح اور ن۔ ف۔ س کے عنوانات میں دیکھئے)۔

ص م ع

أَلَا صَمْعٌ - چھوٹے کانوں والا آدمی - ظَبْنِيْ مُصَمِّعٌ - ہرن جس کے سینک اوپر سے بتلسے اور باریک ہوں - الصَّقْوُ مَعْبَةٌ - عقاب، کیونکہ وہ بلندی

ہر اڑتا ہے۔ صَوَّاعٌ*۔ خانقاہ، چونکہ اسکا منارا اوپر سے لمبا اور نوکدار بنایا جاتا تھا۔ (جیسے گرجا یا مندر کا منارہ)۔ یا اسکی تنگی کی وجہ سے، جس طرح اس آدمی کا سر ہوتا ہے جسکے کان چھوٹے چھوٹے ہوں۔ لیکن بلندی کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں صَوَّاعٌ بِنَاءُہُ*۔ اسنے اپنی عمارت کو بلند کیا۔ اصْصَعُ*۔ معزز ترین مقام پر ترقی کرنے والا۔ صَمِيعٌ*۔ وہ اپنی دھن میں سر اٹھائے ہوئے پروائی کے ساتھ گزر گیا*۔ صَوَّاعٌ* کی جمع صَوَّاعِیُّنَ* آتی ہے (۲۲)۔ خانقاہیں، یعنی راہبوں کی کوٹھڑیاں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں باریکی اور لطافت اور اتصال پایا جاتا ہے۔ یعنی کسی شے کا باریک ہونا اور ساتھ ہی اس کے اجزا کا باہم دگر پیوست ہونا۔

ص م م

صَمَمٌ* کے معنی ہیں کان کا بند ہو جانا اور ثقلِ سماعت۔ صِمْصَمٌ الْقَارُورَةُ*۔ شیشی کے ڈاٹ کو کہتے ہیں جس سے اس کا منہ بند کیا جاتا ہے۔ صَخْرَةٌ* صَمَّاعٌ*۔ ٹھوس اور سخت چٹان جس میں کوئی شکاف نہ ہو۔ آلا صَمَمٌ*۔ بہرہ۔ اس کی جمع صَمَمٌ* ہے۔ نیز ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی مرضی کرے اور کسی کی نہ سنے اور جس سے یہ توقع نہ رہے کہ اسے اس کی خواہشات سے باز رکھا جاسکے***۔

الْمُصَمِّمُ*۔ وہ اونٹ جو بڑبڑائے نہیں اور نہایت استقامت سے چلتا جائے***۔ قرآن کریم میں صَمَمٌ* کا لفظ بہروں کے لئے آیا ہے، نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو حق کی آواز نہ سنیں اور اپنی مرضی کرتے چلتے جائیں۔ وہ لوگ جو جانوروں کی طرح ہوں اور عقل و فکر سے کام نہ لیں (۴۲)۔ قرآن کریم اندھے، بہرے، گونگے، حتمکہ* مردے، ان لوگوں کو کہتا ہے جو عقل و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام نہ لیں اور جذبات سے مغلوب ہو کر، یا تقلیدی طور پر، غلط راہوں پر چلتے جائیں۔

اصَمَمٌ*۔ بہرہ کر دینا (۴۲)۔

ص ن ع

صَنَعَ* کے معنی کسی کام کو (قاعدے اور قانون کے مطابق نیز فن کے اعتبار سے) اچھی طرح کرنے کے ہیں۔ اس لئے یہ لفظ فَعَّلَ* (کام کرنے) سے خاص ہے اور حیوانات کے لئے نہیں بولا جاتا****۔

* تاج۔ محیط و راغب۔ ** لطائف اللغة۔ *** تاج و محیط۔ **** راغب۔

صُنْعٌ* - بہت اچھی کاریگری کو کہتے ہیں*۔ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْ
 اَتَقَّنَ كُلَّ شَیْءٍ (۲۸) - خدا کی (کیسی عجیب و غریب) صنعت کاری ہے
 جس نے ہر شے کو نہایت کمال و مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے۔
 صَنْعَةٌ* - کسی چیز کا عمدگی سے بنانا (۲۱) - اَلْمَصَانِعُ* - عمارات -
 حوض یا تالاب جن میں بارش کا پانی جمع کر لیا جائے - محلات - قلعہ - پختہ
 آبادیاں نیز صنعت گاہیں اور کارخانے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ آبپاشی کے
 لئے جو کنواں وغیرہ بنایا جائے یہ اس کے لئے بولا جاتا ہے - راغب نے اس کے
 معنی بلند اور معزز و ہرجلال مقامات کثرت ہیں - (۲۶) - صُنْعَ الْفَرَسِ* -
 گھوڑے کی عمدہ طریقہ سے دیکھ بھال ، نگرانی اور تربیت کرنا - هُوَ صَنِيعِي* -
 وہ میرا پروردہ و تربیت یافتہ ہے* - سورہ طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق
 خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تجھے فرعون کے محلات میں پہنچا دیا تاکہ وہاں
 ہماری زیر نگرانی تمہاری تربیت ہو اور تم سلطنت کے امور اور مملکت کے انداز
 سیکھ سکو - لِيَتَّصِنَعَ عَمَلِي عَيْنِي* (۲۹) - اس سے ظاہر ہے کہ ، ہونے
 والے رسول کی پیدائش خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتی تھی اور شروع ہی سے
 اس کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر نبوت جیسی عظیم القدر
 ذمہ داری کا اہل بن سکے - اسی لئے حضرت موسیٰؑ کی قبل از نبوت زندگی کے
 مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا - ثُمَّ جِئْتُ عَمَلِي قَدَرٍ
 بِمُوسَىٰ (۳۰) - اتنی کٹھالیوں میں تاؤ کھائے - فَتَوْنَا (۳۱) کے بعد
 تب کہیں جا کر تم نبوت کے ہیمنے پر پورے اترے - لہذا یہ سمجھنا محض
 ”شاہری“ ہے کہ - آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے - اس سے آگے ہے
 وَاصْطَفَيْنَاكَ لِنَتَّقِيَ (۳۱) اَلْاِصْطِنَاعُ* کے معنی ہیں کسی چیز کے
 سدھارنے میں انتہائی زور اور توجہ صرف کرنا - بہت زیادہ غور اور احتیاط سے
 اصلاح و تربیت کرنا** - لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری تربیت خاص
 پروگرام کے مطابق کی گئی ہے - اس لئے کہ ہمیں تجھ سے ”اپنا کام“ لینا
 تھا - یہ سب کچھ ہم نے اپنے ایک مقصد کے لئے کیا ہے - وہ مقصد کیا ہے؟
 اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۳۲) - فرعون کی طرف جاؤ - اس نے
 حد اعتدال سے نکل کر بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے - یعنی استبداد
 و سرکشی کی قوتوں کو مغلوب کر کے مظلوم انسانیت کو ان کے آہنی پنجہ
 سے چھڑانا ، اور پھر ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ شرف انسانیت کے اہل بن
 جائیں - یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے ایک نبی کی تربیت کی جاتی تھی -

اور جسے خدا نے خود ”اپنا کام“ کہا ہے۔ (واضح رہے کہ نبی کو اس دوران میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ انسان اپنی سعی و عمل سے مقام نبوت تک پہنچ سکتا ہے مقام نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے)۔

ص ن م

الصَّٰلِحٰتُمْ (جمع اصْنَام*) - بت۔ صَنَعْتُمْ الصَّٰوِرَةَ کے معنی میں تصویر کو خوشنما اور جاذب بنا دینا**۔ نیز کسی چیز کی بُرو کے خراب ہو جانے کو بھی کہتے ہیں*۔ راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے، صَنَعْتُمْ کہلاتی ہے***۔ لہذا اصْنَام* وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانون خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ اِلَّا صُنُۡمًا (۱۱۶)۔ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کر لیں تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اس کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور انکی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی***۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمَا يَتُومِنُ اَكْثَرُ هُمْ بِاِلٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْكِرٌ كُوْنُ (۱۲۶)۔ ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک کے مشرک بھی رہتے ہیں۔ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق نہیں۔ ہم تو کسی بت کی پرستش نہیں کرتے۔ یعنی ہماری نگاہ مٹی اور پتھر کے بتوں کی طرف رہتی ہے اور ان بتوں کو کبھی نہیں دیکھتی جو ہر آن ہمارے قلب و دماغ کے صنم کدوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی آستینوں میں لئے لئے مسجدوں میں سجدے اور حرم کعبہ میں طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑی اصنام پرستی اور اس سے سنگین تر شرک اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ بت پرستی تھی جس کا خدشہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں (اپنی اولاد کی طرف سے) پیدا ہوا تھا اور ہم (ملت ابراہیمی کے مدد سے) ان کے اس خدشہ کو سچا کر کے دکھلا رہے ہیں!

ص ن و

الصَّيْنُوْ - کھجور وغیرہ کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صینو کہتے ہیں۔ اس کی جمع صینوآن ہے*۔ لہذا تَخْيِيْلُ صَيْنُوْآن (۱۳) ایسی کھجوروں کو کہیں گے جن میں ایک ہی اصل سے دو دو یا زیادہ تترے پھوٹتے ہوں اور غَيْرُ صَيْنُوْآن (۱۴) انہیں جو الگ الگ جڑوں سے تنہا نکلتی ہوں۔ الصَّيْنُوْةُ - حقیقی بہن، بیٹی، یا پھوپھی کو کہتے ہیں اور الصَّيْنُوْ حقیقی بھائی، بیٹے اور چچا کو۔ کیونکہ ہر سب ایک ہی اصل کی شاخیں ہوتے ہیں*۔

ص ه ر

الصَّهْرُ - گرم۔ شَمْسِيٌّ صَهْرٌ - گرم چیز۔ الصَّهْرُ - چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا۔ صَهْرَتُهُ الشَّمْسُ تَصْهَرُ - دھوپ کی سخت تابش نے اس کے دماغ کو کھولا دیا، یا اس کی چربی پگھلا دی۔ صَهْرَتُهُ بِالنَّتَارِ میں نے اسے آگ پر پکا کر گلا دیا۔ الصَّهْرَارَةُ - پگھلائی ہوئی چربی*۔ سورۃ حج میں ہے يَصْهَرُ بِهِ مَارِيٌّ بَطْنُوْ نِيْهِمْ (۲۲) اس کے ذریعے جو کچھ ان کے اندر ہے اسے گلایا اور پکا دیا جائیگا۔ ان کی شدت اور سختی پگھلا دی جائیگی۔

الصَّهْرُ - قرابت۔ اس کے متعین مفہوم کے لئے بہت سے اقوال آئے ہیں لیکن اکثریت کا خیال اسی طرف ہے کہ بیوی کے خاندان والے الصَّهْرُ کہلاتے ہیں اور شوہر کے خاندان والے أَخْتَانُ - قرآن کریم میں ہے فَجَعَلْتَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (۲۵)۔ نسب سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو اپنے اباؤ اجداد کی طرف سے ہو اور صِهْرٌ سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے*۔ قرآن کریم عائلی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ میان بیوی دونوں کے رشتہ داروں کو مشترکہ رشتہ دار قرار دیتا ہے۔

ص و ب

صَابَ - يَصُوْبُ - صَوْبًا کے معنی میں گھرنا۔ اوپر سے نیچے آنا۔ نیز قصد و ارادہ کرنا۔ بارش کا گھرنا۔ صَوْبٌ وَصَوَابٌ - خطا کی ضد بھی ہے۔ یعنی صحیح بات۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی

*تاج و محیط و راغب۔

چیز کے اترنے اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بات یا کام جو اپنی صحیح جگہ پر پہنچ کر ٹھہر جائے صَوَابٌ کہلائیکا۔ سَتَمٌ صَائِبٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جالگے۔ نیز صَوَابٌ کے معنی بہانے (گرانے) اور اوپر سے اترنے کے بھی آتے ہیں۔ آسمان سے بارش ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مُصِيبَةٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد ہر حادثہ اور واقعہ کو مُصِيبَةٌ کہنے لگے۔ تَصَوُّبٌ کے معنی ہیں کسی بات کی تصدیق کرنا کہ وہ ٹھیک ہے۔ اَلصَّيِّبُ بارش کو کہتے ہیں *۔ لسان العرب میں ہے کہ صَيِّبٌ دراصل اس بادل کو کہتے ہیں جو بارش برساتے۔ اسکی تائید ابن فارس نے بھی کی ہے۔ اَصَابَ مِّنَ السَّمَاءِ آتٍ مِّنَ السَّمَاءِ عِوَجًا اور اس سے مجامعت کی۔ یعنی اپنی حاجت اس سے پوری کر لی **۔

قرآن کریم میں صَيِّبٌ - بارش (یا بادل) کے معنوں میں (۲۸) میں آیا ہے۔ سورۃ نحل میں ہے فَاصَابَهُمُ سَيِّئَاتٌ مَّا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمُ مَا كَانُوا يَمُرُّونَ (۱۳۳)۔ جو کچھ بد عملیاں وہ لوگ کرتے تھے ان کے نتائج ان تک پہنچے اور جن آتے والے واقعات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں آکر گھیر لیا۔ یہاں اَصَابَ کے معنی ہیں کسی بات کا واقع ہونا۔ اَصَابَهُ الْكَيْسُ (۲۶۶) کے معنی ہیں اس پر بڑھاپا آگیا۔ سورۃ ص میں حَيِّثُ اَصَابَ (۳۸) کے معنی ہیں جس طرف کا وہ قصد کرتا تھا۔ اور سورۃ نبا میں قَالَ صَوَابًا (۳۸) کے معنی ہیں وہ درست اور ٹھیک بات کہے۔

سورۃ نساء میں مُصِيبَةٌ کے مقابلہ میں فَاضِلٌ کا لفظ آیا ہے (۲۳۲)۔ لہذا مُصِيبَةٌ کے معنی معاشی بد حالی یا ناکامی کے ہوئے۔ اور (۲۵) میں مُصِيبَةٌ کے مقابلہ میں حَسَنَةٌ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے اس کے معنی ہوئے زندگی کی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں۔ سورۃ تغابن میں ہے مَا اَصَابَ مِّنْ مُّصِيبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۶۴) یعنی کائنات میں جو حوادث و واقعات ظہور میں آتے ہیں وہ سب خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوئے ہیں۔ اس میں مُصِيبَةٌ کے معنی حادثہ یا واقعہ (Event) کے ہیں۔ (اذن بمعنی قانون کے لئے ہوان ۱۔ ذ۔ ن دیکھئے)

سورۃ یوسف میں ہے نَصِيبٌ بِرَحْمَتِنَا مِّنْ نَّشَاءِ (۱۲)۔ ہم اپنی رحمت اپنے قانون مشیت کے مطابق جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں۔ اس کے

بعد وَلَا تُضَيِّعْ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲۶) کہہ کر بات واضح کر دی کہ
خدا کی یہ رحمت، حضرت یوسفؑ کی حسن کارانہ زندگی اور کردار کا نتیجہ تھی۔
البتہ نبوت، انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ مُصِيبٌ (اسم فاعل)
واقع ہونے والا۔ پہنچنے والا۔ (۱۱۱)۔

ص و ت

الصَّوْتُ: آواز (جمع اصْوَاتٌ)۔ یہ لفظ انسان اور غیر انسان دونوں
کی آواز کیلئے بولا جاتا ہے۔ الصَّائِتُ: چیخنے والا۔ رَجُلٌ صَاتٌ: سخت
آواز والا آدمی*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جو کچھ منہ سے نکلے اگر
وہ کسی حرف پر مشتمل نہ ہو تو اسے صَوْتُ کہتے ہیں**۔ راغب نے
کہا ہے کہ دو جسموں کے ٹکرائے سے دب جانے والی (منضغط) ہوا کو
صَوْتُ کہتے ہیں***۔ (لیکن راغب کا مفہوم واضح نہیں)۔
قرآن کریم میں ابلیسی قوتوں کے لئے بھی صَوْتُ کا لفظ آیا ہے (۶۴)۔
اسکے معنی ہر قسم کا غلط پراپگنڈا ہوگا۔ انسان کی آواز کے لئے بھی (۱۹)
اور گدھے کی آواز کیلئے بھی (۳۱) جہاں اسے اَثْكِرًا لَا صَوَاتٍ کہا گیا
ہے، یہ لفظ آیا ہے۔

سورة حجرات میں ہے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَتَسْمَعُ صَوْتِ
الَّتِيْبِ (۲۹)۔ اپنی آواز کو نیسیؑ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اگر اس میں
صَوْتُ کے حقیقی معنی لئے جائیں تو یہ حکم آداب معاشرت سے متعلق ہوگا۔
اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنے فیصلے کو
رسولؐ کے فیصلے پر فائق نہ سمجھو۔ مشورہ میں رائے دو لیکن اطاعت اُس
کے فیصلے کی کرو۔ (۳۳ : ۲۵)۔

ص و ر

الصُّوْرَةُ: شکل۔ ہیئت۔ کسی شے کی حقیقت۔ صفت۔ نوع۔ وہ
خد و خال جس سے انسان کو پہچانا جائے اور دوسروں سے اس کا امتیاز کیا
جائے****۔ (۸۱)۔ صَوْرٌ: صورت بنانا۔ (۳)۔ الْمُصَوِّرُ: صورت بنانے والا۔
خدا کی صفت ہے (۲۳)۔ کوئی شے، صورت (Form) کے بغیر محسوس و مرئی
ہو نہیں سکتی۔ اسلئے اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پروگرام میں مصوریت کا مقام
وہ ہے جہاں غیر مرئی و غیر محسوس قوتوں کو ایک خاص ترتیب دیکر
(خلق) محسوس و مرئی بنا دیا جائے۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔ **** تاج و راغب و محیط

صَوْرَةٌ - کی جمع صَوَرٌ بھی آتی ہے اور صُورٌ بھی **۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں نَفَخَ صُورٌ کا ذکر آیا ہے (مثلاً يَوْمَ يَنْفَخُ فِي الصُّورِ ۱۸)۔ تو اس کے معنی ہونگے جب صورتوں میں روح پھونکی جائے گی*۔ جب اقوام کے مردہ پیکروں میں قانون خداوندی کے مطابق تازہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جب انہیں (نظام خداوندی کی رو سے) حیات تازہ مل جائیگی۔ اس دنیا میں حیات تازہ بھی اور مرنے کے بعد حیات نو بھی۔ نیز صُورٌ اس نرسنگھے کو کہتے ہیں جو لڑائی کے وقت بجایا جاتا ہے*۔ اور جس سے مراد اعلان جنگ ہوتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے جب نَفَخَ فِي الصُّورِ (۱۸) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظام خداوندی کے انقلاب کیلئے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائیگا۔

صَارَ الشَّيْءُ يَصُورًا - کے معنی ہیں چیز کو مائل کر دینا۔ ایک طرف جھکا دینا۔ صَوَّرَ يَصُورُ - مائل ہونا۔ صُرْتُ إِلَى الشَّيْءِ - میں اس چیز کی طرف مائل ہوا۔ صُرْتُ إِلَى - میری طرف متوجہ ہو۔ اسی لشے عَصْفُورٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آجائے۔ اور الصَّيَّوَارُ گایوں کے گلہ کو کہتے ہیں (جو چرواہے کی آواز پر چلتا ہے)۔ سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطُّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ (۲۶)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لے۔ اپنے سے ہلالے۔ اپنی طرف ایسا مائل کر لے کہ وہ تیری آواز پر چلتے آئیں*۔

ابن فارس نے ان تمام معنی کو لکھنے کے بعد کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ان میں قیاس نہیں چلتا۔

ص و ع

الصَّاعُ - الصَّيَّوَاعُ - الصَّوَّاعُ - ایک پیمانہ ہے جس سے غلہ ناپا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ الصَّيَّوَاعُ سے غلہ نہیں ناپا جاتا بلکہ یہ اس برتن کو کہتے ہیں جس سے پسا جاتا ہے*۔ قرآن کریم میں صَوَّاعُ الْحَمَلِكِ (۱۲) آیا ہے۔ یعنی شاہی پیمانہ جس سے پانی بھرنے کا گام بھی لیا جاتا تھا۔ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی پھٹ جانے اور جدا ہو جانے کے بھی ہیں (ابن فارس)

ص و ف

الصُّوفُفُ*۔ اون۔ (جمع اصْوُوفُ* ۱۸۸)۔ صُوفُفُ*۔ بھڑکی اون کو کہتے ہیں۔
شَعْرٌ*۔ بکری کی اون کو۔ اور وَبَرٌ*۔ اونٹ کی اون کو*۔ سورۃ نحل
(۱۸۸) میں ان تینوں کا ذکر ہے۔ (بعض کے نزدیک الصُّوفُوفُیُّ*۔ صُوفُفُ*۔ کی
طرف منسوب ہے**۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صوفی) کہیں نہیں آیا۔
تصوف کا تصور ہی غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ تفصیل کے
لئے دیکھئے میری کتاب ”سلیم کے نام خطوط“۔ جلد سوم)۔

ص و م

صَامَ۔ رک جانا۔ ٹھہر جانا، باز رہنا۔ کہتے ہیں۔ صَامَ عَنِ الْكَلَامِ۔
بات کرنے سے رک، خاموش رہا۔ صَامَ عَنِ النِّكَاحِ۔ نکاح سے باز رہا۔
صَامَ عَنِ السَّيْرِ۔ چلنے سے رک۔ صَامَ الْمَاءَ۔ پانی کھڑا ہو گیا۔ مَصَامٌ*
کھڑے ہونے کی جگہ*۔

قرآن کریم میں صِيَامٌ* کو فرض قرار دیا گیا ہے (۱۸۳)۔ اس کے لئے
بنا دیا کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا
نام ہے (۱۸۴)۔ یہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہونا
شروع ہوا تھا (۱۸۵)۔ جو شخص مقیم ہو۔ (سفر میں نہ ہو) اور تندرست ہو (مریض
نہ ہو) اور اس کی طبیعتی حالت ایسی ہو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانی پڑے
(۱۸۶) تو اس پر روزہ فرض ہے۔ مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفایاب
ہونے کے بعد گنتی کو پورا کرے (۱۸۷) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ہو
وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (۱۸۸)۔

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر
بنانے کے لئے سالانہ عسکری ٹریننگ کے مرادف ہیں۔ ان کا مقصد قرآن کریم
نے خود واضح کر دیا جہاں کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۸۳) تاکہ تم
قوانین خداوندی کی نگہداشت کے قابل ہو جاؤ۔ لَتَشْكُرُوا اللَّهَ عَلىٰ
مَا هَدَاكُمْ (۱۸۵) تاکہ تم قرآن کریم کی روشنی میں قوانین خداوندی کو
انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام ہائے حیات پر غالب کر سکو۔
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۸۵) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج
پیدا کر سکیں۔

صَائِمٌ* (۳۳/۳۳) روزہ رکھنے والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا۔ اپنے آپ پر کنٹرول (ضبط نفس) رکھنے والا۔ حدود اللہ کے اندر رہنے والا۔

ص ی ح

الصَّيْحَةُ* - پورے زور سے نکالی ہوئی سخت آواز۔ صَاحٌ - بِصَيْحَةٍ* - چیخنا۔ اونچی آواز نکالنا۔ صَيْحٌ - بَيْهِيْمٌ* - ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ صَيْحٌ - فَيْهِيْمٌ* - وہ سب ہلاک ہو گئے۔ الصَّيْحَةُ* - لوٹ مار جبکہ وہ کسی قبیلہ پر یکبارگی ڈال دی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ صَيْحٌ* دراصل آواز بھانڈنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے اِنْصَاحٌ الخَشَبُ* اور التَّوْبُ*۔ ہے۔ یعنی لکڑی یا کپڑا پھٹا اور اس سے آواز نکلی**۔ الصَّيْحَةُ* - نوحہ کی چیخ و پکار کو کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں الصَّيْحَةُ* کا لفظ عذاب کے لئے آیا ہے، یا اس آواز کے لئے جو زلزلہ کے وقت آتی ہے، یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت آتی ہے۔ چنانچہ سورۃ ہود میں الصَّيْحَةُ* آیا ہے (۱۱/۱)۔ اور اسی کو سورۃ اعراف میں الرَّجْفَةُ* (۸/۸) کہا گیا ہے۔ یعنی زلزلہ۔ سورۃ یسٰ میں یہ لفظ ایسی تباہی اور عذاب کے لئے آیا ہے جو بیک لخت آجائے (۳۶/۳۶)۔ کیونکہ ایسے مواقع پر چیخ و پکار مچ جاتی ہے۔

ص ی د

صَادَةٌ - بِصَيْدَةٍ* وَ بَصَادَةٌ* - کسی کو چال اور حیلہ یا جال کے ذریعہ پکڑ لینا۔ شکار کر لینا۔ الصَّيْدُ* - شکار کرنا۔ نیز ہر وحشی جانور کو کہتے ہیں خواہ وہ شکار کر لیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ نیز شکار کئے ہوئے جانور کو بھی کہتے ہیں***۔ قرآن کریم میں صَيْدُ الْبَحْرِ* اور صَيْدُ الْبَرِّ* (۵۶/۵۶) آیا ہے۔ یعنی زبان میں الصَّيْدُ* مچھلی کو کہتے ہیں***۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ صَيْدٌ* وہ چیزیں ہیں جو اپنی آپ حفاظت کریں اور ان کا کڑی مالک نہ ہو۔ راغب نے کہا ہے کہ صَيْدٌ* ان حیوانات کے پکڑنے کو کہتے ہیں جو اپنی حفاظت کریں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں***۔ صَيْدٌ نَامَاءُ السَّمَاءِ* - ہم نے بارش کا پانی لے لیا***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا بغیر ادھر ادھر التفات کئے اپنی مرضی سے سیدھے چلے جانا۔ شکار کو بھی صَيْدٌ*

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و محیط

اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جانور اُدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ سیدھا بھاگتا چلا جاتا ہے۔

ص ی ر

صَارَ - کسی شے کا کسی خاص حالت تک پہنچ جانا۔ یا کسی خاص مقام تک پہنچ جانا۔ کسی شے کا ایک متعین شکل اختیار کر لینا۔ اَلْمَصِيْرُ وہ مقام جہاں سب اطراف کے پانی اکٹرو میل جائیں*۔ جمع ہونے کی جگہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مآل اور مرجع کے ہیں۔ یعنی لوٹنا اور انجام پذیر ہونا۔ اَلْمَصِيْرُ - منتہائے امر - انجام - مآل - اَلصَّيْثُورُ - آخر شے - منتہائے شے - کسی چیز کا انجام، مرجع و مآل - یہی معنی اَلْمَصِيْرُ کے بھی ہیں۔ مَصِيْرُ اَلْاُمُور - معاملہ کا انجام - آخری مقام - اسی سے صَارَہ - مَصِيْرُہ - کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو قطع کر دینا*۔

راغب نے کہا ہے کہ صَارَ سے مراد ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے۔ اسی سے اَلْمَصِيْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز انتقال و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے**۔

قرآن کریم میں اِلٰی اللّٰہِ اَلْمَصِيْرُ (۳/۳) متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرف انسانیت کی تکمیل صرف اس راستے پر چلنے سے ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف جانے والا ہے۔ انسان کی آخری منزل، منتہائے سفر، یہ ہے کہ وہ صفات خداوندی کے رنگ میں رنگ جائے۔ اسی میں اس کی تکمیل کا راز ہے۔ اس مقام اور منزل کے علاوہ، اور جو مقام اور حالت ہے وہ بیٹس اَلْمَصِيْرُ (۱۲۶/۲) نہایت بری منزل اور بڑی خراب حالت ہے۔ اسی کو جہنم کہا گیا ہے۔ یعنی اگر انسانی زندگی کا مآل اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ کیفیت جہنمی ہے۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا، اور اس طرح اپنی تکمیل ذات کر لینا، یہ ہے اِلٰی اللّٰہِ اَلْمَصِيْرُ۔ اس کے متعلق سورۃ شوریٰ میں ہے اِلٰی اللّٰہِ تَصِيْرُ اَلْاُمُور (۲۴/۲)۔ تمام معاملات کا مآل بالآخر قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اہل جنت کے متعلق ہے کَانَتْ لَہُمْ جَزَاءٌ وَ مَصِيْرًا (۲۵/۲)۔ جنت انکے اعمال کی جزا اور وہ مقام ہے جہاں ان کی ذات کی تکمیل ہوگی۔ اور یہی انسانی تگ و تاز کا منتہی ہے۔

ص ی ص

الصَّيْصِيَّةُ وَالصَّيْصِيَّةُ* - گائے اور ہرن کا سینک (جس سے وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں)۔ اس سے ہر اس چیز کو صَّيْصِيَّةٌ کہتے ہیں جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ مثلاً حفاظت گاہ، قلعہ۔ اس کی جمع الصَّيْصَايِيَةُ* آئی ہے*۔ قرآن کریم میں ہے مِّنْ صَّيْصَايِهِمْ* (۳۳)۔ یعنی ان کے قلعوں سے جن میں وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔

ص ی ف

الصَّيْفُ - گرمی کا موسم*۔ (یہ شِیْتَاءُ* یعنی سردی کے بالمقابل ہے)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”ش - ت - و“۔ قرآن کریم میں رَحْمَةً الشَّيْثَانِ وَالصَّيْفِ (۱۴) آیا ہے۔ یعنی قریش کے سردی اور گرمی کے زمانے کے سفر۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں۔ (۱) زمانہ اور موسم (گرمی)۔ اور (۲) جھکنا اور ہٹ جانا۔ صَافَتْ هَنَ الرَّهْدَافِ کے معنی ہیں تیر نشانہ سے ایک طرف ہٹ گیا۔ يَوْمٌ صَائِفٌ - گرم دن۔

ض

ض ا ن

ضَائِنٌ* (جمع ضَائِنٌ*) - بھیڑ (۱۶۴)۔ ضعیف اور کمزور کو بھی ضَائِنٌ کہتے ہیں*۔ جیسے بڑ دل، (بکری جیسے دل والا) ڈرہوک کو کہتے ہیں۔

ض ب ح

ضَبَّحَتِ النِّخِيلَ* ضَبْحًا - تیزی سے بھاگنے والے گھوڑے ھانپے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ ضَبْحٌ اور ضَبَّحٌ گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنے کو کہتے ہیں، حتکہ ایسا محسوس ہو کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کی سیدھ میں آ گئی ہیں۔ سرپٹ دوڑنا۔ لیکن سہیلی نے کہا ہے کہ ضَبْحٌ گھوڑے یا اونٹ کے تھکنے کے بعد ھانپنے کی آواز کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) آواز اور (۲) آگ کے اثر سے رنگ کا بدل جانا۔ نیز یہ بھی کہ یہ دراصل ضَبَّحٌ تھا (جس کے معنی اوپر دئے جا چکے ہیں)۔ قرآن کریم میں ہے وَالْعَدِيَّتِ ضَبَّحًا (۱۱۱)۔ اس سے تیز رفتار گھوڑے مراد ہیں جو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلیں۔

ض ج ع

ضَجَّعَ واضْطَجَعَ - اس نے اپنا پہلو زمین پر رکھ دیا (لیٹ گیا)۔ اَلْمُضْطَجِعُ* - پہلو رکھنے یا لیٹنے کی جگہ*۔ یہی معنی اَلْمُضْجِعُ کے بھی ہیں۔ اس کی جمع اَلْمُضْجَاعِجُ* ہے (۳۲)۔ سورۃ آل عمران میں مَضْجَاعِهِمْ* (۱۵۳) سے مراد ان کی قتل گاہیں ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں قتل

کر کے لٹا دیا جائے۔ اَلْمُضْجَعَةُ سے مراد مجامعت بھی ہوتی ہے*۔ یعنی ہم بستر ہونا۔ سورۃ نساء میں جہاں وَ اَمْجُرُوْهُنَّ رَفِی الْمَضَاجِعِ آیا ہے (۳۳) تو اس سے مراد زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنا ہے۔

ض ح ک

ضَحِیْکَ - یَضْحَکُ - ضَحْکًا - خوشی کی وجہ سے چہرہ کا انقباض، اور دانتوں کا کھل جانا - ہنسنا - ضَحْکٌ (ہنسی)، کا پہلا درجہ تبسم ہوتا ہے۔ ضَحِیْکَ کے معنی تعجب کرنے یا تعجب سے ہنسنے کے بھی ہیں*۔ ضَحِیْکَ الرَّجُلُ - اس آدمی کو تعجب ہوا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے قَلْبٌ ضَحِیْکُوْا قَلْبًا (۸۴) انہیں چاہئے کہ تھوڑا ہنسیں۔ تھوڑی خوشیاں منائیں۔ اس کے مقابل وَ لَیْسَ یُکُوْا کَثِیْرًا (۸۴) ہے۔ یعنی بہت زیادہ روئیں۔ ضَاحِکًا (۲۶) خوش ہو کر۔ سورۃ تطفیف میں ہے کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳)۔ وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے۔ اَمْرًا ضَاحِکًا - وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو**۔ سورۃ عود میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر رسیدہ بیوی کو لڑکے کی بشارت ملی فَضَحِیْکَتْ (۱۱)۔ بعض نے اس کے معنی یہ کہے ہیں کہ انہیں حیض جاری ہو گیا* اور اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں ہنوز اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ جس مفسر نے ضَحِیْکَتْ کے معنی حاضت (حائضہ ہو گئی) کہے ہیں تو یہ اس لفظ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی حالت کا بیان مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی از رہ تعجب ہنسی تھیں، جس کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ اَتَعْجَبِیْنِ مِیْنِ اَمْرِ اللّٰهِ*** (۱۱)۔ ان لوگوں کا حیض کی طرف (غالباً) اس لئے خیال کیا ہے کہ انہی حالات میں جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو وہاں آیا ہے وَ اٰمَلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ (۲۱)۔ ہم نے اس کے لئے اسکی بیوی کو درست کر دیا۔ جو نقص تھا اسے رفع کر دیا۔ اور بیشتر یہ نقص حیض کا رک جانا ہی ہوتا ہے، اس لئے ایسے مواقع پر جو لفظ بھی آیا اس سے مفہوم حیض جاری ہونا لے لیا گیا۔ یہ صحیح نہیں۔

ض ح و (ی)

الضَّحْوُ - الضَّحْوَةُ - الضَّحِيَّةُ - الضَّحَى - دن چڑھے کا وقت ، طلوع آفتاب کے بعد کا وقت - بعض کا قول ہے کہ الضَّحَى طلوع آفتاب سے لیکر دن چڑھنے تک کے وقفہ کو کہتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ الضَّحَى دھوپ کے پھیل جانے اور دن کے چڑھ جانے کو کہتے ہیں * - نیز اس وقت کو بھی ضحیٰ کہتے ہیں - الضَّحَاءُ - نصف النہار سے پہلے پہلے کا وقت - یا جب سورج طلوع کے بعد ربع سماء ہر ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی دن چڑھے کا وقت ہیں جب دھوپ کھل جائے اور ہر چیز واضح ہو جائے - وَ أَخْرَجَ ضُحُلَهَا (۱۱۹) - ”اور اس کی روشنی نکالی“ - دن کو روشن کیا - ضَحِيٌّ - دھوپ لگنا ، دھوپ کے سامنے آنا ، دھوپ سے تکلیف اٹھانا - وَ لَا تَضْحَكِي (۱۱۹) - ”نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائیگا“ - فَعَلَهُ ضَاحِيَّةٌ - اس نے اسے کھلم کھلا کیا - ضَحَا الطَّيْرُ يَتَّقُ ضَحْوًا - استہ واضح اور ظاہر ہو گیا * -

لَيْلَةٌ ضَحِيَّةٌ - روشن رات جس میں ہادل نہ ہوں یا جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر اور واضح ہونے کے ہیں -

ض د د

الضَّيْدُ - ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے برعکس ہو - یعنی جو دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکیں - جیسے سیاہی اور سفیدی - موت اور حیات - بعض کے نزدیک ضیْدٌ ایک دوسرے کی ٹکر کی چیزوں کو بھی کہتے ہیں - الضَّيْدُ - مخالف - الْقَتْلُ - عَلَيْهِ ضَيْدٌ وَ أَحِيدٌ - لوگ اس کے خلاف متفق ہو کر جمع ہو گئے - هُمَا مُتَضَادَّانِ - وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں ** -

سورة مریم میں ہے وَ يَسْكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضَيْدًا (۱۹) - وہ ان کے مخالف ہونگے -

ض ر ب

ضَرْبٌ کے بہت سے معانی آتے ہیں جن میں سے مشہور معنی مارنے کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں - اسی اعتبار

* تاج - ** تاج و محیط و راغب -

سے **الضَّرْبُ** اور **الضَّرِبُ**۔ مثل اور مشابہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں ایک بات دوسری بات کے قالب میں ڈھالی جاتی ہے۔ و **أَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلًا** (۳۶) کے معنی ہیں انکے لئے ایک مثال بیان کرو۔ یعنی اس بات کو مثال دیکر واضح کرو۔ اور **يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ** (۱۳) کے معنی بھی یہی ہیں۔ یعنی خدا حق اور باطل کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی باہمی ٹکرانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ **ضَرَبَ الطَّيْرُ**۔ پرند تلاش رزق میں کہیں چلے گئے۔ **ضَرَبَ فِي الْأَرْضِ**۔ اُس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص تلاش معاش میں سفر پر چلا جائے۔ **أَضْرَبَ الرَّجُلُ فِي الْبَيْتِ** کے معنی ہیں اس شخص نے گھر میں قیام کیا۔ **ضَرَبَ عَنِ الشَّيْءِ** کے معنی ہیں وہ اس شے سے باز رہا۔ اعراض کیا۔ یہی **أَضْرَبَ عَنْهُ** کے معنی بھی ہیں، نیز **ضَرَبَ عَنْهُ الذِّكْرُ** و **أَضْرَبَ عَنْهُ** کے، یعنی اس سے ذکر کو پھیر دیا، ہٹا دیا، روک دیا۔ (اسی سے جدید لغت میں **أَضْرَبَ** کے معنی ہیں اسٹرائک کرنا) **ضَرَبْنَا عَلَىٰ أَذَانِهِمْ**۔ ہم نے انہیں آواز سننے سے روک دیا۔ **ضَرَبَ إِلَيْهِ**۔ وہ اسکی طرف مائل ہوا۔ **أَضْطَرَبَ** کے معنی ہیں کسی چیز کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ کے ساتھ ٹکرانا۔ نیز اسکے معنی کمانے اور حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ **أَضْطَرَبَ أَمْرُهُ** کے معنی ہیں اس کا کام خراب ہو گیا۔ * **مَضْطَرَبٌ**۔ متحرک کو کہتے ہیں *۔ سورۃ انفال میں ہے **فَتَضَرَبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ** (۸)۔ اسکے معنی مارنے کے ہیں، اور **ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الْيَذْلَقَةُ** و **الْمَسْكَنَةُ** (۶۱) کے معنی ذلت و خواری کی مار مارنے کے ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے **إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ** (۱۱)۔ اسکے معنی سفر کرنے کے ہیں۔ سورۃ نحل میں ہے **وَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ** (۱۱)۔ اللہ کی مثل اور مانند کسی کو قرار نہ دو۔ اس کی ذات کے متعلق اپنے ذہن میں تصورات پیدا نہ کرو کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے۔

ضَرَبَ عَنْهُ۔ روک لینا۔ بند کرنا۔ **أَقْتَضَرَبَ عَنْكُمُ الذِّكْرَ** (۲۳)۔ کیا ہم اس ضابطہ ہدایت کو تم سے روک لینگے؟ کیا ہم قرآن کریم کے قوانین (مکافات عمل) کو تم پر لاگو (نافذ) نہیں کریں گے اور تمہیں کھلی چھٹی دیدہ بنگے کہ تم جو بی میں آئے، کرتے رہو اور جس روش پر جی چاہے چلتے رہو! ایسا نہیں ہوگا۔

ضَرَبَ مَثَلًا کے معنی ہیں مثال کے ذریعہ بات کو واضح کرنا۔ لیکن بعض مقامات پر صرف ضَرَبَ کے بھی یہی معنی آتے ہیں۔ مثلاً کَذَّالِیکَ یَضْرِبُ اللہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳)۔ اس طرح اللہ حق و باطل کی وضاحت کرتا ہے۔ یا بات کو سمجھاتا ہے۔ اگرچہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) اس کے معنی حق و باطل کی کشمکش کے بھی ہیں۔ اسی طرح سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَبَ بُوہُ لَکَ إِلَّا جَدَلًا (۲۳)۔ یہ لوگ تجھے بات نہیں سمجھاتے (مثال پیش نہیں کرتے) بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں۔ اسی سے (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ) سورۃ نساء میں جو عورتوں کے متعلق ہے کہ وَأَضْرِبْ بُوہُنَّ (۴) تو اس کے معنی ہیں مختلف طریقوں سے مثالیں دیکر انہیں سمجھاؤ۔ یعنی وَأَضْرِبْ بُوہُنَّ مَثَلًا۔ لیکن یہ معنی اس لئے کمزور ہیں کہ سمجھانے کے لئے اس سے پہلے فَعِظُوہُنَّ آچکا ہے۔ لہذا فَاضْرِبْ بُوہُنَّ سے مراد وہ بدنی سزا (Corporal Punishment) ہے جو عدالت کی طرف سے بعض جرائم کی سزا میں دی جاتی ہے۔ عورتوں کا بلا عذر اپنے فطری وظائف زندگی (اولاد پیدا کرنے) سے سرکشی برتنا اور مرد بننے کی خواہش کرنا (جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے) ایک معاشرتی جرم ہے جس کا بذریعہ عدالت روکا جانا ضروری ہے۔

سورۃ طہ میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے فَاضْرِبْ لَہُمْ طَرِیقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲)۔ انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جا۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اَضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۱)۔ (نیز ۲۴)۔ اپنی جماعت (عصا) دیکھئے عنوان ع۔ ص۔ و) کو سمندر سے ہار لے جا۔ یا، تو عصا ٹیکتا ہوا پایاب چلے جا۔ اسی طرح دوسری جگہ ہے اَضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۱) جس کے معنی یہ تو یہ ہیں کہ اپنی جماعت کو پہاڑ کی طرف لے جا۔ وہاں انہیں پانی کے چشمے مل جائیں گے۔ اور یہ کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار، اس سے مٹی اور پتھر وغیرہ میں شکاف ہو جائیگا اور اندر کا پانی باہر نکل آئیگا۔

ض ر ر

ضَرَّ - یَضُرُّ - نقصان پہنچانا - الضَّرُّ - الضَّرُّ - نقصان - الضَّرُّ - عام طور پر مالی نقصان یا خارجی مصیبت کو کہتے ہیں اور الضَّرُّ - اس مصیبت یا بد حالی کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہو - الضَّرُّ - قحط - نقصان کی شدت - بد حالی - الضَّرُّ - لاغری - معذوری - الضَّرُّاء - معذور ہونا۔

لنگڑا ہونا۔ نیز اس کے معنی تنگی۔ سختی۔ بد حالی کے بھی ہیں۔ الضَّرَرُ یُتْرُ۔
ناہینا۔ مریض۔ لاغر۔ مصیبت زدہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الضَّرَرُ یُتْرُ۔
قوت نفس اور صبر کو کہتے ہیں۔

الضَّرَرُ۔ تنگی۔ الضَّرَرُ وَرَّةٌ۔ حاجت۔ اَلْضَّرَرُ شِدَّةٌ۔ شدت
احتیاج سے مجبور ہونا*۔ الضَّرَرُ تَانٌ۔ چکی کے دونوں ہاٹ۔ ایک مرد
کی دو بیویاں*۔ اَلْضَّرَرُ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی (یعنی
اس کی سوت) لانا۔ تَزَوَّجْتُ النِّسَاءَ عَتَلْتُ خَيْرٌ۔ میں نے اس عورت
سے پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود عربوں کو
بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مضرت رسائی کا احساس تھا۔

الْمُضِيرُ۔ قریب ہونے والا*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ نَفْعٌ کے مقابلہ میں (۲/۲۰۲) میں آیا ہے۔ خَيْرٌ
کے مقابلہ میں (۱/۲) میں اور نِعْمَتٌ کے مقابلہ میں (۱۱/۱۱) میں۔ جسمانی
تکلیف کے لئے (۸/۸) میں۔ اُضْطَرُّ (۲/۲۰۲) میں۔ جس کے معنی اضطراری حالت میں
پہنچنے کے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَلَا يُمْضِرُّكَ كَاتِبٌ* (۲/۸۲)۔ کاتب
کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ (اس باب کا خاصہ ایک دوسرے
کو نقصان پہنچانے کا ہے۔ اس لئے اس سے مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ
تم میں سے کوئی اس کاتب (اور گواہ) کو تکلیف پہنچائے اور نہ ہی وہ کاتب
(اور گواہ) تمہارے لئے کسی تکلیف کا باعث بنیں)۔ سورۃ نساء میں ہے غَيْرُ
أُولَى الضَّرَرِ (۴/۵) جنہیں کوئی جسمانی تکلیف (بیماری) نہ ہو۔ سورۃ
توبہ میں ضِرَارٌ آیا ہے (۹/۱)۔ یعنی باہم نقصان پہنچانے کی خاطر۔ یہ
نقصان اجتماعی ہے۔ سورۃ نساء میں ہے غَيْرُ مُضَارٍّ (۴/۲) جو ایک
دوسرے کو تکلیف پہنچانے والا نہ ہو۔

سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ اُضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ (۲/۲۴) میں
انہیں بسے بس کر کے جہنم کے عذاب کی طرف لیجاؤں گا۔ دوسری جگہ ہے فَمَنْ
اُضْطَرُّ (۲/۲۴)۔ جو مجبور ہو جائے۔ مُضْطَرٌّ (۲/۲۴) ہے بس مجبور۔

ض ر ع

الضَّرَرُ ع۔ گئے بکری وغیرہ کا تھن۔ (اونٹنی کے تھن کو خِلْفٌ
کہتے ہیں)**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نرمی کے ہیں

* تاج و محیط۔ ** تاج

اور تھن کو ضَرْعٌ اس کی نرمی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ضَرْعُ النَّبْتِہُمْ کے معنی ہیں چوپاؤں کے بچوں نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لیے لیا۔** اس سے تَضَرَّعَ إِلَى اللّٰہِ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی اپنی نشوونما کے لئے ربوبیت کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا۔ اُدْعُوا رَبَّکُمْ تَضَرَّعًا وَخُفَّیَّةً (۵۵)۔ یعنی اپنی نشوونما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرو (اس کی مزید تشریح کے لئے ع۔ و۔ ذ کے عنوان میں تَعَوَّذَ بھی دیکھئے)۔ اس سے آگے ہے اِنَّہٗ لَا یُحِیْبُ الْمُتَعَذِّرِیْنَ (۵۵)۔ وہ حدود فراموش کرنے والے سرکشوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تَضَرَّعًا کے اندر اطاعت خداوندی کا بنیادی تصور شامل ہے۔ سورہ انعام میں ہے لَوْ لَا اِذْ جَاءَہُمْ بَنَاتُنَا تَضَرَّعُوْا (۶۶) جب ان پر (ان کے اعمال کی وجہ سے) ہمارے قانون مکافات کے مطابق سختی آئی تو انہوں نے اس وقت ہمارے قانون کی اطاعت کیوں نہ اختیار کر لی۔

الضَّرِیْعُ۔ حجاز میں کانٹوں والا پودا ہوتا ہے۔ چوپائے اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ اگر اسے کھا لیتے ہیں تو اس سے کمزور ہو جاتے ہیں۔ یا ایک قسم کی بد بودار گھاس کو کہتے ہیں جو ٹھہرے ہوئے پانی میں پیدا ہوتی ہے اور مویشی اسے نہیں کھاتے*۔ بعض اوقات سمندر اس قسم کے گھاس کو باہر پھینک دیتا ہے اور جو مویشی اسے کھاتا ہے وہ لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے۔** سورہ غاشیہ میں اہل جہنم کی غذا کو ضَرِیْعٌ کہا گیا ہے (۸۸)۔ یعنی دوسروں کے ردی سمجھ کر پھینکے ہوئے ٹکڑے جن سے نشوونما ہونے کی بجائے انسانی صلاحیتیں اور بھی ہڑمردہ ہو جاتیں۔ محکوم اور کمزور اقوام کو اسی طرح کی غذا ملتی ہے۔ (نشوونما رک جانے کے اعتبار سے لفظ جَحِیْمٌ عنوان ج۔ ح۔ م میں دیکھئے)۔

کمزوری اور لاغری کے اعتبار سے الضَّارِعُ وَالضَّرْعُ۔ ہر نحیف اور کمزور چیز کو کہتے ہیں*۔ ضَرِعَ لَہٗ وَضَرَعَ۔ اس سے کچھ مانگا اور مانگنے کے ساتھ اپنے عجز و تذلل کا اظہار کیا۔ الضَّرْعُ۔ لاغری ہونا۔ مَثَلُہٗ زَرْعٌ وَلَا ضَرْعٌ۔ اس کے پاس کچھ نہیں*۔ اَضْرَعُ لِفُلَانٍ مَّالًا کے معنی ہیں اس کے لئے مال خرچ کیا***۔

بہر حال، انسان کا خدا کی طرف تَضَرَّعًا جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی نشوونما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرے اور

دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے قوانین کی اطاعت کرے۔ اگر ایسا نہ کریگا تو اسے ضررِ بے حد پہنچے گا۔ یعنی وہ ذلت کی روٹی جس سے شرفِ انسانیت کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں۔

ض ع ف

الضَّعِيفُ - الضَّعِيفُ - الضَّعِيفُ - کمزوری* - صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ ضَعِيفٌ - رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضَعِيفٌ - بدن کی کمزوری کو** - سورة الروم میں قِسْوَةٌ کے مقابلہ میں ضَعِيفٌ آیا ہے (۳۸) - اور سورة انفال میں فوجی کمزوری کے لئے ضَعِيفٌ (۹۶) - سورة ابراهيم میں مُسْتَضْعِفٌ - یمن کے مقابلہ میں ضَعِيفٌ آیا ہے (۲۶) - ضَعِيفٌ (جس کا واحد ضَعِيفٌ ہے) - کمزور (۹۶) - ضَعِيفٌ (جمع ضَعِيفٌ اور ضَعِيفٌ) کمزور (۲۸) اس مقام پر یہ لفظ جذبات سے مغلوب ہو جانے کے معنوں میں آیا ہے - اِسْتَضْعِفَهُ - اسے کمزور سمجھا - حقیر جانا - (۱۵) - مُسْتَضْعِفٌ - جسے کمزور سمجھا جانے (۲) - ظاہر ہے جسے کمزور خیال کیا جاتا ہے اس کے حقوق بھی شصت کٹے جاتے ہیں اور اس کی کمزوری سے ناجائز فائدے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کو دگنا کر دینا۔ اس اعتبار سے ضَعِيفٌ (جمع اَضْعَافٌ) کے معنی ہیں کسی چیز کے مانند اور اس کا مثل۔ برابر کا حصہ - اتنا ہی اور - اس طرح دگنا ہو جانا - لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف دگنا نہیں بلکہ دگنے سے زیادہ تگنا چوگنا - نیز غیر محدود طور پر زیادہ ہونے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے* - چنانچہ سورة بقرہ میں ہے فَبِضْعِيفَةٍ لَّهُ اَضْعَافًا كَثِيرَةً (۲۵) - اس کے معنی کئی گنا ہیں - سورة اعراف میں ضَعِيفٌ دگنے کے معنوں میں آیا ہے (۳۸) - ضَعِيفَتَيْنِ - دو چند (۲۵) -

سورة آل عمران میں ہے - لَا تَتَّكِلُوا الرُّبُوبَ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۳۹) - اس کے عام معنی کٹے جاتے ہیں بڑھا بڑھا کر سود (در سود) نہ کھاؤ - لیکن راعب کا کہنا ہے کہ مُضَاعَفَةً در اصل ضَعِيفٌ سے ہے - ضَعِيفٌ سے نہیں - اس لئے آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربُّو، جسے تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے روپیے کو بڑھانا ہے - بڑھانا نہیں بلکہ در حقیقت ضَعِيفٌ (یعنی) کم کرنا ہے*** - سود سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار

کی انسانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ رہنمائی سے قومی دولت گھٹتی ہے اور کمزوریوں پر کمزوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ض غ ث

ضَعَفَتْ الْحَدِيثُ - بات کو خلط ملط کر دینا۔ مجازاً الضَعْفُ کسی چیز کے اجزاء کے باہم گر ملتبس اور گڈمڈ ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اصل میں ضَعَفَتْ التَّسْنِيمُ - اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کے متعلق واضح نہ ہو کہ وہ کمزور ہے یا موٹی اور اس کے کوہان کو مٹھی بھر کر دیکھا جائے کہ اس میں چربی ہے یا نہیں۔ اس لئے، غیر واضح اور ملتبس بات کو کَلَامٌ ضَعِيفٌ کہتے ہیں*۔ (جمع أَضْعَافٌ)۔ قرآن کریم میں أَضْعَافٌ أَحْلَامٌ (۱۲/۳۴) آیا ہے۔ یعنی ایسے خواب جن کا مطلب واضح نہ ہو۔ پریشان خواب۔ ضِعْفٌ - اتنی گھاس، گدستہ یا شاخیں جو آدمی کی مٹھی میں آجائیں۔ مٹھی بھر چیز*۔ سورۃ ص میں حضرت ایوبؑ کے تذکرہ میں ہے خُذْ بِيَدِكَ كِتَابَ ضِعْفَيْنِ (۳۸/۳۸) مٹھی بھر گھاس لے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الضِعْفُ تنکوں یا شاخوں کے مٹھے کو کہتے ہیں۔ طب قدیم میں، (اور آجکل بھی) کئی جسمانی تکالیف کا علاج جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پتوں سے کیا جاتا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی تھوڑی سی متاع دنیوی بھی ہے۔ یونہی مٹھی بھر۔

ض غ ن

أَلْيَضَعْنُ - شدید کینہ۔ سخت عداوت۔ انتہائی بغض۔ ضَعْنٌ عَلَيْنَا - اس نے اس سے شدید بغض رکھا۔ سخت کینہ رکھا۔ فَرَسٌ ضَاغِنٌ - اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بغیر سار کھائے اپنی چال ہی نہ نکالے۔ اضْطَغْنَتْ - اس نے اس چیز کو بغل کے نیچے دبا لیا۔ یا گود میں لے لیا*۔ قرآن کریم میں ہے يُخَيِّرُ جَآلِلُ اللّٰهِ أَضْعَافَهُمْ (۳۹/۳۹)۔ اللہ ان کے کینوں کو باہر نکالے گا۔ یا جو کچھ بغل کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اُسے باہر نکالے گا۔ یعنی ان کی مخالفانہ سازشیں اور پوشیدہ ارادے طشت از ہام کردیگا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کچی یا ٹیڑھ پن کے ساتھ کسی چیز کو ڈھانپ دینا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قَنَآةٌ ضَعِيفَةٌ - ٹیڑھے نیزے کو کہتے ہیں۔ ٹیڑھ پن اور ڈھانپے ہوئے (مستور) ہونے کی جہت سے أَلْيَضَعْنُ - کینہ اور عداوت کو کہتے ہیں۔

* تاج - راغب - محیط - * أَلْيَضَعْنُ کے معنی گود اور اونٹ کی بغل کے بھی ہیں۔ نیز طوق اور میلان کے بھی۔
لہ ۳۴/۴۴ میں یُخَيِّرُ جَآلِلُ اللّٰهِ أَضْعَافَهُمْ ہے۔

ض ف د ع

الْيَضْفَعُ ع* - الْضَفْعُ ع* - (جمع ضَفَاعٌ ع* - ضَفْعٌ ع* - مینڈکی * -

ض ل ل

الضَّلَالَةُ* - حیرت - متحیر ہونا - سرگردان پھرنا - (Perplexed; Confused)

کسی چیز کا ہوشیہ اور غائب ہونا، مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جاسکے۔ مثلاً ضَلَّ السَّمَاءُ فِي اللَّيْلِ - پہاڑی دودھ میں گھل مل کر غائب ہو گیا۔ دلیل نہ سوجھنے، نیز کسی بات کے بھول جانے اور حافظہ سے گم ہو جانے کے لئے بھی یہ فعل بولا جاتا ہے **۔ ضَلَّالَةٌ* - سیدھی راہ سے ہٹ جانا - (عمداً ہو یا سہواً - تھوڑا ہو یا بہت)۔ چونکہ صحرا میں راستہ کھو جانے والا اپنی تمام تکی و دو کے باوجود منزل کے قریب نہیں ہونے پاتا اس لئے کوشش کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضَلَّ سَعْيُهُ* کہتے ہیں۔ اور چونکہ ریگستان میں اس طرح پھرنے کا نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوتا ہے اس لئے اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے ***۔ نیز ضائع ہونا - رائیگاں جانا - مثلاً ذَهَبَ دَمُهُ ضِلَالَةً* - اسکا خون یونہی رائیگاں گیا۔ کیونکہ اسکا قصاص یا انتقام نہیں لیا جاسکا* - ضَلَّ النَّبِيُّ فُلَانٌ* - وہ میرے ساتھ سے نکل گیا اور میں اس پر قادر نہ رہا* - الضَّلَالُ* - وہ پہاڑی جسو کسی چٹان یا درختوں کے نیچے بہ رہا ہو اور اس پر دھوپ نہ پڑے۔ اَلْمُضِلُّ* - اَلْمُضِلُّ* - سراب جسو ریگستان میں پہاڑی کی طرح دکھائی دیتا ہے*۔

جب رسول اللہؐ نبوت سے پہلے تلاش حقیقت میں حیران و سرگردان پھرتے تھے تو قرآن حکریم نے اس کیفیت کو وَتَجَدَّكَ ضَالًّا (۲۳) سے تعبیر کیا ہے۔ ایک ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے بھی، غلط تصورات زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے وہ ان کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے۔

سورة بقرہ میں ضَلَّالَةٌ* - ہُدًى کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۶) - اس نے "راہ گم کردن" کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ سورة ابراہیم میں کوششوں کے ناکام اور اعمال کے بے نتیجہ رہ جانے کو ضَلَّالٌ* سے تعبیر

* تاج - ** ناج نیز ابن قتیبہ - القرطبی ج/۱ صفحہ ۵ *** لین -

کیا گیا ہے (۱۴۰)۔ سورۃ کہف میں ضَلَّ سَعْيُهُمْ (۱۰۸) سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ سورۃ ابراہیم میں اسے ثَبَات کے مقابل میں لا کسر بتایا گیا ہے کہ اس کے معنی ہلاکت و بربادی ہیں (۱۴۰)۔ سورۃ حجر میں ضَلَّالَت کا نتیجہ نعمائے خداوندی سے محرومی و مایوسی بتایا گیا ہے (۱۵۰)۔ سورۃ اعراف میں ضَلُّوا عَنَّا (۲۰۵) کے معنی ہیں وہ ہم سے جاتے رہے با غائب ہو گئے۔ اور سورۃ السجدہ میں جہاں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ عَاذًا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (۲۰۵) تو اس کے معنی ہیں کہ کیا جب ہم مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے (ختم ہو جائیں گے)؟۔ تَضَلَّيْلٌ۔ ضائع کر دینا۔ ناکام بنا دینا، بھٹکا دینا اور غلط راہ پر لگا دینا (۱۴۰)۔ لہذا ضَالِّیْن (۱۴۰) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو وحی کی راہ نمائی کے بجائے اپنے ذہنی قیاسات کی تجربہ گاہوں یا توہم پرستانہ عقیدہ تمندیوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح مارے مارے پھرتے ہیں جس طرح لق و دق صحرا میں ایک راہ گم کردہ مسافر حیران و پریشان پھرتا ہے۔ وہ دن بھر چلتا رہتا ہے لیکن شام کے وقت اس کی منزل اس سے اور دور ہو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح اس کی تمام کوششیں رائگاں چلی جاتی ہیں اور وہ انجام کار ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں منعم علیہ ہیں (۱۴۰) جن کی کیفیت ان لوگوں کے برعکس ہوتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے (۲۸۲) کہ لین دین کے معاملہ میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ دو عورتیں اس لئے کہ اَنْ تَضِلَّ اَحَدَاهُمَا فَتُذَكِّرَا لِحُدُوهُمَا (۲۸۲)۔ اگر ان میں سے ایک کسی تفصیل میں (Confused) ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ وہ اُس بات کو سامنے لے آئے۔ اس سے حافظہ کی کمزوری (بھول جانا) مراد نہیں بلکہ (عورت کے زیادہ جذباتی اور حیا دار ہونے کی وجہ سے) گھبراہٹ میں (Confused) ہو جانا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآن حکیم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (۱۸)۔ وہ جھگڑے (منازعہ فیہ معاملہ) میں واضح طور پر مافی الضمیر کر بیان کرنے والی نہیں ہوتی ہے۔ جھگڑے میں جذبات کی شدت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے معاملہ (Case) کو بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی۔ واضح رہے کہ لطیف جذبات کی زیادتی عورت کے فطری وظائف زندگی (اولاد کی پرورش) کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے یہ عورت کا نقص نہیں۔ البتہ مناسب تعلیم و تربیت سے اس کے یہ جذبات بھی باقی رہتے ہیں اور وہ فصیح البیان بھی ہو سکتی ہے (۱۸)۔ دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ ب)

ضم م ر

الضَّمْرُ - لاغر ہونا - پیٹ کا کمر کے ساتھ لگ جانا۔
 ضَمَرَ الْفَرَسُ - گھوڑے کا لاغر ہونا اور اسکے پیٹ کا کمر سے لگنا۔ قَضِيْبٌ -
 ضَامِرٌ - مرجھائی ہوئی شاخ جسکی ترو تازگی جاتی رہی ہو*۔ قرآنِ کریم
 میں ہے عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ (۲۲)۔ پتلی دہلی سواروں پر۔ راغب نے کہا ہے
 کہ الضَّامِرُ مِّنَ الْفَرَسِ۔ اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جسکا
 دہلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اسے سدھانے کے لئے جو مشقت کرائی
 جاتی ہے اس کی وجہ سے ہو**۔

الضَّمِيرُ - مرجھایا ہوا انگور۔ ہر وہ بات جیسے تم اپنے دل میں
 چھپاؤ۔ اَضْمَرَهُ - اس نے اسے چھپا لیا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس
 کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) پتلا پن اور باریک ہونا اور (۲) کسی چیز کا
 چھپ جانا۔

ضم م م

الضَّمُّ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ اِضْطَمَّ الشَّيْءُ -
 کسی چیز کو اپنے لیے اکھٹا کیا۔ ضَمَمْتُهُ اِلٰی صَدْرِي - میں نے اسے
 اپنے گلے سے لگایا*۔ ضَمَّ عَلِيٌّ الْمَالَ - اس نے مارے مال پر قبضہ کر لیا**۔
 ضَمَّ جَنَاحَكَ عَنِ النَّيَاسِ - لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور
 اپنا پہلو، ان کے لئے نرم رکھو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی
 معنی دو چیزوں میں موافقت اور مناسبت کے ہیں۔

سورة طہ میں ہے وَاَضْمَمُ يَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْشُرُجُ
 بَيْضَاءَ مِّنْ غَيْرِ سُوْعٍ (۲۴)۔ اور سورة القصص میں ہے اُسْلُكْ
 يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْشُرُجُ بَيْضَاءَ مِّنْ غَيْرِ سُوْعٍ وَاَضْمَمُ
 اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِّنَ الشَّرِّ (۲۸)۔ [”یَدٌ بَيْضَاءٌ“ کے مفہوم
 کیلئے عنوان ی۔ د۔ ی دیکھئے۔ نیز ۸۳۸؛ ۲۷۸۔ اور جَنَاحٌ کیلئے
 دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ح] (۲۸) کا مفہوم یہ ہے کہ خوف کی حالت
 میں مضطرب و متردد مت ہو (پھڑ پھڑاؤ نہمیں) بلکہ اسطرح
 اطمینان سے رہو جسطرح پرندہ حالت امن میں اپنے بازو سمیٹ کر بیٹھتا ہے۔
 اور (۲۴) کا مجازی مفہوم بھی یہ ہے کہ اس آنے والے معرکہ میں ضبط و تحمل

سے کام لو۔ پریشان مت ہو۔ اور بشارتیں دینے والے درخشندہ اصول زندگی کو (جو وحی کے ذریعے تمہیں دیئے گئے ہیں) پیش کرتے جاؤ۔ تم ہر مشکل و مصیبت سے محفوظ باہر نکل آؤ گے۔ دشمن کا شر تمہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیگا۔ ویسے، آیت (۲۳۸) کے لفظی معنی یہ ہیں۔ ”تم اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ بغیر کسی خرابی کے سفید نکل آئے گا۔ اور تم خوف سے اپنے بازؤں کو سمٹائے رکھو“۔

ض ن ک

الضَّنْكَ۔ تنگ (جو کشادہ نہ ہو)۔ الضَّنْكَ۔ وہ شخص جو جسم، عقل، رائے وغیرہ میں کمزور ہو۔ وہ خدام جو محض روٹی کے معاوضہ میں کام کرتا ہو۔ رَجُلٌ مُتَضَنِّكٌ*۔ لاغر آدمی*۔

قرآن کریم میں ہے جو شخص (یا قوم) قوانین خداوندی سے اعراض برتیگی۔ فَانْ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۱۲۷) ان کی معیشت تنگ ہو جائیگی۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کی معیشت تنگ ہے (اور مسلمانوں کا نمبر ان میں اس وقت سب سے آگے ہے) وہ قوانین خداوندی سے اعراض برت رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا محسوس اور واضح معیار ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ض ن ن

ضَنَّ بِالْشَّيْءِ۔ بضن کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا۔ الضَّنَّيْنِ*۔ وہ بخیل آدمی جو نفیس چیزوں کے ساتھ بخل کرے۔ اَلِضَّنَّيْنِ*۔ نفیس شے جسکے ساتھ بخل کیا جائے**۔ جسے بچا کر رکھا جائے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۲۲)۔ اے خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اس کے عام کرنے میں بخل نہیں برتتا۔ وہ اے ہر اس شخص کو دیتا ہے جو لینا چاہے۔

ض ہ ی (ا)

الضَّهْيَاءُ*۔ وہ عورت جسے نہ حیض آتا ہو نہ بچے پیدا ہوتے ہوں۔ یا جس کی چھاتیوں میں ابھار نہ ہو اور اس طرح وہ مردوں سے مشابہ ہو۔ اسی

سے ضَاہَاہُ مَضَاہَاہُ - وَضَاہَاہُہ - مَضَاہَاہُتَہ کے معنی ہیں وہ اس کے مشابہ اور ہم شکل ہوا۔ هُوَ ضَهِيْشٌ - وہ تیرا ہم شکل اور تجھ سے مشابہ ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے مشابہ ہونا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے بِضَاہِیْہُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اٰمِنْ قَبْلُ (۹/۳۹)۔ یہ انہی جیسی بات کرتے ہیں (انہی کے ہم رنگ بنتے ہیں) جنہوں نے ان سے پہلے کفر کی روش اختیار کی تھی۔ یہ سب ہم رنگ ہیں۔ بعض لوگوں نے اسے ناقص یا ناقص مانا ہے اور بعض نے مہموز*۔ چنانچہ لین نے اسے ضہی اور ضہیا دونوں عنوانوں کے تحت لکھا ہے۔ راغب نے اسکی اصل حمزہ بھی بتائی ہے۔

ض و ا

ضَوُّہُ یا ضَوْہُ - نور اور روشنی کو کہتے ہیں۔ (جیسا کہ ن - و - ر کے عنوان میں بھی بتایا گیا ہے)۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ضَوُّہُ کا لفظ نُورٌ سے زیادہ شدت اور قوت رکھتا ہے۔ نیز ضَوُّہُ کسی کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُورٌ اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ہو**۔ غالباً اسی جہت سے شَمْسٌ کو ضِیَاءٌ اور قَمَرٌ کو نُورٌ کہا گیا ہے (۱/۵)۔ کیونکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، سورج سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تَوْرَاتٌ کو نُورٌ کہا گیا ہے (۲۴/۳۴) اور دوسری جگہ اسے ضِیَاءٌ کہا گیا ہے (۲۱/۲۸)۔

أَضَاءَ کے معنی روشن کرنا ہیں۔ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَآحِلُہُ (۲/۲۷)۔ ”جب اس نے اس کے گرد و پیش کو روشن کر دیا“۔ نیز اس کے معنی روشن ہونے کے بھی ہیں۔ یٰۤاَکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْیُ (۲۴/۳۵)۔ ”قریب ہے اس کا تیل کہ وہ روشن ہو جائے“۔

ض و ز (ضیر)

ضَارَ فُلَانًا حَقَّقَہُ - اس نے اسکا حق کم کر دیا۔ قِیْسَمَہُ ضِیْرَی - وہ ظالمانہ تقسیم جس میں کسی کو نقصان میں رکھا جائے۔ وہ تقسیم جو عدل پر مبنی نہ ہو۔ أَلْضَوَّازَہُ - مسواک کے اس ریشہ کو کہتے ہیں جو دانتوں

میں رہ جائے۔* (گویا اتنی سی کمی بھی ظلم ہو جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کجی اور (۲) کمی اور نقصان کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے تِلْكَ اِذْ اَقْسَمْتُمْۙ ذِيْزِيْلٰی (۲۳)۔ یہ تقسیم تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہوئی۔

ض ی ر

الضَّيْرُ - مضرت - گزند، ضَارَهُ، وَضَّرَهُ کے ایک ہی معنی ہیں۔
یعنی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا ضَيْرَ - (۲۱)
- کچھ ہرج نہیں - قطعاً کوئی تکلیف یا مضرت کی بات نہیں۔

ض ی ع

ضَاعَ - يَضْيَعُ - ضَيْعًا - ہلاک اور تلف ہو جانا - ضَاعَ الشَّيْءُ - چیز بے کار چھوڑ دی گئی اور اس کی خبر گیری نہ ہوئی - ضَاعَ الْعِيَالُ - اہل و عیال کی نگرانی خبر گیری اور تربیت نہ کی گئی اور انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا گیا - تَرَكْنَاهُ يَضْيَعَةً - میں نے اسے بلا خبر گیری کے چھوڑ دیا - الضَّيَاعُ (ضَائِعٌ کی جمع ہے) وہ چیزیں جنکی خبر گیری نہ کی جائے اور وہ اس طرح ضائع ہو جائیں*** - الضَّيْعَةُ - جائداد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اگر اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا نہ رکھا جائے تو وہ مآل کار ضائع ہو جاتی ہے۔

سورة بقرہ میں ہے وَمَا كَانَ لِلّٰهِ لِيَضْيَعَ اِيْمَانُكُمْ (۲۴۳) - اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمانوں کو ویسے ہی چھوڑ دے، ان کا خیال ہی نہ رکھے اور وہ اس طرح بغیر کوئی نتیجہ مرتب کئے برباد ہو جائیں - سورة مریم میں ہے کہ انبیاء کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ (۱۶۱) - انہوں نے نظام صلوة کی کوئی پرواہ ہی نہ کی - اسے ویسے ہی چھوڑ دیا اور اپنے اپنے خیالات و مفاد کے پیچھے پڑ گئے۔

ض ی ف

الضَّيْفُ - سہماں - جمع اور واحد دونوں کے لئے آتا ہے*** - سورة ہود میں ہے لَا تَخْزُونِیْ ضَيْفِیْ (۱۸) - یہاں ضَيْفٌ جمع کے لئے آیا ہے۔

* تاج ** تاج و محیط و راغب - *** تاج و محیط

ضَاكٌ التَّيْمُ - وہ اس کی طرف مائل ہوا - جھکا - قریب ہوا - ضَيَّقْتُ -
سہمان بنانا - سہمان نوازی کرنا* -

سورۃ کہف میں ہے فَاتَّبَعُوا أَنَّهُمْ يَضْطَرُّونَ هُمْ مَتَا (۱۸/۱۸) - انہوں نے
ان کی سہمان نوازی کرنے سے انکار کر دیا - اَلْمُضْطَّافُ - جائے پناہ - جس کو کسی
کی طرف مائل کیا جائے، جھکایا جائے - نیز وہ شخص جس کو جنگ میں چاروں طرف
سے گھیر لیا گیا ہو* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی
مائل ہونے کے ہیں -

ض ی ق

ضَاقَ - يَضِيقُ* - ضَيْقًا - تنگ ہو جانا - ضَيْقٌ - تنگ کرنا -
الضَّيِّقُ وَالضَّيِّقُ - تنگی - یہ اَلشَّرْحُ کی ضد ہے - لہذا اس کا صحیح مفہوم
سمجھنے کے لئے ش - ر - ح کا عنوان دیکھئے - یہ دونوں مادے (۱۳۶) میں
ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں - ضَيْقٌ* (۱۳۶) تنگ - ضَيْقٌ* (۱۳۶) تنگی -
ضَائِقٌ* - وہ جو تنگ ہو (۱۳۶) - ان میں حزن، غم اور ملال کا مفہوم آجاتا ہے -
ضَاقَ بِيْهِمْ ذَرْعًا (۱۱/۱۱) اس نے ان کی حفاظت کے لئے اپنی طاقت کو
تنگ (کم) پایا - کوتاہ دست ہو گیا - ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَلْأَرْضُ (۱۱۸) (۱۱۸)
ان پر زمین تنگ ہو گئی - وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (۱۱۸) (۱۱۸) وہ خود
اپنے آپ سے تنگ آ گئے - سورۃ طلاق میں ہے وَلَا تَضَارُّوْهُنَّ لِيُخْضِعُوْهُنَّ
عَلَيْهِنَّ (۶۵) - انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو -

ط

طَالُوتُ

طَالُوتُ* - انہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اُن افواج کا کمانڈر مقرر کیا تھا جو جالوت کے مقابلہ کے لئے جا رہی تھیں۔ ان میں علم بھی تھا اور جسمانی توانائی بھی۔ اور یہی چیزیں ایک کمانڈر کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے اس تقرر کے خلاف بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ دولتمند نہیں۔ یعنی وہ (Aristocrat) طبقہ میں سے نہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کمانڈر کی صفات، فنونِ حرب کا علم اور توانائی ہیں، نہ کہ مال و دولت کی فراوانی۔ (۲۴۷)۔

صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے، عربی نہیں*۔ راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے۔

ط ب ع

الطَّبَّعُ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کو تمثیلاً کسی چیز کی انتہا کے لئے استعمال کرتے ہیں، یعنی جہاں پہنچ کر وہ چیز ختم ہو جائے اور پسوری ہو جائے۔ پیمانے کے لبالب بھر جانے کو طَبَّعُ کہتے ہیں۔ تَطَبَّعَ النَّهْرُ* نہر بھر گئی۔ اس اعتبار سے الطَّبَّعُ* سہر لگانے کو کہتے ہیں۔ ابواسحق نے کہا ہے کہ طَبَّعُ* اور خَتَمُ* ہم معنی ہیں۔ یعنی کسی چیز کو بند کر دینا اور ڈھانپ دینا اور اس کا یقین اور اطمینان کر لینا کہ اب اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے گی۔ مثلاً کہتے ہیں طَبَّعْتُ السِّمَكِيَّاتِ*۔ میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا اور اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آسکتی**۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ طَبَّعُ* - خَتَمُ* سے زیادہ عام ہے اور نَتَشَسُ* سے زیادہ خاص**۔ الطَّابِعُ* والَطَّابِعُ* اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے بکریوں وغیرہ کے پہلو پر داغ دیکر نشان کیا جائے۔

اَلطَّبَّاعَةُ - ڈھلائی، چھپائی کا کام۔ اَلطَّبَّاعُ - ڈھلائی کا کام کرنے والا*۔
اصل میں جب کسی چیز کو ڈھال کر یا گھڑ کر پہلی شکل دی جائے تو اسے
اَلطَّبَّعُ کہتے ہیں۔

مہر لگانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے۔ فَطَبَّعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ*
فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۱۳۳)۔ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس کا نتیجہ یہ
ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اسی کو خَتَمَ
اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ* (۲) کہا گیا ہے (دیکھئے عنوان خ۔ ت۔ م)۔ جب انسان
ضد اور ہٹ، نفرت اور تعصب کی روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی کیفیت یہ
ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کے صحیح طور پر سمجھنے اور ٹھیک نتیجہ
تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اسی کو دل و دماغ پر مہریں
لگ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ یہ انسان
کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ روش خود ہی مہر بن جاتی ہے۔
رَآنَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ* (۸۳)۔ ”ان کے اعمال ان کے
دلوں پر زنگ بن کر بیٹھ گئے“۔ وہ غلط اعمال جو برضا و رغبت اور بلا جور
واکراہ کئے جائیں (۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰) وہ زنگ بن جاتے ہیں۔

ط ب ق

اَلطَّبَقُ - عرچیز کا ڈھکنا جو اس پر فٹ آجائے۔ طَبَقَتْهُ، تَطَبَّقَتْ -
اس نے اسے ڈھانپ دیا۔ فَاتَّطَبَّقَ - پس وہ ڈھک گیا۔ اَلطَّبَقُ مِّنْ
كُلِّ شَيْءٍ - ہر وہ چیز جو کسی چیز کے برابر اور مطابق ہو۔ طَابَقَتْ
مُطَابَقَةً وَطَبَقًا - وہ اس کے موافق اور مساوی ہو گیا۔ اَلطَّبَقُ - روئے
زمین۔ تھالی یا طباق جس پر کھانا رکھا جائے۔ زمانہ کی ایک صدی یا قرن۔
حالت۔ اَلْمُطَابَقَةُ - موافق و مطابق ہونا۔ گھوڑے کا اس طرح چلنا کہ
جہاں اگلا پاؤں پڑا تھا وہیں پچھلا پاؤں پڑے۔ اُس آدمی کا چلنا جسکے
پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ اُس کے قدم بالکل برابر برابر اٹھتے ہیں۔
اَلْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ - دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مطابق بنانا
با اوپر تلے رکھنا*۔

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا (۲۴) اس کے
معنی ہیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے۔ سورۃ انشقاق میں انسان
کی ارتقائی منازل کے متعلق ہے۔ لَتَرَىٰ كَبَشْنَ طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۸۴)۔

”تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔“ تم مختلف طبقات میں سے گذرتے ہوئے اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یا خود انسانیت (Humanity) تہ در تہ اوپر کو اٹھتی چلی جائیگی۔ تاریخ انہی تہوں کے ریکارڈ کا نام ہے (نیز دیکھئے عنوان ر۔ ک۔ ب)

ط ح ی (و)

طَحْلَى - يَطْحَلَى - طَحْيًا - کسی چیز کو پھیلانا۔ بچھانا۔ نیز پھیل جانا۔ بچھ جانا۔ (لازم و متعدی) الطَّاحِي - زمین پر پھیلی ہوئی چیز۔ وہ شے جو ہر چیز کو اپنی کثرت سے ہر کر دے۔ چنانچہ مَطْلَقَةُ طَاحِيَّةٌ - بڑے پھیلاؤ والے سائبان کو کہتے ہیں۔ اور الْقَمَرُ الطَّاحِي - بلند چاند کو، جس کی روشنی پھیل رہی ہو*۔ قرآن کریم میں ہے وَالْأَرْضُ رُضٌّ وَمَا طَحَلَهَا (۱۱)۔ زمین اور وہ چیز جس نے اسے پھیلا دیا۔ یعنی وہ مختلف ادوار و مراحل جن سے گذر کر زمین کا آتشیں گولہ رہائش کے قابل ہوا۔

ط ر ح

طَرَحَ - يَطْرَحُ - طَرَحًا - پھینک دینا۔ دور کر دینا۔ آلِطَرَحُ - پھینکی ہوئی چیز (جسکی کسی کو ضرورت نہ ہو)۔ دِرْيَارٌ طَوَّارَحٌ - دور دراز شہر۔ آلِطَرَحُ - دوری۔ دور کی جگہ۔ قَوْمٌ طَرَوْحٌ - وہ کمان جو تیر کو بہت دور تک پھینکے۔ طَرَفٌ مِطْرَحٌ - دور تک دیکھنے والی نگاہ**۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل کر دو اور اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا (۱۲)۔ یا اسے کسی دور دراز ملک کی طرف نکال دو۔

ط ر د

الطَّرْدُ - کسی کو حقیر سمجھ کر دور کر دینا۔ نکال دینا۔ ہٹا دینا۔ طَرْدٌ نَتَّةٌ - مینے اسے نکال دیا۔ اَلطَّرْدُ يَدَّةٌ - وہ اونٹ جنہیں کوئی حملہ کر کے ہٹا لے جائے۔ یا چترائے ہوئے اونٹ۔ وہ شکار وغیرہ جس کا تعاقب کیا جائے۔ اَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ - بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا۔ اَسْتَطْرَدَ لَهٗ - وہ پیچھے اس لئے ہٹا کہ فریق مخالف پر پھر سے حملہ کرے لیکن ظاہر ایسا کیا گویا وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے***۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ نصاریٰ کی اصطلاح میں مذہب کی بنا پر کسی کو سزا دینے کو اَلطَّرْدُ کہتے ہیں****۔

* تاج نیز کتاب الاشتقاق - ** تاج و محیط و راغب - *** تاج و راغب - **** محیط۔

قرآن کریم میں ہے - وَلَا تَنْظُرُوا لِلْعَذَابِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ (۵۴) - جو لوگ اپنے نشوونما دینے والے کو پکارتے ہیں انہیں حقیر و ذلیل سمجھ کر اپنے سے دور نہ رکھو۔ انہی کے متعلق حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وَمَا أَنَا بِظَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۱۳) - میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نہیں نکالوں گا۔

غیر قرآنی نظام حیات میں قرب و بُعد کا معیار، دولت اور وجاہت ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں قرب و یگانگت کا معیار قلب و نگاہ کی ہم آہنگی (آئیڈیالوجی کا اشتراک) ہے۔ اس میں امیر اور غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ یہی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی۔ وہ کہتے کہ کیا ہم اس نظام میں آکر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھیں جنہیں ہم اپنے معاشرہ میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں؟ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ آپؐ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے الگ کر دیجئے، پھر ہم آئیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہاں معیار ہی کچھ اور ہے۔ میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو حقیر سمجھ کر الگ نہیں کر سکتا جن کے دل متاع ایمان سے بھرپور ہیں۔ اس نظام میں اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہاں زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین، خلوص اور حسن عمل سب سے زیادہ گراں بہا متاع ہیں۔

ط ر ف

الطَّرْفُ - آنکھ - نگاہ *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا کدارہ اور (۲) کسی عضو کا حرکت کرنا۔ دراصل یہ آنکھ جھپکنے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ الطَّرْفُ درحقیقت ہلکیں جھپکنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے دیکھنے کو بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے *۔ سورۃ النمل میں ہے - قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ (۴) - تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے - یعنی بہت جلد - سورہ شوری میں ہے يَنْظُرُونَ مِنْ طَرَفٍ خَفِيِّ (۲۵) - کنکھپوں سے دیکھنا۔ الطَّرْفُ - ہر چیز کا وہ سرا جہاں وہ ختم ہو جاتی ہو۔ آخری کنارہ *۔ قرآن کریم میں طَرَفُ النَّهَارِ (۱۱۶) اور اطْرَافُ النَّهَارِ (۲۳۱) آیا ہے۔

اطْرَافُ الْأَرْضِ - ممالک کے سردار اور اشراف *۔ الطَّرْفُ - شریف آدمی - عمدہ نسل کا گھوڑا - اعلیٰ نسب کا انسان - سردار شریف *۔

سورہ رعد میں ہے - اَوَلَمْ يَرَوْا اَنْشَاْنَا تِیۡۤیۡۤا لَا رِضًا نَّتَقَصُّهَا مِنْۢ بَرۡۤءِیۡنَ (۱۳۱) - کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح (آہستہ آہستہ) زمین (معاشی وسائل - رزق کے سرچشموں) کو ان بڑے بڑے لوگوں کے پاس سے کم کرتے جارہے ہیں جو انہیں اپنے قبضے میں لئے بیٹھے ہیں - قرآن کریم نے تیرہ سو برس ہوئے جب یہ بتا دیا تھا کہ دنیا کا وہ معاشی نظام جس میں رزق کے سرچشمے بڑے بڑے لوگوں کے قبضہ میں رہتے ہیں باقی نہیں رہے گا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی جائیں گی اور اس طرح کم ہوتی ہوتی ایک دن ان کی ذاتی ملکیت سے نکل کر معاشرہ کی تحویل میں چلی جائیں گی - اور قرآنی معاشرہ ان سے حاصل شدہ رزق کو زبویۃ عامہ کیلئے صرف کریگا۔ (۲۱/۳۳) میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے -

نیز طَرَفٌ کے معنی گروہ اور جماعت کے بھی ہیں (قاموس)۔ نیز کسی چیز کا ایک حصہ (اقرب الموارد)۔ الطَّرَفُ - منتخب چیز کو بھی کہتے ہیں*۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے - طَرَفًا مِّنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا (۳۹/۱) - ان کا ایک حصہ - یا ایک گروہ - نیز اس کے معنی کفار کے بڑے بڑے لیڈر اور منتخب افراد بھی ہو سکتے ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے)۔

ط ر ق

الطَّرْقُ - کے اصل معنی مارنے کے ہیں - ہتھوڑے سے مارنا - چٹاخ سے مارنا - الطَّرْقُ - کاہن کا اپنی کھانت کے لئے کنکریاں مارنا - اَلْمِطْرَقُ - اَلْمِطْرَقَةُ - وہ لکڑی جس سے اون کو مار مار کر دھنا جائے - نیز ہتھوڑا - الطَّرْقُ - الطَّرْقُوقُ - رات کو آنا - اَلطَّارِقُ - رات کو آنے والا - اسے طَارِقُ اس لئے کہتے ہیں کہ اسے بالخصوص دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے - راغب نے کہا ہے کہ طَارِقُ راستہ چلنے والے کو کہتے ہیں، بالخصوص اس مسافر کو جو رات کو آئے - ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ کہتے ہیں کیونکہ وہ رات میں آتا ہے*۔ قرآن کریم میں ہے وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (۸۶/۱) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے چار بنیادی معنی ہیں (۱) شام کو آنا - (۲) مارنا - (۳) کسی چیز کا ڈھیلا ہونا - اور (۴) کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ سی دینا -

الطَّرْقَةُ - کسی چیز کی طرف پہنچنے کا راستہ - طریقہ - عادت - چلن - نیز اَلطَّرِيقُ - اَلطَّرِيقَةُ جسکی جمع اَلطَّرِیْقُ آئیگی - سورہ طہ میں

ہے فَاَضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰)۔ پھر تو انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے جا۔ یہاں طریق کے معنی راستہ ہیں۔ نیز اس کے معنی قوم کے رؤساء اور معزز لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ بنیں۔ هُوَ لَا عِطْرَ يُفْتَنُ قَوْمٌ مِثْلَهُمْ وَطَرَّاقٌ قَوْمٌ مِثْلَهُمْ۔ یہ قوم کے اشراف ہیں۔ مِطْرَاقُ الشَّيْثَانِ۔ چیز کا مثل اور نمونہ *۔ سورۃ طہ میں ہے کہ سردارانِ قوم فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے متعلق کہا کہ يَذْهَبَا بِطَرِّ يَفْتَنِكُمُ الْمُثْلَى (۲۱)۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلک و مذہب کو جو بہترین ہے ختم کر دیں۔ یا تمہاری قوم کے بہترین رؤساء و اشراف کو ختم کر دیں۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے امْثَلُهُمْ طَرِيقَةً (۲۲)۔ بہترین طریقے پر چلنے والا۔ سورہ جن میں ہے لَوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ (۲۳)۔ اگر وہ (صحیح) راستے پر قائم رہتے۔ ذرا پہلے ہے كُنَّا طَرَّاقًا قِدَادًا (۲۴)۔ ہم متفرق راستوں پر تھے۔ مختلف مسلک رکھتے تھے۔

الطَّرِيقَةُ۔ وہ چیز جو ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو۔ اَلْمَطَارِيقُ اَنْ اَوْنُوهَا كَوْنُوهَا هِيَ جَوَّ اِيك دوسرے کے پیچھے چل رہے ہوں۔ اَطْرَقَتْ اَلْاَبِلُ۔ اونٹ ایک دوسرے کے پیچھے چلے۔ اَطْرَقَتْ اَلْاَرْضُ۔ زمین میں مٹی کے اوپر مٹی چڑھ گئی۔ اَلِيطْرَاقُ۔ جوڑنے کا پرتلہ جو ایک کے اوپر دوسرا رکھ کر سی لیا جائے *۔ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا قَوْمَكَ مِثْلَهُمْ سَبْعَ طَرَّاقٍ (۲۵)۔ یہاں طَرَّاقُ کے معنی اوپر تلے مختلف طبقات بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اجرامِ فلکی جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ یا وہ اجرامِ سماوی جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہیں۔

ط ر ی (و)

اَلطَّرِيْءُ۔ نیا۔ نرم اور تروتازہ۔ طَرِيَّ اللَّحْمُ وَطَرُوْا طَرَاوَةً۔ گوشت کا نرم اور تروتازہ ہونا **۔ قرآن کریم میں سمندر کے متعلق ہے کہ اس میں سے لَحْمًا طَرِيًّا (۲۶) حاصل ہوتا ہے۔ تروتازہ گوشت یعنی سچھلی وغیرہ۔

ط ع م

اَلطَّعَامُ۔ اہل عرب جب اسے مطلقاً بولتے ہیں تو اس سے مراد گیہوں یا کھجور ہوتی ہے۔ ورنہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کھائی جائے اور جس

سے انسان کے جسم کی پرورش ہو سکے۔ اَلطَّعْمَةُ - کھانے کی چیز - رزق - ذریعہ معاش - طَعْمٌ الشَّيْءِ - چیز کا مزہ - اس لئے طَعِيمٌ اور تَطْعَمٌ کے معنی چکھنا بھی ہوتے ہیں * - نیز طَعِيمٌ کے معنی ہیں اس نے پیٹ بھرا - طَاعِيمٌ کے معنی ہیں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو - نیز مستغنی * - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں -

نیز اَلطَّعْمُ - قدرت اور اختیار کو بھی کہتے ہیں - طَعِيمٌ عَلَیْہِ - وہ اس پر قادر ہوا * - قرآن کریم میں طَعَامٌ (۱۶۱) کھانے کی چیز کے لئے آیا ہے - اور (۲۳۹) میں پینے یا چکھنے کے معنوں میں - اَطْعَمَ (۱۳۱) اس نے کھانا کھلایا - اِسْتَطْعَمَ (۱۸۰) اس نے کھانا مانگا -

اس کے عمومی معنی ہر قسم کے سامان پرورش کے ہیں - وَلَا يَحْضُ عَلیٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ (۱۳۱) کے معنی صرف روٹیاں کھلانے کے نہیں - اس کے معنی ہیں ان لوگوں کی پرورش کا سامان بہم پہنچانا یا ضروریات سے مستغنی کر دینا جو نقل و حرکت سے معذور ہو جائیں یا جن کی زندگی کی گاڑی رک جائے -

سورة مائدہ میں ہے کہ اُحِلَّ لَکُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُہُ (۹۶) - اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ پانی کے وہ جانور جن کا تم شکار کرو یا وہ جنہیں پانی از خود اچھال کر باہر پھینک دے، حلال ہیں - (ابن جریر) صاحب البستان نے بھی یہی لکھا ہے - تاج نے کہا ہے کہ جس جگہ سے سمندر کا پانی ہٹ جائے، وہاں جو کچھ رہ جائے اور بغیر شکار کئے مل جائے وہ طَعَامُ الْبَحْرِ ہے - لسان العرب میں ہے کہ طعام البحر ہے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنکی زندگی کا دارومدار سمندر پر ہو -

ط ع ن

طَعْنَتْہُ بِالرَّمْحِ - يَطْعُنُ - اس کے نیزہ مارا، چبھو دیا - گھونپ دیا * - طَعَنَ فَيْہِ - کسی میں عیب نکالنا - طَنَزَ کرنا * - طَعْنًا فِي الدِّينِ (۲۶۱) - دین میں عیب نکالتے ہوئے - طعن کرتے ہوئے - طَنَزَ کرتے ہوئے -

ط غ ی (و)

طَغَى - حد اور پیمانے سے باہر ہو جانے کو کہتے ہیں - اسی لئے دریا وغیرہ کے پانی کا بڑھکر مقررہ اندازہ سے زیادہ بلند ہو جانے یا ساحل سے باہر آجانے کو طَغْيَانٌ کہا جاتا ہے - اَطْغَى - اسے حد سے متجاوز اور حدود شکن

بنایا۔ اسے طغیان و سرکشی پر ابھارا۔ الطَّاغِیُّ - حد سے متجاوز اور قانون شکن آدمی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع الطَّاغِیُّونَ اور الطَّاغِیَّةُ ہے۔ طَغِیَّةٌ اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ طَاغِیَّةٌ - جبار و متکبر اور احمق و سخت گیر، نیز معاند انسان کو کہتے ہیں۔ بجلی کی شدید کڑک اور مہیب طوفان کو بھی۔ طَغْوٰی کے معنی سرکشی اور حدود شکنی کے ہیں*۔ یہیں سے لفظ طَاغُوتُ ہے جو (صاحب مفردات کے نزدیک) ہر حدود شکن، نیز اللہ کے سوا ہر باطل معبود کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز اس کے لئے جو کسی کو سیدھی راہ سے ہٹکا کر غلط راستے پر لگا دے**۔ جوہری کے نزدیک سرکشوں کے ہر سرغنہ کو طَاغُوتُ کہا جاتا ہے*۔ زجاج نے کہا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی اطاعت اختیار کی جائے وہ طَاغُوتُ ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی طاقت*۔

قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰۶)۔ یعنی وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ فِی طَغٰیٰنِہِیْمُ یَعْمَہُوْنَ (۲۰۷) میں طَغِیَّانُ کے معنی سرکشی ہیں۔ اور (۲۰۸) میں لِیَطَّاغِیْنَ سرکشوں کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ کے مقابلہ میں الطَّاغُوتُ کا لفظ آیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون اور نظام، ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (۲۰۹) میں یہ مفہوم واضح ہے۔ یعنی جو خدا پر ایمان لائے اور ہر غیر خدائی قوت (نظام - قانون) سے انکار کر دے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے یہی معنی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۲۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز (۲۱۱) میں ہے الَّذِیْنَ اٰمَنُوا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوتِ۔ یہاں سبیل اللہ اور سبیل الطاغوت نے بتا دیا کہ طاغوت کے معنی ہر غیر خدائی اقتدار و نظام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو سبیل الطاغوت (غیر خدائی نظام کی خاطر) جنگ کرتے ہیں، اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (۲۱۲) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ طَاغُوتُ اور شَیْطٰنُ مرادف المعنی ہیں۔ اس کی تشریح میں، یُسْرَرُ یَسْدُوْنَ اَنْ یَّتَمَحَّکُمُوْا اِلٰی الطَّاغُوتِ (۲۱۳) ”یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں“، کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ طاغوت یا شیطان محض ذہنی تصورات نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام* تاج و محیط و لسان - **راغب۔

وہ حاکم ، وہ عدالتیں ، وہ حکومتیں ، وہ نظام ، جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں ۔ ان کی طرف رجوع کرنا خدا سے انکار اور طاغوت کی عبادت ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ "أُولَئِكَ الشَّقِیُّنَ" (یعنی غیر خدائی اقتدار کے رفقاء) ہیں ۔

سورة حا قہ میں ہے لَمَّا طَغَى الْمَاءُ (۲۱) جب سیلاب آگیا ۔ (۲۱) میں الطَّافِیَّةُ بجلی کی شدید کڑک کے لئے آیا ہے جس سے قوم ثمود کی ہلاکت ہوئی تھی۔ لیکن یہ عذاب خود ان کی سرکشی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ سورة شمس میں ان کے متعلق ہے ۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا (۲۱) ۔ ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر حق کی تکذیب کی ۔ سورة النجم میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (۵۳) ۔ اس کی آنکھ نہ تو صحیح مقام سے ادھر ادھر ہئی اور نہ ہی اپنی حد سے بڑھی ۔ یعنی نبی بذریعہ وحی ، حقیقت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتا ہے لیکن اسی حد تک جس حد تک خدا اسے لے جاتا ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں نبی کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وحی کا سرچشمہ سرحدِ ادراک سے ماوراء ہوتا ہے ۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں وہ محدود ہوتا ہے ۔ خدا نبی کو بھی اتنا ہی علم دیتا ہے جتنا علم دیا جانا مقصود ہو ۔ نبی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔

ط ف ا

طَفِیَّتِ النَّارُ ۔ وَانْطَفَأَتْ ۔ آگ کا شعلہ بیٹھ گیا اور وہ سرد ہو گئی ۔ اُطْفَأَ النَّارُ ۔ اس نے آگ کو بجھا دیا ۔ اُطْفَأَ نَارَ الْحَرَبِ ۔ اس نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے کُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ اُطْفِئَتْ هَآلَکَ اللَّهُ (۵) ۔ ”جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اسے بجھا دیتا ہے،، ۔ استعارہً اُطْفِئَتْ الْفِتْنَةُ فتنہ فرو کرنے کو کہتے ہیں** ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جب آگ کے شعلے اٹھنا بند ہو جائیں مگر اس کے انگارے روشن ہوں تو اس آگ کو خامیدۃ* کہتے ہیں ۔ لیکن جب آگ کے شعلے ساکن ہو جائیں اور اس کے انگارے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں تو اسے هامیدۃ* اور طافیئۃ* کہتے ہیں* ۔

راغب نے کہا ہے کہہ یُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ (۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اور یُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ (۶۱) کے معنی یہ ہیں کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خدا کے نور کو بجھا سکیں * لیکن اللہ اپنے نور کو پورا (مکمل) کر کے رہے گا اور یہ اس طرح ہوگا کہ اس کا بھیجا ہوا نظام، باقی تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ لِيُظْهِرَهُ عَالَمُ الدِّينِ كَآيَاتِهِ (۳۲ : ۶۱)۔

ط ف ف

الطَّافِيَةُ - تھوڑی چیز - نامکمل و ناقص چیز - الطَّافَاةُ - برتن کے بھرنے میں جسقدر کمی رہ جائے - طَفَّ النَّاقَةُ يَطْفُفُهَا - اس نے اونٹنی کے پاؤں باندھ دئے - أَطْفَفَتِ النَّاقَةُ - اونٹنی نے نا تمام بچہ دیا - طَفَفَ التَّمِيكَتَالُ - اس نے پیمانہ کو پورا نہیں بھرا - اس میں کمی کی **۔

قرآن کریم میں ہے - وَيَلْ لَّيْلُمُطْفِئِينَ (۸۳) ”مطففین“ کے لئے تباہی ہے - اور اس سے اگلی دو آیتوں میں خود ہی اسکی تشریح کر دی کہ مطفین وہ ہیں کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ کر لیتے ہیں، اور جب دیتے ہیں تو ناپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں (۴۳) - قرآن کریم نے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتایا ہے (وَيَلْ) - یہ اس معاشرہ کا ذکر ہے جس میں نظام زندگی کا یہ انداز ہو کہ سرمایہ دار اور صاحب اقتدار طبقہ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیں بلکہ ان کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں - نظام سرمایہ داری میں کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا ہی نہیں جاتا - اگر پورا معاوضہ دیدیا جائے تو سرمایہ دار کو کیا ملے؟ وہ کام کرنے والوں کو کم از کم دیتا ہے اور خود زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے - اسی سے سرمایہ داری قائم رہتی ہے۔

قرآن کریم اسے تَطْفِيفٌ کہتا ہے اور اس نظام کا انجام تباہی اور بربادی بتاتا ہے - پھر اس لفظ کے معنی (اونٹنی کے پاؤں باندھنے) میں اسطرح بھی اشارہ ہے کہ اس سے کام کرنے والوں کی صلاحیتیں زنجیروں میں جکڑی رہتی ہیں اور کبھی بھی اپنی حقیقی جولا نگاہ کی انتہائی وسعت تک نہیں پہنچنے پاتیں - وہ سٹی، سکڑی، بندھی اور ناتمام رہ جاتی ہیں - لہذا تَطْفِيفٌ کے معنی صرف معاشی ناہمواریاں ہی نہیں بلکہ اس میں انسان کے احترام اور عزت میں کمی کرنا بھی داخل ہے - جس انداز اور طریق سے بھی شرف

انسانیت میں کمی واقع ہو جائے وہ تَطْفِيفٌ* ہے۔ جس معاشرہ میں تکریم آدمیت اور احترام انسانیت میں کمی ہو (یعنی انسان کا پورا پورا احترام بہ حیثیت انسان نہ کیا جائے) وہ مطففین کا معاشرہ ہے جس کا انجام تباہی ہے۔

ط ف ق

طَفِيقٌ يَفْعَلُ كَذَا۔ وہ ایسا کرنے لگا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کام کو کرنا شروع کر دے اور پھر اس میں مسلسل لگا رہے۔ طَفِيقُ الْمَوْضِعِ۔ وہ اس جگہ جم کر رہا اور وہاں سے نہ ہٹا*۔ قرآن کریم میں ہے وَطَفِيقًا يَخْصِيْفُنْ..... (۴۴)۔ وہ لکے ایسا کرنے۔

ط ف ل

الطِّفْلُ*۔ ہر نرم اور نازک چیز۔ طِفْلٌ۔ طِفْلَةٌ۔ طِفْلُوْلَةٌ*۔ نرم و نازک ہونا۔ الطِّفْلُ*۔ ہر چھوٹی چیز۔ بچہ۔ جمع اَطْفَالٌ* (۲۹)۔ (طِفْلٌ* خود بھی جمع کیلئے آتا ہے) راغب نے کہا ہے کہ بچہ کو طِفْلٌ* اس وقت نک کہتے ہیں جب تک کہ وہ نرم و نازک ہو**۔ قرآن کریم میں ہے۔ ثُمَّ نَخْرِجُكُمْ طِفْلًا* (۲۲)۔ پھر تمہیں ایک بچے کی حیثیت سے پیدا کرتے ہیں۔

ط ل ب

الطَّلَبُ*۔ کسی چیز کے حصول کی خواہش، اس طرح کہ اس کے حاصل کرنے میں کوشش کرنی پڑے***۔ یا کسی چیز کے پانے کی تلاش اور جستجو****۔ کسی چیز کا متلاشی ہونا اور اسے پا لینا۔ طَلَبَ الْيَمْرَ۔ اس نے اس سے مانگا۔ كَلَّأَ* مَطْلِبٌ*۔ اس گھاس کو کہتے ہیں جو پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لئے تکلیف اٹھانی پڑے۔ اُمُّ طَيْلُبَةَ*۔ عقاب کو کہتے ہیں۔ اس میں تلاش اور دوری دونوں آجاتے ہیں*۔

سورة کہف میں ہے۔ فَلَمَن تَسْتَطِيعُ لَهٗ طَلَبًا* (۱۸)۔ یہاں طلب کے معنی تلاش کے بعد حاصل کرنے کے ہیں۔ سورہ حج میں الطَّلَبُ* وَالْمَطْلُوْبُ* (۲۳) آیا ہے۔ طلب کرنے والا اور جسے طلب کیا جائے۔

*تاج و محیط۔ **تاج و راغب۔ نیز ابن فارس۔ ***محیط۔ ****راغب۔

ط ل ح

الطَّلَحُ*۔ ابن شعیب نے کہا ہے کہ یہ ایک لمبا درخت ہوتا ہے جس کے سائے میں لوگ بیٹھتے ہیں۔ اس پر پتے تھوڑے اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں۔ بیول کے درخت جو اونٹوں کے چارے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ابواسحق نے کہا ہے کہ اس سے مراد کیلے کا درخت ہے۔ نیز طَّلَحُ بمعنی طَّلَعُ بھی آتا ہے (دیکھئے ط۔ ل۔ ع)۔ رَجُلٌ طَالِحٌ*۔ خراب آدمی کو کہتے ہیں جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ یہ صَالِحٌ کی ضد ہے۔ اور بَتِيعٌ طَالِحٌ*۔ تھکے ماندہ لاغر اونٹ کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسرے معانی کے لحاظ سے الطَّلَحُ*۔ نعمت کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا درخت اور (۲) کمزوری اور لاغری کے ہیں۔

قرآن کریم میں جنت کے ذکر میں ہے طَّلَحٍ مِّنْضُودٍ (۲۹)۔ نہ بہ تہ کیلے یا ترتیب سے جمائے ہوئے کیلوں کے درخت۔

ط ل ع

طَلَعَ طُلُوعًا - نکلا - ظاہر ہونا (سورج وغیرہ کا)* - (۲۳۰)۔

مَطْلَعٌ اور مَطْلِعٌ* - طلوع ہونے کی جگہ - (۱۸۸)۔ یا طلوع ہونے کا وقت - یہ مصدر بھی ہے - یعنی اس کے معنی طلوع ہونا، اور ظاہر ہونا بھی ہیں۔ سورۃ قدر میں اس کے معنی طلوع کے وقت کے ہیں (۹۷)۔ طَلَعَ الْجَبَلُ* - وہ پہاڑ پر چڑھ گیا - اَطْلَعَ عَلٰی الْاَمْرِ کے معنی ہیں وہ کسی معاملہ سے واقف و باخبر ہوا۔ چنانچہ اصمعی نے کہا ہے کہ کبھی مَطْلَعٌ اُس سیڑھی کو کہتے ہیں جس پر نیچے سے اوپر کی طرف چڑھا جائے***۔ اَطْلَعَ عَلَیْہِ کے معنی ہیں وہ اس کے اوپر پہنچا اور وہاں سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا، اور مَطْلَعٌ اس طرح جھانکنے والے کو بھی کہتے ہیں - (۵۵-۵۳)۔

فراء نے کہا ہے کہ اَطْلَاعٌ اور بُلُوغٌ کے ایک ہی معنی ہیں - یعنی کسی تک پہنچنا - (۲۸۸)۔ تَطْلِعُ عَلٰی الْاَفْئِدَةِ (۱۴۲) جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے - اَطْلَعَ عَلٰی بَطْنِیْہِ - اس کی اندرونی حالت سے واقف ہو گیا*۔ اَطْلُوعٌ - بلندی اور سرفرازی کے ساتھ نمودار ہونا*۔

تَخْلَعُ مَطْلِعَةً* - وہ کھجور کا درخت جو اپنے ارد گرد کے کھجوروں کے درختوں سے اونچا ہو۔**۔ اَطْلَاعٌ* - وہ تیر جو نشانہ سے ہٹ کر اس کے اوپر کی جانب جا کر لگے*۔ اَطْلَعَتْ عَلٰی الْاَمْرِ - اسے معاملہ سے باخبر کیا (۱۷۸)۔

الْقَطَائِعُ - کھجور کے درخت پر غلاف جیسی ایک چیز نکلتی ہے جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے - اس کا ایک سرانہو کیلا ہوتا ہے * - (۲۱۸ - ۳۶ - ۵۰)

ط ل ق

طَلَّقَ - آزاد ہو گیا - طَلَّقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِيهَا - عورت اپنے شوہر سے جدا ہو گئی - أَطْلَقَ الْأَسِيرَ - قیدی کو رہا کر دیا - نَاقَةُ طَالِقٍ - بلا نیکیل کے اونٹنی - الطَّالِقَةُ - وہ اونٹنی جسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھانے پئے - الطَّلَقُ - ہرن (جو آزاد ہوتا ہے) - نیز وہ اونٹنی جو مقید نہ ہو - لِسَانٌ طَلَقٌ - وُطِّلِقَ - تیز چلنے والی زبان - مُطْلَقٌ - مُقَيَّدٌ کی ضد ہے * - یعنی جو محدود و مقید نہ ہو -

سورة کہف میں ہے فَانْطَلَقَا (۱۸) - وہ دونوں روانہ ہو گئے - وَانْطَلَقَ الثَّمَلَةُ (۳۸) بڑے بڑے سردار (تیزی سے) کہنے لگے - حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے کہا تھا کہ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي (۲۱) - میری زبان آزادی یا روائی سے نہیں چلیگی - (اس لئے کہ انہیں جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا یا کم از کم متمدن دنیا سے دور رہتے ہوئے) - اس لئے انہیں خیال تھا کہ وہ فرعون کے دربار میں شاید اس روائی اور طلاق سے گفتگو نہ کر سکیں جس کی وہاں ضرورت تھی) -

راغب نے طلاق کے بنیادی معنی کسی بندھن سے آزاد کرنا اور نجات دینا بتائے ہیں - پھر یہ استعارہ شوہر کا بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (۲۴) - طَلَّقَ کے معنی ہیں طلاق دیدینا - (۲۳) - مُطْلَقَةٌ - طلاق دی ہوئی عورت، اسکی جمع مُطَلَّقَاتٌ ہے (۲۴) -

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایسے معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے (دیکھئے عنوان ن - ک - ح) اس لئے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ناممکن ہو جائے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے - قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لئے طریق کار کیا ہے - لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد نے جب جی چاہا طلاق - طلاق - طلاق - کہہ دیا اور نکاح ٹوٹ گیا - اور اس کے

بعد اس جوڑے کا باہمی ملاپ نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح (حلالہ) کر کے ایک شب اس سے ہم آغوشی نہ کر لے۔ تو یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

الطَّلَاقُ مَشرُتُن۔ کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان م۔ ر۔ ر، دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ طلاق کا لفظ اسوقت بولا جائے گا جب میاں بیوی عقد نکاح سے آزاد ہو جائیں۔ طلاق کے ارادے یا اس کے ابتدائی مراحل کو طلاق نہیں کہا جائیگا۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لفظ طَّلَاق ایک تو طَلَّقَ سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں آزاد ہو جانا۔ اور دوسرے یہ لفظ طَلَّقَ سے اسم ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی آزاد کرانا ہونگے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد نکاح کا فسخ کرنا میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اور طلاق کا فیصلہ عدالت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ طَّلَاق کے معنی آزاد کرانا بالکل صحیح بیٹھتے ہیں۔

ط ل ل

الطَّلُّ - بہت ہلکی سی بارش۔ پھوہار۔ بلکہ اوس جو کھلی فضا میں بڑتی ہے *۔ (۲۱۵)۔ الطَّلَاكَةُ - سرور۔ خوشی۔ حسن و جمال۔ تروتازگی۔ زندگی کی خوشگواری *۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) تروتازگی اور نرسی و نزاکت۔ (۲) جھانکنا اور (۳) کسی چیز کو باطل کر دینا ہیں۔ اور الطَّلُّ ہلکی سی بارش کو کہتے ہیں کیونکہ اس سے زمین کو زینت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔

ط م ث

الطَّمْثُ - چھونا۔ هَذَا جَمَلٌ مَطْمَثٌ حَبَلٌ قَطٌّ - یہ اونٹ ہے جسے رسی نے قطعاً نہیں چھوا۔ طَمَثَ الْمَرْأَةُ - اس نے اس عورت کی بکارت زائل کر دی۔ بعض نے اس کے معنی عام جماع کرنے کے لئے ہیں۔ (عورت کو چھونے سے کنایہ بھی ہوتا ہے)۔ الطَّمْثُ تہمت، گندگی، اور فساد کو بھی کہتے ہیں **۔

* تاج - ** تاج و محیط و راغب -

جنتی معاشرہ کی عورتوں کی عفت و عصمت کے ضمن میں کہا ہے کہ
 اِنَّهُمْ يَطْمَعُوْنَ فِيْ اَنْفُسِ قَبْلَ لَهْمٍ وَلَا جَنَانٍ (۵۹)۔ اس سے قبل کسی
 انسان نے (جن و انس میں سے کسی نے) انہیں چھوا نہیں ہوگا۔ کیسا
 فردوس آفریں ہے یہ اطمینان کہ جس لڑکی سے میں شادی کر رہا ہوں اسے
 اس سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔

ط م س

طَمَسَ - مٹ گیا۔ اس کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ طَمَسَتْهُ طَمْسًا۔
 مینے اسے مٹا دیا۔ اس کا نام و نشان تک ختم کسر دیا (لازم و متعدی) *۔
 سورہ نساء میں ہے قَبْلَ اَنْ نَطْمِسَ وُجُوْہًا (۳۷)۔ قبل اس کے کہ ہم
 ان کے بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔ انہیں تباہ و برباد
 کر دیں **۔ سورہ یونس میں ہے۔ رَبَّنَا اَطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِہِمْ (۸۸)۔
 ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کر دے۔

طَمِسَ - مَطْمُوْسٌ - اندھا، جسے کچھ نظر نہ آئے *۔ سورہ قمر میں
 قوم لوط سے متعلق ہے۔ فَطَمَسْنَا اَعْيُنَہُمْ (۵۳)۔ سدوم کے آتش
 فشاں پہاڑوں سے آگ اور گندھک کے دھوئیں کا ایسا طوفان اٹھا کہ اس سے
 ان کی آنکھیں بیکار ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ شدت جذبات سے اندھا ہو جائے
 کیطرف بھی اشارہ ہو۔ اس لئے کہ بصیرت کے ختم ہو جانے کے لئے بھی
 یہ لفظ آتا ہے۔ (دیکھئے ۳۶)۔ سورہ مَرْسَلَتْ میں ہے فَاِذَا النَّجْمُ
 طَمِسَتْ (۶۸)۔ جب ستاروں کی روشنی جاتی رہیگی۔

ط م ع

طَمَعَ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں نفس انسانی کا
 کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان اور جھکاؤ *۔ اس میں حرص اور
 امید دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی دل
 میں کسی چیز کی ہرزور امید کے ہیں۔ اَلْمَطْمَعُ - وہ چیز جسکی طمع کی جائے۔
 جس چیز کی طرف نگاہ کھینچ کر چلی جائے *۔ چنانچہ اس پرندے کو بھی
 اَلْمَطْمَعُ کہتے ہیں جسے جال کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اسے دیکھ
 کر دوسرے پرندے جال میں پھنس جائیں ***۔

قرآن کریم میں یہ لفظ **خَوْفٌ** کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳)۔ **خَوْفٌ**۔ نقصان کے احساس کو کہتے ہیں، اس لئے **طَمَعَ** نفع کی امید ہے۔ آرزو رکھنے (خواہش کرنے) کے معنوں میں سورۃ معارج میں ہے۔ **أَيُّطَمَعُ كَلٌّ** امریٰ ع۔ **مِنْهُمْ** (۳۸)۔ کیا ان میں سے ہر شخص اسکی آرزو رکھتا ہے ؟ اور توقع رکھنے کے معنوں میں۔ **ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ** (۱۵)۔ پھر وہ اس کی توقع بھی رکھتا ہے کہ میں اسے زیادہ کرتا جاؤں !

ط م م

طَمَّ الْمَاءُ يَطْمُ۔ **طَمًا**۔ پانی نے کسی چیز کو ڈھانپ لیا اور اس کے اوپر چھا گیا۔ **طَمَّ السَّيْلُ** **الْقَرِيَّةَ**۔ سیلاب نے کنوئیں کو پاٹ دیا اور برابر کر دیا *۔ **طَمَّ الْبَيْتُ**۔ کنوئیں کو مٹی سے بھر کر برابر کر دیا (ابن قارس)۔ **طَمَّ السَّطَائِرُ الشَّجَرَ**۔ پرندہ درخت کے بالائی حصہ پر جا بیٹھا۔ **الطِّيمُ**۔ سمندر۔ بکثرت پانی۔ **الطَّامِئَةُ** ایسی چیخ کی آواز جو ہر شے پر چھا جائے *۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کے لئے **الطَّامِئَةُ الْكُبْرَى** (۱۶) آیا ہے۔ یعنی وہ بہت بڑی مصیبت کی گھڑی جو سیلاب کی طرح چھا جائے گی اور سب پر غالب آجائے گی۔ مندرجہ بالا معانی کی رو سے اس حادثہ کو بھی **طَامِئَةٌ** کہا جا سکتا ہے جو اونچ نیچ برابر کر دے۔

ط م ن (طمان)

الطَّمَنُ۔ ساکن۔ **فِيْمَا تَطْمَأْنِنُ**۔ اس میں سکون اور وقار ہے **۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے کہا کہ مجھے بتا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے کہا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں ؟ انہوں نے جواب دیا۔ ”بَلٰی“۔ ایمان تو ہے۔ **وَكَلِّكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي** (۲۰)۔ ولے میں اپنا اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔ اس سے (۱۷) **طَمِئْنَا** کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی تسکینِ قلب کی وہ کیفیت جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔ جو علم و فکر، دلائل و برہان، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اطمینانِ قلب کو **اِكْتِرَاهٌ** کی ضد قرار دیا ہے (۱۶)۔ **اِكْتِرَاهٌ** کے معنی ہیں کسی بات کو زبردستی منوانا۔ (دیکھئے عنوان ک۔ ر۔ م) لہذا اطمینانِ قلب کے معنی ہونے کسی بات کو دل کی پوری رضامندی سے ماننا۔ اسی سورۃ (النحل) میں ذرا

آگے چل کر آمن* اور اطمینان*۔ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ (۱۱۶) ، اگرچہ اطمینان کے لئے آمن* (بے خوفی) کو ضروری شرط قرار دیا گیا ہے (۱۱۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ملک میں امن ہو تو قلوب کو بھی اطمینان ہو۔ امن خارجی خطرات سے محفوظ ہونے کا نام ہوگا۔ لیکن (اطمینان*) اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی داخلی کشمکش سے محفوظ ہو، اور یہ چیز فریبِ نفس سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ علم و حقیقت کی بنا پر ہو۔ انسانی ذات (نفس) کی یہی وہ کیفیت ہے جسے ”جنت کی زندگی“ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۱۸)۔ لیکن اس حقیقت کو ساتھ ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ چیز خلوت گاہوں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوگی۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ ”فَاَدْخُلِيْ فِیْ عِبَادِیْ“۔ وَاَدْخُلِيْ جَنَّتِیْ“ (۱۱۹)۔ جنت میں داخلہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ”خدا کے بندوں“ کے ساتھ شامل ہو۔ اور پھر یہ سب ملکر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَتَّطَمَّعْنَ اَلْقُلُوْبُ“ (۱۲۰)۔ ”اے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ صحیح اطمینانِ قلب قوانینِ خداوندی ہی سے نصیب ہو سکتا ہے“۔ (دیکھئے عنوان ذ۔ ک۔ ر) جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اللہ کے ذکر سے مراد، تسبیح پر اللہ۔ اللہ پکارنا یا دل پر ضربیں لگانا، نہیں۔ اس سے مفہوم خدا کے قانون (قرآن) کو ہر وقت سامنے رکھنا ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ رزق کی فراوانی ہوتا ہے۔ (۱۲۱)۔ اگر مقصودِ حیات ہر فرد کا اپنا اپنا اطمینانِ قلب ہو تو دنیا سے خیر و شر کی تمیز ہی اٹھ جائے۔ ایک ڈاکو یا ٹھگ جب کسی کی جان لیکر کالی دیوی کے استھان پر مقررہ نذر چڑھا دیتا ہے، یا برہمن بت کی ہوجا کر لیتا ہے تو ایسے ایسا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے جو ایک خدا پرست کے اطمینان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ لہذا مقصدِ زیست اپنا اطمینان نہیں (جو بسا اوقات فریبِ نفس ہوتا ہے)۔ مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں ہر معاملہ عدل و احسان کی رو سے طے ہو اور اس طرح ہر فرد کو صحیح اطمینان میسر آ جائے۔

”مُتَّعَمِّنِیْشِنْ“ (۱۲۲) اطمینان سے سکونت پذیر ہونے والے۔ اقامت پذیر ہونے والے۔

ط ہ ر

اَلطَّهَّارَةُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے نجاست کا دور ہو جانا*۔ ابن فارس نے اس کے معنی ستھرا پن اور میل کچیل کا زائل ہو جانا بتائے* تاج۔

ہیں۔ صاحب تاج نے کہا ہے کہ طہرہ - طحیرہ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور طحیرہ کے معنی ہیں آبعده - یعنی اسے دور کر دیا۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَمُطَهِّرٌ مِّنَ الذَّنَبِ كَتَبَرُوا (۵۳)۔ جس کے معنی ہیں خدا تجھے ان لوگوں سے الگ مٹا کر دور لے جائیگا جو تیری صداقت کا انکار کرتے ہیں۔ یا تیرے خلاف جو اتہام تراشتے ہیں ان سے خدا تجھے بری کر دیگا۔ اسی نہج سے تَطْمِئِرٌ کے معنی کسی شے سے نجاست اور آلائش وغیرہ کو دور کر کے اسے پاک اور صاف کرنا ہیں۔ طاہر کے معنی ہیں پاک اور صاف۔ مُطَهَّرَةٌ میں طاہرہ سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ طہور اس چیز کو کہتے ہیں جس سے پاکیزگی حاصل کی جائے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ چیز جو خود پاک ہو اور دوسری چیزوں کو پاک کر دے۔ (کیونکہ فَعُول کے وزن میں فاعیل کے مقابلہ میں زیادہ بالغہ اور شدت ہوتی ہے)۔ چنانچہ قرآن کریم میں بارش کے پانی کو مَاءٌ طَهُورٌ (۲۸) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی کشید کردہ (لہذا صاف) ہوتا ہے اور ہر شے کو پاک اور صاف کر دیتا ہے۔ طہر - وہ حالت یا زمانہ جس میں عورت حیض سے پاک ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو جائے تو طہرت کہا جاتا ہے اور جب اس کے بعد غسل کر لے تو تَطْمِئِرٌ کہا جاتا ہے*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو ہے وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّىٰ يَطْمِئُرْنَ فَإِذَا تَطْمِئُرْنَ فَأَتُوهُنَّ..... (۲۴) تو اس میں بھی لطیف فرق ہے۔

قرآن کریم میں طہارت کا لفظ صرف جسمانی پاکیزگی کے لئے ہی نہیں استعمال ہوا بلکہ اس میں قلبی اور ذہنی پاکیزگی بھی شامل ہے۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ہے لَمْ يَرْدِ اللَّهُ أَنْ يَطْمِئِرْ قُلُوبُ بَشَرٍ (۵۱)۔ یہ پاکیزگی قلب کی شہادت ہے۔ سورہ واقعہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶)۔ تو اس سے مراد یہی ہے کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے وہی لوگ مس رکھتے ہیں، وہی ان تک پہنچ سکتے ہیں، وہی ان سے باخبر ہو سکتے ہیں*، جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو۔ جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں۔ جو اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے خالی کر کے اور اپنے دلوں کو تمام ذاتی رجحانات و میلانات سے منزہ رکھ کر اسے سمجھنا

چاہیں۔ اگر ذہن پہلے ہی سے غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ ہے اور دل ذاتی مفاد پرستیوں سے آلودہ، تو پھر قرآن کریم کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔ (دیکھئے عنوان م۔ م۔ م۔)۔ جو لوگ زندگی کی آلودگیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا احساس رکھتے ہوں انہیں مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم مُتَّقِیْنَ ہی کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ (ہُدٰی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۲) اس کی بنیادی شرط ہے۔

رَجُلٌ طَٰهِرٌ اَلْبِیَّابِ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو نہایت پاکیزہ نفس ہو*۔ کیونکہ عرب عام طور پر بیابان* کا لفظ انسانی ذات یا شخصیت کے لئے بولتے ہیں*۔ اس لئے وَیَبَّابُکَ قَطْمِیْرٌ (۲۴) کے معنی ہونگے، اپنی ذات کو تمام ہست خیالات سے بلند کر کے پاکیزگی قلب و نگاہ کا پیکر بناؤ۔ اور اگر بیابان* کے معنی دعوت کے لئے جمائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اپنی اس انقلابی دعوت کو تمام ایسے لوگوں سے دور رکھو جن کے قلب و دماغ پاکیزہ نہیں۔ اس جماعت میں وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اپنے دل اور دماغ کو تمام غیر خدائی تصورات سے پاک اور صاف رکھیں۔ نیز اس دھوت میں نظری طور پر بھی کوئی غلط تصور شامل نہ ہوئے ہائے۔ (بیابان* کے معانی کے لئے ٹ۔ و۔ ب کا عنوان دیکھئے)۔

سورہ احزاب میں رسول اللہ* کے اہل خانہ کے متعلق ہے وَیُطَهِّرْکُمْ تَطْہِیْرًا (۳۳)۔ خدا تمہیں ہر قسم کے الزامات سے دور رکھے گا اور قلب و نظری پاکیزگی عطا کریگا۔

جنتی معاشرہ کے پاکیزہ سیرت اور تربیت یافتہ ہم نشینوں کو آؤ آج* مُطَهَّرَةٌ (۲۵) کہا گیا ہے۔ اس میں بیویاں بھی شامل ہیں اور دوسرے رفقاء کار بھی۔ (دیکھئے عنوان ز۔ و۔ ج)۔

ط و د

الطَّوْدُ*۔ بلند پہاڑ۔ ریت کا اونچا ٹیلہ۔ الطَّادُ*۔ بوجھل اور جمی ہوئی چیز جو اپنی جگہ پر محکم ہو۔ طَادَ الشَّیْءُ*۔ وہ چیز ایک جگہ پر جم گئی۔ بِنَاءٌ مِّنْ طَادٍ*۔ بلند عمارت**۔

قرآن کریم میں کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (۲۶) آیا ہے۔ یعنی بڑے ٹودہ (یا ٹیلہ) کی طرح۔

ط و ر

الطُّورُ* - سرسبز پہاڑ - اگر پہاڑ سرسبز نہ ہو تو اسے طُورُ* نہیں کہتے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے لمبا ہونے اور بڑھنے کے ہیں خواہ وہ زمان سے متعلق ہو یا مکان سے۔ اور پہاڑ کو طُورُ* اس کے طول، عرض اور بلندی میں پھیلنے اور بڑھنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الطُّورُ* - آیلہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جو سَيْنَاء یا مِیْنِیْن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے*۔ (۲۳: ۲۵)۔ دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ اسی (طُورُ*) کے دامن میں بنی اسرائیل سے اس دعوت پر ایمان کا عہد لیا گیا تھا (۲۳: ۲۴)۔ اَلطُّورُ* - بار - دفعہ - مرتبہ - طُورًا بَعْدَ طُورٍ* - ایک بار کے بعد دوسری بار - دوسری مرتبہ - یا دوسری دفعہ - نیز جو کسی چیز کے بالمقابل یا اس کے برابر ہو - طُورُ* بھی اس معنی میں آتا ہے۔ اَطْوَارُ* - مختلف حدود یا اقسام - مختلف مدارج و احوال یا اندازے*۔ قرآن کریم میں ہے قَدْ خَلَقْنٰكُمْ اَطْوَارًا (۱۳: ۱۳)۔ خدا نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل میں سے گذار کر انسانی منزل تک پہنچایا ہے - تمہاری تخلیق مختلف احوال و مدارج سے گذر کر ہوئی ہے - یا تمہیں مختلف احوال میں پیدا کیا ہے - طَارِبَہ (یَطْوُرُ) کے معنی قریب ہونا ہیں**۔

ط و ع

طَاعَ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کا وسیع ہو جانا۔ طَاعَ لَہُ السَّمَرَاتِ* - چراگاہ اس کے لئے وسیع ہو گئی اور وہ جہاں سے اس کا جی چاہا چرسکا*۔ اس سے ”اطاعت“ کا بنیادی مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی دل کی کشاد سے کسی کام کا کرنا - چنانچہ قرآن کریم میں طُوعًا کے مقابلہ میں کَرًا (۱۱: ۱۱) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا - کَرًا ہٹا کے معنی ہیں کسی کام کو ناگواری اور دل کے جبر سے کرنا - لہذا طُوعًا کے معنی ہونے کسی کام کو بطیب خاطر، دل کی کشاد اور پسندیدگی سے کرنا - اسی لئے اَطَاعَ الشَّيْطٰنُ کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں*۔ (اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑیگا - وہ ٹوٹنے کے لئے خود ہی آمادہ ہیں)۔ اَطَاعَ کسی کے حکم کی بطیب خاطر تعمیل کرنا - اور طَاوَعَتْ اس کی موافقت کرنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی کے ساتھ لگنے اور تابعدار ہو جانے کے ہیں -

اِسْتَطَاعَ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کے لئے جن قوتوں، صلاحیتوں اور اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا۔ اگر ان میں سے کوئی چیز ہے اور کوئی نہیں تو اسے صرف ایک حیثیت سے مَبْسُطِیْعٌ* کہا جائیگا*۔

سورۃ بقرہ میں ہے - وَمَنْ كَتَبَ طَوْعًا خَيْرًا (۱۸۵)۔ اس کے معنی ہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر عمل خیر کرنا۔ اس میں دل کی رضامندی تو بہر حال ہوگی لیکن اس میں اگر تھوڑی سی مشقت بھی اٹھانی پڑے (جو قابل برداشت ہو) تو ایسا عمل خیر بھی کسر لینا چاہئے (سورۃ النحل میں غیر خدائی قوتوں کے متعلق ہے لَا يَسْتَطِيعُونَ (۱۱۱)۔ اس کے معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں۔ یعنی کسی کام کو پورا کرنے کے لئے جن قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے يَرْزُقُكُمْ - عَنِ دَرِيْنِكُمْ اِنْ اِسْتَطَاعُوْا (۲۱۶)۔ اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے بھرا دیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے فَطَطَّوْعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ (۵۱)۔ اس کے جذبات نے اسے اس امر پر آمادہ کر لیا، یا راضی کر لیا۔

قرآن کریم میں قوانین خداوندی کی اطاعت* پر زور دیا گیا ہے۔ درحقیقت سارے قرآن کی تعلیم کا منشا ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ اطاعت کے معنی ہم دیکھ چکے ہیں۔ یعنی کسی کام کو دل کی پوری پوری رضامندی، وسعت اور کشادگی سے کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی مستبد حاکم کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ اپنے دل کی مرضی سے خود اختیار کردہ حدود و قیود (Self-imposed Restrictions) کی پابندی ہے۔ (اسی کو اِسْلَام* کہتے ہیں)۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت نہ زبردستی کرائی جا سکتی ہے نہ اندھے، طور پر کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کتاب (قانون) کے ساتھ حِکْمَت* (اسکی علت غائی۔ اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص علی وجہ البصیرت دیکھ لے کہ ان حدود کی پابندی میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں اور اس کے بعد اپنے دل کی پوری رضامندی سے ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق قرآن، نظام خداوندی قائم کراتا ہے۔ یعنی اس جماعت کے ہاتھوں جس کے افراد، دل کی پوری کشادگی کے ساتھ، علی وجہ البصیرت، اس نظام کے نتائج سے متفق ہوں اور کامل رضامندی سے اس کے قیام

و استحکام کے لئے کوشاں۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم۔ یعنی ہکسے ہوئے پھل کی طرح خود بخود کسی کی جھولی میں گر پڑنا، نہ کہ اسے کھسوٹ کر حاصل کرنا۔ اس کے مقابل میں تَوَلَّیٰ کا لفظ آیا ہے (۳۱)۔ یعنی منہ موڑ لینا یا گریز کی راہیں نکالنا۔ اصل یہ ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں ذرا سا بھی تردد۔ تامل۔ تذبذب۔ ہچکچاہٹ۔ یا کبیدگی خاطر ہو تو اسے اطاعت نہیں کہہیں گے، کیونکہ اطاعت کی بنیاد میں دل کی رضامندی شامل ہے۔ (۴۵) اطاعت کی جاتی ہے، کرائی نہیں جاتی۔ نا دانستہ یا لغزش سے کسی حکم کی خلاف ورزی اور بات ہے، لیکن جو شخص دل کی رضامندی سے نظام خداوندی (اسلام) میں نہ رہنا چاہے اُسے زبردستی نہیں رکھا جاسکتا۔ نہ ہی کسی کو اس کے اندر زبردستی لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے دین میں اکراہ نہیں (۴۹)۔ جو لوگ بطیب خاطر اس نظام کو قبول نہ کریں، وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہیں گے۔ انہیں تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے لیکن اس نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔

سُطَاعٌ (۴۱)۔ جس کی اطاعت کی جائے۔ مَطُوعٌ ع* (۴۶) جو دل کی کشاد سے کسی کام میں لگ جائے۔

سورة مائدہ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے کہا ہَلْ یَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَائِدَةً* (۱۱۲)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کیا خدا ہماری اس عرض کو قبول کر لے گا؟ اس کی تائید میں سورة مؤمن کی یہ آیت لکھی ہے مَا لِلظَّالِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ* (۱۸)۔ یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے۔ سورة کہف میں اسْطَاعَ بَجَائِ اسْتَطَاعَ آیا ہے (۶۷)۔

ط و ف

طَوَفَ* کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں۔ طَافَ۔ اسْتَطَافَ۔ تَطَوَّفَ۔ طَوَّفَ۔ گھومنا۔ چکر لگانا*۔ کسی چیز کے ارد گرد بکثرت چلنا*۔ اَلْمَطَافُ*۔ گھومنے کی جگہ۔ اَلطَّائِفُ*۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لئے پہرہ دے۔ (یہ لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن جمع کے لئے بھی آتا ہے)*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہ معنی لکھے ہیں۔ اَلطَّائِفَةُ*۔ کسی چیز کا ٹکڑہ۔ لوگوں کی جماعت جو ہم آہنگی فکر و خیال یا اشتراک مذہب کی بناء پر متحد ہو اور اس سبب سے دوسروں سے ممتاز ہو**۔ ابن فارس نے

لکھا ہے کہ عرب طائفہ کو کسی معین تعداد میں محدود نہیں کرتے تھے۔ نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بہر حال اس سے تھوڑی اور معمولی مقدار یا تعداد ہی مراد لی جاتی ہے۔ اَلطَّوْفِیُّنَ - ایسا خادم جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے **۔ اَلطَّوْفِیُّنَ - ہمہ گیر موت، وہ مصیبت یا حادثہ جو قوم کو چاروں طرف سے گھیر لے اور ہر شے پر چھا جائے، مثلاً غرقابی، قتل و غارتگری، بارش جو زور دار ہونے کی وجہ سے بستیوں کو بہا لے جائے۔ نیز رات کی سخت تاریکی *۔ قرآن کریم میں قوم حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَآخَذَهُمْ الطَّوْفِیُّنَ (۲۹) انہیں طوفان نے آپکڑا۔

طَافَ - یَطُوفُ کے معنی رفع حاجت کے لئے جانا بھی ہیں *۔

قرآن کریم میں ہے یَطُوفُ عَلَیْہِمْ بِسَکَاسٍ (۳۵) - ان پر دور جام چلایا جائیگا۔ سورہ نور میں ہے طَوَّافُونَ عَلَیْکُمْ بِعِصْمَتِہُمْ عَلَیْ بَعْضٍ (۵۸) - وہ تمہارے ارد گرد پھرتے پھرتے رہتے ہیں۔ سورہ القلم میں ہے - فَطَافَ عَلَیْہِمَا طَافِیۃٌ مِّنْ رَبِّکَ (۶۹) تیسرے رب کی طرف سے ایک آفت ان پر پھر گئی۔ ایک مصیبت طاری ہو گئی۔ ایک حادثہ نے انہیں گھیر لیا۔ سورہ اعراف میں ہے طَافِیۃٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ (۲۶) - اس کے معنی ہیں سرکش جذبات کا کوئی خیال جو یونہی گھومتے گھماتے ذہن میں آجائے۔ طَافِیۃٌ - گروہ اور جماعت کے معنوں میں (۳۹) میں آیا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ خُصَّہ کَعْبَہ طَافِیۃٌ اور عَاكِفِیۃٌ کے لئے مرکزی مقام ہے (۱۲۵) - طَافِیۃٌ کے معنی ہیں نوع انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور عَاكِفِیۃٌ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پروئے رکھے۔ ان کے معاملات کو درست رکھے۔ دنیا کے نظم و نسق میں درستگی اور آراستگی پیدا کرے (دیکھئے عنوان ع۔ ک۔ ف)۔ قرآن کریم نے ملت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے۔ اس مقصد کے لئے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (۱۳۳)۔ لہذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت، طَافِیۃٌ کی جماعت ہے۔ یعنی نوع انسانی کی چوکیداری کرنے والی۔ حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے

خدا سے پوچھا کہ ان کی اولاد میں بھی خانہ کعبہ کی تولیت (اور نوع انسانی کی امامت) کا منصب جاری رہیگا تو ان سے کہہ دیا کہ لَا يَنْتَالُ عَرْشُهُی الظَّالِمِیْنُ (۱۲۳)۔ جو لوگ حقوق انسانیت میں کمی کرینگے وہ اس منصب کے اہل نہیں رہینگے۔

یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ کے اجتماعات میں رکوع و سجود اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہم قوانین خداوندی کی پوری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کسی کے آئین و قانون کے سامنے نہیں جھکتے، اسی طرح حج کے ان مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمارا یہ اجتماع، نوع انسان کی حفاظت کے لئے نظام خداوندی کا عملی نشان ہے۔

طوق

الطَّوْقُ - وہ حلقہ جسے گردن میں ڈال دیا جائے۔ ہر وہ چیز جو کسی کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ راغب نے کہا ہے کہ دراصل طوق اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن میں بنا ہوتا ہے، جیسے قمری کی گردن کا حلقہ۔ یا مصنوعی حلقہ، جیسے سونے چاندی کا گلے میں ڈالا جانے والا حلقہ ہوتا ہے۔ تَطْطَوَّقُ - طوق پہن لینا *۔ طَوَّقَ گردن میں طوق پہنانا۔ (۱۳۹)

الطَّاقَةُ - صاحب تاج العروس، صاحب محیط، راغب اور اقرب الموارد اس پر متفق ہیں کہ الطَّاقَةُ اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے۔ یعنی وہ کام اس پر اتنا شاق گذرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔ اسی سے انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آیا ہے کہ لَا تَحْمِلُنَا مَلًا طَاقَةً لَّنَابِهِم (۲۸۹)۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کر سکیں۔ جن کا کرنا ہمارے لئے دشوار ہو **۔

روزوں کے احکام کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے - وَعَلَى الَّذِينَ يَطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (۱۸۳)۔ اس کے عام طور پر

معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کا فدیہ دیدیں۔ یہ معنی بالبداهت غلط ہیں۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے یا جو فدیہ دے سکتے ہیں روزہ سے مستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کمن پر فرض ہے؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں؟

اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دیدیں۔ اس لئے کہ یُرِّدُ اللّٰهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُسِّرْ بِكُمْ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵)۔ خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، مشقتیں نہیں چاہتا۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب السنار نے لکھا ہے کہ عرب اُتَاقُ الشَّيْئِ اسوقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اسکی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا تحمل ہونا پڑے۔ اَلَّذِينَ يَطِيقُونَہ سے مراد ہیں ضعیف۔ بوڑھے۔ وہ اپنا ہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں*۔ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَتَمَنُّ تَطْتَوُّعٌ خَيْرًا فَهَوُ خَيْرٌ لِلّٰہِ (۲/۱۸۳)۔ جو شخص قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اس میں یَطِيقُونَ اور تَطْتَوُّعٌ کا فرق قابل غور ہے۔ یطیقون سے مراد سخت مشقت ہے اور تطوع سے مراد ایسی اطاعت جس میں ذرا سی تکلیف کا پہلو ہو، (دیکھئے عنوان ط۔ و۔ ع)

ط و ل

طَالَ بِتَطْوُلٍ طُولًا۔ دراز ہونا۔ لمبا ہونا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَطْوَلَ رسی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہے۔ اَفْطَالَ عَلَيْنَاکُمْ الْعَمْدُ (۲/۸۶)۔ وہ عہد جو تم نے مجھ سے کیا تھا، کیا اس پر بہت لمبا عرصہ گذر گیا جو تم نے سمجھ لیا کہ اب اس پر قائم رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کیا مجھے تم سے گٹھے ہوئے اتنا لمبا عرصہ گذر گیا تھا؟ یعنی عہد کے معنی زمانہ کے بھی ہو سکتے ہیں

طَوَّلَ * - وسعت - فراخی - خوش حالی - استطاعت * - (۲۵) - نیز قوت - طاقت * - (۳۰) - تَطَاوَلَ - لمبا عرصہ گذر جانا (۲۵) - سورہ بنی اسرائیل میں پہاڑ کی اونچائی کے لئے یہی لفظ طَوَّلَا آیا ہے (۳۰)۔

طوی

طَوَّلَ الصَّحِيفَةَ يَطْوِيْنَهَا طَيًّا - اس نے صحیفہ کو لپیٹ دیا - اَطْوَى - وَاَنْطَوَى - وہ لپیٹ گیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - مجازاً کہتے ہیں طَوَّلَ عَنِّي الْحَدِيثُ وَالسِّرُّ - یعنی اس نے مجھ سے بات اور راز کو چھپایا - نیز طَوَّلَ الْبِلَادَ طَيًّا - اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا - یعنی راستوں کو لپیٹا - نیز طَوَّلَ اللَّهُ الْبُعْدَ لَنَا - خدا نے ہمارے لئے مسافت کو سمیٹ کر دوری کو قریب کر دیا * - اَلِطْيَةُ - نیت اور مقصد - لیٹنے کی ہنیت - منزل مقصود * - طَوَّلَ اللَّهُ عُمُرَهُ - خدا نے اس کی عمر ختم کر دی - اس کی مدت عمر کو لپیٹ دیا * -

سورة انبياء میں ہے يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ * لِيَكْتُبَ (۲۱) - جس دن ہم سماء کو لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے - اور سورة الزمر میں ہے وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (۳۹) - اس دن (یوم القیمة) میں اَرْض سب کی سب اللہ کے قبضہ میں ہوگی - اور سَمَوَات بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لیٹے ہوئے ہوں گے - ان دونوں مقامات کے ملانے سے بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جب قرآن کے قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہوگا تو اس انقلابی دور میں معاشی ذرائع اور اخلاقی اقدار (اَرْض اور سماء) دونوں کا مرکز ایک ہی ہوگا - یہ دونوں ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہونگے - اس وقت حالت یہ ہے کہ معاشی ذرائع ایسے نظام کے ہاتھوں میں ہیں جس نے اخلاقی اقدار کو الگ رکھ چھوڑا ہے - لیکن اُس دور میں یہ دونوں یک جا ہو جائیں گے اور اس طرح توحید عملاً متشکل ہو جائے گی - اسی لئے اس کے بعد کہا ہے کہ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲) - یہ لوگ جو معاشی نظام اور اخلاقی اقدار کو الگ الگ رکھ کر عملاً شرک کرتے ہیں، خدا ان سے بہت دور اور بہت بلند ہے - لیکن اگر یوم القیمة سے مراد دنیا کا طبعی انجام لیا جائے تو اَرْض و سماء سے مراد طبعی کائنات لی جائیگی -

سورة طہ مین ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کئے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّكَ بِاَلْوَادِ الْمُقَدَّسِ اس سے عقلی طریق تحقیق اور وحی کے عمل۔ انکشاف کا فرق نکھر کر سامنے طویٰ (۲۴)۔ آجاتا ہے۔ عقلی طریق تجرباتی ہوتا ہے جس میں مسافت بڑی لمبی ہوتی ہے۔ لیکن وحی اس مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کر دیتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں (It Economises Human Efforts)۔ عقل کی راہیں بڑی پرہیز و خم ہوتی ہیں۔ وحی صراط مستقیم کے ذریعے سیدھے منزل تک لے جاتی ہے۔ عقل کے تجرباتی طریق سے مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے۔ آپ اس کا ایک حل تجویز کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اس تجربہ میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔ ایک مدت کے بعد جب نتیجہ سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام رہا، وہ حل غلط تھا۔ آپ پھر دوسرا تجربہ شروع کر دیتے ہیں و قس علیٰ ہذا۔ اس طرح عقل کے تجرباتی طریق سے آپ کی مسافت بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ لیکن وحی شروع ہی میں آپ کے سامنے صحیح حل رکھ دیتی ہے اور اس طرح آپ کو ان تمام ناکام تجارب سے بچا لیتی ہے جو آپ کو عقل کے طریق کار کی رو سے کرنے تھے۔ اس طرح سفر حیات میں آپ کی مسافت بہت مختصر ہو جاتی ہے۔ نبی کے سامنے حقیقت اپنے آپ کو خود بخود منکشف کر دیتی ہے۔ اس طرح تلاش حقیقت میں اس کی مسافتیں سمٹ جاتی ہیں۔ لہذا نبوت سے سرفرازی کے معنی یہ ہیں کہ نبی سے عقلی تجربات کے لمبے راستوں کو چھڑا کر اسے ”الواد المقدس طوی“ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں مسافتیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس وادی کو طویٰ کہا گیا ہے۔ راغب نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر طویٰ (کوٹو دری) کے ساتھ ملا دیا جائے جو اس سے پہلی آیت میں ہے تو اس کے (معنی یہ ہوں گے کہ میں نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا۔ یا پھر یہ کہ اس وادی کو دوبار مقدس بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ معنی کچھ دور از کار سے ہیں۔

ط ی ب

طیب*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں وہ چیز جس سے انسان کے حواس بھی لذت باب ہوں اور نفس بھی*۔ یعنی ہر وہ چیز جو

دیکھنے، سننے، سونگھنے، کھانے میں بھی پسندیدہ ہو اور اس سے انسانی نفس بھی کیف اندوز ہو۔ "لَا طَّيِّبٌ" اور "الْمَطَّيِّبُ"۔ پسندیدہ اور بہترین چیزیں۔ "الطَّشُوْبُ"۔ یہ مصدر بھی ہو سکتا ہے اور "طَّيِّبٌ" کا مؤنث بھی۔ معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدہ اور دائمی خوش حالی کی زندگی۔ خوش بختی۔ طَعَامٌ طَّيِّبٌ۔ وہ کھانا جو حلق میں سہولت سے اتر جائے۔ مَاءٌ طَّيِّبٌ۔ خوشگوار پانی۔ الطَّيِّبُ۔ خوشبو*۔

طَابَتْ اِلَآرْضٌ طَيِّبًا۔ زمین زرخیز ہو گئی۔ اس پر گھاس اُگ آئی*۔ قرآن کریم میں ہے وَالْبَلَدِ الطَّيِّبِ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ (۵۸) زرخیز زمین سے خدا کے قانون کے مطابق سبزی اُگتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں خَبِيثٌ کا لفظ آتا ہے۔ وَالَّذِي خَبِثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (۵۸)۔ اور جو زمین نکمی ہو اس میں (اول تو سبزہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے) تو بہت تھوڑا۔ یہاں سے طَّيِّبٌ اور خَبِيثٌ کے معنی واضح ہو جانے ہیں۔ اسی طرح سورہ ابراہیم میں شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اسکی جڑیں زمین میں مضبوط ہوتی ہیں اور شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی۔ اور وہ ہمیشہ ثمربار رہتا ہے۔ اس کے برعکس شَجَرٌ خَبِيثٌ وہ ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ذرا سا جھٹکا اسے اکھاڑ پھینکے (۲۴، ۲۶)۔

سورہ سبا میں بَلَدَةٌ طَيِّبَةٌ (۳۵) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے دائیں بائیں باغات ہوں اور اس میں سامانِ رزق کی فراوانی ہو۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم مومنین کو حَيَاةٌ طَيِّبَةٌ (۱۶) عطا کرنے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہوں۔ جس میں انہیں تمام عمدہ اور پسندیدہ چیزیں مافراط میسر ہوں۔ ایسی چیزیں جن سے حواس اور دل دونوں لذت یاب ہوں۔

حلت و حرمت کے متعلق قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حلال ہے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیدیا ہے۔ لیکن اس نے حلال کے ساتھ طَّيِّبٌ کا بھی اضافہ کیا ہے (کُلُوا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا) (۱۶۸)۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں خوشگوار اور پسندیدہ ہوں وہ کھاؤ۔ لہذا ان چیزوں کو چھوڑ کر

جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، دنیا کی ہر خوشگوار چیز سے متمتع ہوا جا سکتا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ نہ تو کوئی شخص کسی حلال شے کو حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر حلال شے کو بالضرور کھائے ۔ اگر کوئی حلال شے کسی کو مرغوب نہیں یا نقصان دہ ہے تو اس کے لئے کسی قسم کی مجبوری نہیں کہ وہ اسے ضرور کھائے ۔ وہ جس چیز کو خوشگوار سمجھے اسے کھائے ۔ اس معاملہ میں نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے نہ کسی انسان کی طرف سے کوئی جبر ہونا چاہئے ۔

فَعَمِلْتَ بِيَطِيبَةً نَّفْسِيْ كے معنی ہیں میں نے اسے کسی خارجی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے کیا ہے * ۔ سورہ نساء میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النَّسَاءِ (۴)۔ جن عورتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان میں سے اپنی پسند کے مطابق (جو تمہیں خوش آئند نظر آئیں) اپنے نکاح میں لاؤ۔ نکاح کے لئے پسندیدگی اور دل کی رضامندی ضروری ہے ۔ رضامندی (دل کی خوشی) کے معنوں میں اس سے ذرا آگے ہے ۔ فَانْ طِيبْنَ لَكُمْ (۵) وہ اگر دل کی رضامندی سے تمہارے لئے کچھ چھوڑ دیں ۔ سورہ آل عمران میں ذُرِّيَّةٌ طَيِّبَةٌ (۳) کہا گیا ہے ۔ ایسی اولاد جو دل و دماغ ، اخلاق و اطوار اور جسمانی صحت ہر لحاظ سے خوش آئند ، اور ماں باپ کے لئے سکون قلب کا باعث ہو ۔

مومنین کی کامرانی کے متعلق کہا گیا ہے طُوبٰی لَہُمْ (۱۳) ۔ ان کے لئے ہر قسم کی خوشگواریاں اور سعادت مندیاں ہیں ۔ کتنا جامع ہے یہ لفظ جس میں جنت کی ساری وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں ۔

ط ی ر

طَارَ - يَطِيرُ طَيْرًا - پرندہ کا اپنے پروں کے ساتھ ہوا میں حرکت کرنا ۔ اُڑنا (۱۸) - اَطَارَهُ - طَيَّرَهُ - اُڑا دینا ۔ یا کسی کو لے اُڑنا - اَلطَّيْرُ - طَائِرٌ کی جمع ہے لیکن اس کا اطلاق واحد پر بھی ہو جاتا ہے (۳۸) - جمع کے طور پر یہ لفظ (۱۹) میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ہوا میں ہلکا ہونے کے ہیں ۔ اس کے بعد استعارہ اس کا استعمال ہر تیزی کے لئے ہوتا ہے ۔ اِسْتَطَارَ - کسی چیز کا متفرق اور منتشر ہو جانا * - اَلْمُسْتَطِيرُ - بلند اور منتشر - ہوا میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والا ۔ جس سے ساری فضا متاثر ہو چکی ہو - (۲۶) - اَلطَّائِرُ - دماغ - ہر

چیز جس سے نیک یا بد شگون لیا جائے*۔ دماغ کی رعایت سے مجازاً اس کے معنی بلند پرواز انسان کے لئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ اِنِّیْٓ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الطَّیْرِ کَہَیْمَۃَ الطَّیْرِ..... (۳۸)۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند بناتا ہوں“۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے لئے اسی آب و گل سے ایسے نظام نوکی تخلیق کروں گا جس سے تم اپنی اس موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال کشا ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ (آپ اناجیل میں دیکھئے۔ حضرت مسیحؑ کا انداز تبلیغ یہ تھا کہ آپ تمثیلات اور استعارات میں حقائق بیان کیا کرتے تھے۔)

الطَّائِرُ کے معنی نحوست (اعمال کے تباہ کن نتائج) یا شامت اعمال کے بھی لئے جاتے ہیں*۔ الطَّائِرُ - عربوں کے نزدیک بخت یا نصیبہ کو بھی کہتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں اسے اعمال نامہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کَتَلَ اِنْسَانَ الَّذِیْ مِنْہُ طَیْرٌ فِیْ عُنُقِہٖ (۱۳۰)۔ اس میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے۔ اس لئے بھی کہ عمل سے پہلے تو انسان کو اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اسے اس کا اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے لے (یعنی اس کے نتیجہ سے بچ جائے)۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسکی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کا نتیجہ تو اس انسان سے جدا نہیں ہوتا۔ الطَّیْرُ - بری فہال سے جو بد شگونی لی جاتی ہے۔ تَطْیَرُ بِہِمْ وَمِنْہُ وَاطْیَرُ۔ اس نے اس چیز سے بد شگونی لی*۔ (۱۸۷-۱۸۸) و (۲۰۷) میں بد شگونی کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اس کے سوا ”شگون“ کی کوئی حقیقت نہیں۔

فَرَسٌ مُّطَارٌ - طَیَّارٌ - ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا**۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر جینؑ۔ انسؑ اور طَیْرؑ پر مشتمل تھے۔ جینؑ سے مراد وحشی فہائل ہیں۔ انسؑ مہذب آبادیاں۔ اور طَیْرؑ تیز رفتار گھوڑے (رسالے)۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے وَالطَّیْرُ مَحْشُورٌ (۳۸)۔ اس کے پاس نہایت تیز رفتار گھوڑوں کا لشکر جمع تھا۔

حضرت سلیمانؑ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ عَلَیْہِمْ مِّنَّا مَظْطِیقُ الطَّیْرِ (۲۶) اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہمیں الطیر کی بولی سکھائی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط سکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح سورہ (نمل) میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَتَذَقُّذُ الطَّیْرِ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهَدْدَ هَدْدَ (۲۷)۔ اس میں طَیْرؑ انہی تیز رفتار گھوڑوں (کے رسالوں) کے لئے استعمال ہوا ہے۔ هَدْدُ هَدْدُؑ انہی رسالوں کے ایک رسالدار کا نام تھا (اس زمانہ میں پرندوں کے نام پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے تھے جیسا کہ تورات - کتاب سلاطین سے ظاہر ہے)۔ نیز لسان العرب میں ہے کہ هَدْدُ هَدْدُؑ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اسی رعایت سے اس کے ہر فرد کو ہد ہد کہا جاتا تھا، جیسے قزلباش ایک قبیلہ کا نام ہے لیکن اس قبیلہ کے افراد کو بھی قزلباش کہتے ہیں۔

ط ی ن

الطَّیْنُ* - گیلی مٹی*۔ راغب نے کہا ہے کہ الطَّیْنُؑ ہسانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں خواہ اس سے ہسانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یعنی اگر وہ قدرے خشک ہو جائے تو بھی اسے طَیْنُؑ کہہ دیا جائیگا**۔ الطَّیْنَةُ* - ایسی مٹی کا ٹکڑہ۔ نیز یہ ایک قسم کی ٹھوس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس سے دستاویز وغیرہ پر مہر لگائی جاتی ہے۔ نیز مجازاً انسان کی جبلت اور فطرت کو بھی کہا جاتا ہے*۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) تعالٰی نے فقہ اللغة میں کہا ہے کہ طَیْنُؑ (مٹی) جب خشک ہو تو اسے صَلْصَالُؑ کہتے ہیں۔ جب آگ میں پکی ہوئی ہو تو اَلْفَخْخَارُؑ کہلاتی ہے۔ اور جب گارے کی طرح چپچی ہو تو وہ لَا زَبُؑ کہلاتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے بَدَا خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِّنْ طِیْنٍ (۳۲)۔ تخلیق انسانی کی ابتدا طَیْنُؑ سے ہوئی ہے۔ (اسکی تفصیل کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" - عنوان انسان دیکھئے۔ نیز عنوان ص۔ ل۔ ص۔ ل) حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ میں تمہیں طَیْنُؑ سے طنائیرؑ بنا دوں گا (۳۸) تو اس سے مفہوم خاک نشینی کی ہست حالت سے نکال کر عروج و پرواز عطا کر دینا تھا۔ (دیکھئے عنوان ط۔ ی۔ ر۔)

ظ

ظ ع ن

ظَلَعَنَ - يَظْلَعُنَ* - ظَلَعْنَا - کسی مقصد کے لئے سفر کرنا - ہانی کے لئے ، چراگاہ کی تلاش میں ، ایک چشمہ سے دوسرے چشمے کی طرف یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جانا - ظَاعِنٌ* - سفر میں جانے والا ، مسافر - الظَّاعِيَةُ* - وہ ہودج جس میں کوئی عورت سوار ہو - یا خود وہ عورت جو اس میں سوار ہو - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ کنایۃ عورت کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں نہ ہو - الظَّاعُونُ* - وہ اونٹ جسے سفر کے لئے تیار کیا جائے - (ابن فارس) - الظَّاعِيَةُ* - حالت سفر* - سورة نمل میں ہے يَوْمَ ظَلَعْنِيَكُمْ* (۸۶) سفر کے دن - (بمقابلہ اقامۃ*) -

ظ ف ر

الظَّفَرُ* - الظَّفَرُ* - انسانوں اور دوسرے جانوروں کا ناخن - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غیر شکاری جانوروں کے ظَفَرٌ* ہوتے ہیں اور شکاری جانوروں کے مِخْلَبٌ* (پنچہ) - آلا ظَفَرٌ* - لمبے چوڑے ناخنوں والا - ظَفَرَةٌ* - اس نے اس کے (چہرے میں) ناخن گاڑ دیا - الظَّفَرَةُ* - ایک ہودا جو زمین سے نکلنے وقت ناخن کے مشابہ ہوتا ہے** -

قرآن کریم میں ہے وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظَفَرٍ (۱۳۷) - اور ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دئے تھے - یہ ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا کے تھا (جَزَّيْنَاهُمْ بِمَغْفِرَتِهِمْ* (۱۳۷) - قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ذی ظَفَرٍ کا ذکر نہیں - الظَّفَرُ* - کامیاب ہونا - مطلوب کو پا لینا** - راغب نے لکھا ہے کہ یہ مفہوم دراصل ناخن گاڑ دینے سے لیا گیا ہے (اس لئے کہ جس چیز میں پنچہ

کاڑ دیا جائے وہ قبضہ میں آجاتی ہے)***۔ آ لَا ظِلْفَتَارُ۔ کامیاب کر دینا۔ سورۃ فتح میں ہے مِّنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَ كَيْدَهُمْ عَلَيْهِمْ (۴۸)۔ اس کے بعد کہ تمہیں انپر غالب کر دیا۔ ان کے مقابلے میں کامیاب بنا دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں قہر۔ کامیابی۔ غلبہ اور قوت شامل ہیں۔

ظ ل ل

الْظِّلُّ۔ (جمع ظِلَالٌ*) سایہ۔ دھوپ نہ ہونا۔ عام طور پر جو سایہ مغرب کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب تک کے وقت کا سایہ) وہ ظِلُّ کہلاتا ہے اور جو مشرق کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب کے بعد مغرب تک کے وقت کا سایہ) اسے قیٰء* کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کو چھپا لینا۔

چونکہ عرب کا ملک نہایت گرم ہے اور درختوں کی وہاں بہت کمی ہے اس لئے ان کے ہاں سایہ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے۔ اس بنا پر وہ راحت و آسائش کی ہر چیز کو کثایۃ ظیلؑ سے تعبیر کرتے ہیں**۔ حتیٰ کہ جنت کو بھی ظیلؑ کہتے ہیں۔ اور عزت۔ حفاظت۔ ہر قسم کی خوش حالی اور مرفہ الحالی کو بھی۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ رَفِیْ ظِلَالٍ وَ عِیُّوْنَ (۲۶)۔ ظِلَالٌ ظِلَالًا۔ گھنا سایہ۔ بہت زیادہ آسائشیں (۲۷)۔ اُكْلُهُمْ دَائِمٌ وَ ظِلَافُهُمْ (۱۳)۔ ہُمُ وَ اَزْوَاجُهُمْ رَفِیْ ظِلَالٍ (۳۶) میں زندگی کی آسائشیں اور خوشگواریاں مراد ہیں۔ اَظْلَافُہُمْ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ اس نے میری حفاظت کی اور بڑی عزت سے رکھا*۔

ظِلُّ۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے۔ ہر وہ چیز جو کسی کو ڈھانک لے اور اس پر سایہ فگن ہو۔ یہ اچھے اور برے دونوں موقعوں کے لئے عام ہے***۔ اَلْظِّلَالُ مِّنَ الْبَحْرِ۔ سمندر کی بڑی بڑی موجیں۔ اَلْظِّلَالُ وہ پانی جو درختوں کے سایہ تلے ہو*۔ ظِلَّةٌ (جمع ظِلَالٌ*)۔ ہر ڈھانپ لینے والی چیز*۔ نیز بدلی جو سایہ ڈالے*۔ راعب نے کہا ہے کہ اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قوم شعیب کے عذاب کے متعلق ہے۔ فَاتَّخَذَہُمْ عَذَابٌ یَّوْمٍ الظِّلَّةِ (۲۸۶)۔ انہیں اس دن کے عذاب نے پکڑ لیا جب اوپر سے آجائے والی چیز نے انہیں ڈھانپ لیا تھا۔ جس دن ان کے اعمال کے نتائج ان پر پوری طرح چھا گئے تھے۔

ظَلَّ * يَفْعَلُ كَذَا کے معنی ہیں وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا*۔
 سورة شعراء میں ہے کہ قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا فَتَنْظِلْ لَّهٗمَا كَيْفَيْنِ (۲۱)۔ ہم ہمیشہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے رہیں گے۔ سورة النحل میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا (۱۸)۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ سورة الحجر میں ہے وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلَّوْا فِيْهِ يَعْزُّجُوْنَ (۱۵)۔ ”اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں“۔ ان مثالوں میں مداومت اور استمرار کا پہلو غالب ہے۔ یعنی ہمیشہ ایسا ہوتا ہے یا ایسا ہوگا۔ اس کی بعض شکلوں میں ایسک ہی لام رہ جاتا ہے۔ مثلاً فَظَلَّتُمْ تَفْكِكُمُ (۵۶) ”تم ہشیمان ہو جاؤ گے“۔
 ظِلَّ بِمُقَابَلَةِ حَرٍّ وَرُ (گرمی)۔ (۳۵) میں آیا ہے۔ ظُلِّلَ مِّنَ النَّارِ (۳۹)۔ آگ کے شعلوں کو کہا گیا ہے جو چھا جائیں یا ڈھانپ لیں۔
 فَظَلَّلَتْ اَعْنَاقَهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ (۲۱) کے معنی ہیں ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔

ظ ل م

ظَلَمَ * کے بنیادی معنی ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا۔ حد سے تجاوز کرنا۔ بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نقص اور کم کرنے کے آتے ہیں۔ اور اسام راغب نے کہا ہے کہ ظَلَمَ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت اور اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ کسی چیز کا توازن بگاڑ دینا**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) تاریکی (۲) حد سے تجاوز کر کے کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا، بتائے ہیں۔
 پہلے معنی (یعنی کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا) کے اعتبار سے مَظْلُومَۃ * اس چیز کو کہتے ہیں جسے کوئی زبردستی دوسرے سے چھین کر لے جائے۔ اَلْظَّالِمُ (جمع اَلْظَّالِمُوْنَ اَلْظَّالِمِيْنَ اَلْظَّالِمَةُ) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کو دبا لیں***۔
 ظَلَمَ فُلَانًا۔ حَقَّقْهُ، فُلَانٌ کا حق کم کیا۔ اسی سے ہے لَمْ تَظْلِمْ مِثْلَهُ شَيْئًا (۱۸)۔ اور انہوں نے اس میں کچھ کمی نہیں کی***۔ اس نہج سے ظَالِم * کے معنی ہیں حقوق انسانیت میں کمی کرنے والا۔ دوسروں کے واجبات کو پورا پورا نہ دینے والا۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کے معانی میں یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً عربوں میں ایک مثل ہے کہ مَنَ اسْتَرَعَى الذُّنْبَ فَقَدْ ظَلَمَ۔ جس نے بھیڑے سے توقع کی کہ وہ گلہ کی نگہبانی کرے گا، اس نے ظلم کیا۔ یعنی بھیڑے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا۔ یا ظَلَمَ الْاَرْضَ اس وقت کہتے ہیں جب زمین کو ایسے مقام سے کھودا جائے جہاں سے اسے کھودنا نہیں چاہئے تھا۔ اس قسم کی زمین کو مَظْلُومٌ مَتَّہٌ کہتے ہیں۔ ظَلَمَ الْبَحْرُ اس نے اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے یونہی ذبح کر دیا۔ ظَلَمَ الْوَادِي اس وقت کہتے ہیں جب پانی اس مقام تک پہنچ جائے جہاں تک وہ اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ (اس اعتبار سے ظَلَمَ کے معنی حدود شکنی اور تجاوز کے ہوں گے)۔ نیز ظَلَمْتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے وقت سے پہلے ہی استعمال کر لیا۔ الظَّالِمَةُ والمَظْلُومَةُ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے جمنے کے لئے رکھا جائے اور دھبی بننے سے قبل ہی پی لیا جائے*۔

الظَّالِمَةُ اور الظَّالِمَةُ کے معنی ہیں اندھیرا۔ تاریکی۔ (جمع ظالِمَت)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا (یعنی اس جگہ روشنی کا نہ ہونا جس کو روشن رہنا چاہئے تھا)*۔ اس نہج سے اَمْرٌ مَظْلَمٌ اس معاملہ کو کہتے ہیں جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اسے کہاں سے گرفت میں لیا جائے۔ یعنی تاریک اور غیر واضح معاملہ، اور یَوْمٌ مَظْلَمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ ظَلَمَاتُ الْبَحْرِ کے معنی ہیں شدائدُ الْبَحْرِ (سمندر کی مشکلات)*۔ شَعْرٌ مَظْلَمٌ نہایت سیاہ بالوں کو کہتے ہیں، اور نَبْتُ مَظْلَمٌ ایسے بودے کو جو گہری سبزی کی وجہ سے سیاہی کے قریب پہنچ جائے*۔

قرآن کریم میں ظَالِمِیْن کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے معنی ہیں قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والے، حقوق انسانیت میں کمی کرنے والے، دوسروں کے واجبات کو پورا پورا ادا نہ کرنے والے، دوسروں کی محنت کو اپنے مصرف میں لیے آنے والے، دوسروں پر زیادتی کرنے والے، اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما میں کمی کرنے والے۔

سورہ بقرہ میں ہے وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يَتُوفَّا إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۲۴۴)۔ تم اپنے مال میں سے جس قدر بھی نوع انسانی

کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف لوٹا دیا جائیگا۔ یعنی جو کچھ تم نے دیا ہے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائیگی۔ یہاں لَا يَظْلِمُونَ کا مفہوم يَتَوَفَّى إِلَيْكُمْ نے واضح کر دیا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے۔ ثُمَّ تَتَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يَظْلِمُونَ (۲۸۱)۔ یہاں بھی تَتَوَفَّى کے مقابلہ میں لَا يَظْلِمُونَ لا کر بات واضح کر دی۔ سورہ کہف میں باغات کی مثال میں ہے۔ آتَتْ أُكْهُمَا وَلَهُمْ تَطْلِيمٌ مِنْهُ شَيْئًا (۱۸)۔ وہ اپنے پھل (پورے پورے) دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔ مَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَآءٌ وَلِلَّهِ هَمُّ الشَّيْطَانِ (۲۲۹)۔ جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ ظالمین کی یہ بڑی جامع تعریف (Definition) ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین، قوانین خداوندی ہی کی رو سے ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت میں غصب کرتا ہے۔ لہذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظالم ہے کیونکہ وہ حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جو حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی کسی چیز میں کمی کر رہا ہوں اور اپنے ہاں اضافہ۔ لیکن درحقیقت وہ شخص خود اپنی ذات (نفس) کی نشوونما میں کمی کرتا ہے۔ وَلَٰكِنَّ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۱۶)۔

چونکہ حقوق انسانیت میں کمی کر دینے سے معاشرہ کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے اور خود انسانی ذات کا توازن بھی قائم نہیں رہتا اس لئے قرآن کریم میں ظلم کو سُوء کا مرادف قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں حُسْن کا لفظ آیا ہے (۲۱)۔ ”حسن“ تناسب و توازن کی بہترین شکل کا نام ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ میں نُور کے مقابل میں ظلمات کا لفظ آیا ہے (۲) جس کے معنی تاریکیاں ہیں۔ نُور وحی خداوندی ہے اور ظلمات ذہن انسانی کی پیدا کردہ توہم پرستیاں اور غلط اندیشیاں۔ وحی کی تعلیم ایک ہی ہوتی ہے، لیکن ذہن انسانی کی پیدا کردہ تاریکیاں مختلف قسموں کی ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نُور کی جمع کہیں نہیں آئی لیکن ظلمات بطور جمع آیا ہے۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ افسانے مختلف ہوتے ہیں۔

آیت (۲۴) میں اَضَاءَ کے مقابلہ میں اَظْلَمَ کا لفظ آیا ہے۔ اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریکی ہو جانا اور تاریک کر دینا۔ نیز تاریکی میں داخل ہو جانا۔ چنانچہ مَظْلِمُونَ کے معنی ہیں اندھیرے میں رہ جانے والے (۳۶)۔ سورہ انبیاء میں ظَلُمْتَ کا لفظ ایسے مصائب و مشکلات کے معنوں میں آیا ہے جن کا حل انسان کو سچھائی نہ دے (۲۱)۔

سورہ ابراہیم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَقَلْبُومٌ كَفَّارٌ (۱۴)۔ یعنی انسان اگر وحی کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا رہے تو اسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور جو کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے اسے دبا دبا کر، چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، وحی کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے نوعِ انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھو اور کسی کے حقوق میں کمی نہ کرو۔ ظَلُومٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ اسی طرح ظَلَامٌ کے بھی یہی معنی ہیں۔ (۱۸۱)۔ قطعاً ظلم نہیں کرتا۔

دنیا میں جہاں جہاں ظلم ہو رہا ہو، خواہ اسکی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس ظلم کو مٹانا اور اسکی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا، یہ ہے قرآنی تعلیم کا منشا۔

ظ م ا

ظَمِئٌ - يَظْمُنُ - ظَمْنًا - ظَمًا - پیاسا ہونا - یا سخت پیاسا ہونا۔ ظَمِئٌ - ظَمْنَانٌ - پیاسا (۲۶)۔ ظَمًا - پیاس (۱۳۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مرجھا جانے اور کم آب ہو جانے کے ہیں۔ ”آدم“ کی جنت کے متعلق ہے کہ لَا تَقْطُمُوا فِیْہَا (۱۱۸)۔ تو اس میں پیاس محسوس نہیں کرتا۔ پانی بافراط ملتا ہے۔ پانی کی کمی اور فراوانی کی اہمیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صحراؤں کے رہنے والے ہی لگا سکتے ہیں جن کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہوتا ہے۔ ان کے لئے پانی کی قلت سب سے بڑی مصیبت اور پانی کی فراوانی سب سے بڑی خوش حالی ہوتی ہے۔ جنتی معاشرہ میں کسی کو بنیادی ضروریاتِ زندگی (کھانا پینا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) کے لئے جگر پاش مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں، نہ ہی ان سے کوئی محروم رہتا ہے۔ (۱۱۸)۔ اَلْظَّمُّ - دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ *۔

ظ ن ن

ظَنُّوا (جمع ظُنُونٌ)۔ غیر یقینی عقیدہ کے دونوں سروں میں سے جو زیادہ قوی ہو اسے ظَنُّوا کہتے ہیں۔ ظَنُّوا واضح اور صاف صاف یقین نہیں ہوتا۔ صاف یقین کو عِلْمٌ کہتے ہیں۔ مناوی نے کہا ہے کہ ظَنُّوا اس راجح عقیدہ کو کہتے ہیں جس میں احتمالِ نقیض ہو۔ نیز یہ شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ صاحب لطائف اللغات نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اور ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہ دونوں لکھے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کے علامات سے جو نتیجہ (Inference) حاصل کیا جائے اسے ظَنُّوا کہتے ہیں۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو نتیجہ سے عِلْمٌ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور جب بہت کمزور ہوں تو ان سے مستنبط نتیجہ وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ کبھی کبھی یہ لفظ علم کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے*۔

آپ نے اوپر دیکھا ہے کہ اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ ظن کا لفظ ایک طرف شک اور قیاس کے معنوں میں آتا ہے اور دوسری طرف علم اور یقین کے معنوں میں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے۔ قرآن کریم نے (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا) ظن کا لفظ علم اور یقین اور حق کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے ظن کبھی علم اور یقین کے معنوں میں نہیں آسکتا۔ دراصل (جیسا کہ راغب نے کہا ہے) جب کسی حقیقت کے متعلق پورا یقین نہ ہو تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ انسان کبھی حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں پہلوؤں کو ظن کہتے ہیں۔ راغب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب اس کے بعد آن یا آن آئے تو اس میں علم کی طرف رجحان غالب رہتا ہے اور وہ تقریباً یقین کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسکی مثالوں کے لئے دیکھئے (۲۶)؛ (۲۹)؛ (۳۰) وغیرہ۔

یقین اور قیاس کے ملے جلے پہلو کے اعتبار سے الظَّنُّونُ اس باشرف عورت کو کہتے ہیں جس سے باوجود زیادہ عمر ہونے کے شادی کر لی جائے اور یہ امید ہو کہ اس سے اولاد ہو سکتی ہے۔ نیز اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس میں پانی ہے یا نہیں۔ نیز اس قرضے کو الدَّيْنُ الظَّنُّونُ کہتے ہیں جس کے متعلق اطمینان نہ ہو کہ قرضہ لینے والا اسے ادا کریگا یا نہیں**۔

* تاج و راغب۔ ** تاج و محیط۔

قرآن کریم میں لفظ ظُنُّوْنَ قیاس آرائیوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وَتَظُنُّوْنَ بِآلِہِ الظُّنُوْنَ نَا (۳۳)۔ ”اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے گمان اور قیاس آرائیاں کرنے لگ گئے“۔ یعنی تمہارے دل میں یقین کے بدلے شکوک اور وساوس پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ سورۃ بقرہ میں ظُنُّوْنَ بمقابلہ عَلِمُوا آیا ہے۔ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ إِلَّا آسَانِیَّہٌ وَّانْ هُمْ إِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲۸)۔ ”وہ کتاب کو اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ محض (ناظرہ) پڑھ لیتے ہیں۔ وہ صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں“۔ سورۃ النساء میں ہے مَا لَہُمْ بِہِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتَّبَاعَ الظُّنِّ (۱۵۷)۔ انہیں اسکی بابت یقینی علم نہیں، وہ محض ظن کے پیچھے چلتے ہیں۔ سورۃ یونس میں ظُنُّوْنَ بمقابلہ حَقِّ آیا ہے۔ اِنَّ الظُّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنْ الْحَقِّ شَیْئًا (۶)۔ ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

دین کی ساری عمارت علم اور یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ کے متعلق آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت خدا کا کیا حکم ہے تو آپ کے اعتقاد و عمل کی ساری عمارت متزلزل رہیگی۔ اس لئے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اسی لئے لیا ہے (۱۵) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے خدا نے نازل کیا تھا۔ رسول اللہ نے اسی قرآن کریم کو مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اسکے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے دین میں صرف قرآن کریم یقینی ہے۔ اور سب ظنیات ہیں۔ اور اِنَّ الظُّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنْ الْحَقِّ شَیْئًا (۶) خدا کا ارشاد ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دین نہیں ہو سکتی۔ دین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ خارج از قرآن، جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہوں انہیں صحیح مانا جا سکتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں وہ غلط ہونگی۔

الظَّالِمَۃُ تہمت کو کہتے ہیں۔ الظَّالِمَۃِینَ متہم شخص، جس سے بدگمانی کی بنا پر عداوت رکھی جائے*۔

ظہر

الظَّہْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا بیرونی اور بالائی حصہ (اندونی حصہ کی ضد)۔ انسان کے جسم کا شانوں سے لیکر سرین کے اوپر تک کا حصہ

پیٹھ - پشت) - سواری کو بھی کہتے ہیں - اور مال کثیر کو بھی جو نمایاں طور پر نظر آجاتا ہے - الظَّهِيرَةُ* - مددگار - پشت پناہ* -

ظہیریؑ وہ فالتواونٹ جسے سفر میں احتیاطاً (بطور Extra) ساتھ رکھ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑ جائے تو اسے استعمال کر لیا جائے - یعنی اس کی حیثیت مقدم نہیں ہوتی ، ثانوی ہوتی ہے - اسی سے اس کے معنی کسی کو پس پشت ڈال دینے یا نظر انداز کر دینے کے آتے ہیں - اتَّخَذَ حَاجَتَهُ ظَهِيرًا - اس کی ضرورت کو ناقابل توجہ سمجھا* -

ظَهَرَ الشَّيْءُ* - چیز ظاہر ہو گئی - نمایاں ہو گئی - ابھر کر سامنے آگئی - واضح ہو گئی* - ظَهَرَ عَلَيَّ* - اس نے میری مدد کی - ظَهَرَ بِي* - ظَهَرَ عَلَيْهِ* - اس پر غالب آگیا - ظَهَرَتْ الْبَيْتَ* - میں مکان کے اوپر چڑھ گیا - ظَهَرَ عَلَيَّ السَّيْرُ* - وہ راز سے واقف اور مطلع ہوا - أَظْهَرَ عَلَيْهِ* - اسے اس پر غالب کر دیا - أَظْهَرَ* - زوال آفتاب کا وقت ، یہ ظَهِيرَةُ الشَّمْسِ* (دھوپ کی سخت تپش اور حرارت) سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے* - أَظْهَرَ* - ظہر کے وقت میں داخل ہونا - (۳۸) - ظَاهَرَ وَتَظَاهَرَ عَلَيْهِ* - اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی - أَظْهَرُ* - مددگار - (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) أَظْهَرُ مِنْ الْمَرَاةِ* - خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت - عربوں میں زنا شوقی کے تعلقات منقطع کرنے کے لئے ایسا کہا جاتا تھا* -

ظَاهِرُ الْجَبَلِ* - پہاڑ کی چوٹی یا بالائی حصہ - الظَّاهِرَةُ* - اونچی زمین* - کسی چیز کے زیادہ ہونے ، عام ہونے اور پھیل جانے کو بھی ظَهَرَ کہتے ہیں** -

قرآن کریم میں ہے تَظَاهَرُواْ عَلَيْهِمْ* (۸۵) - تم ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو - سورة المومن میں ہے ظَاهِرِيْنَ فِيْ الْاَرْضِ (۲۹) - ملک میں غالب قوم - سورة زخرف میں ہے - مَعَارِجَ عَلَيْهِمَا يَتَظَاهَرُوْنَ* (۳۳) - سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں - اور سورة نور میں ظَهِيرَةُ* کا لفظ (گرمی کی) دوپہر کے لئے آتا ہے (۲۸) - سورة احزاب میں تَظَاهَرُواْ (۳۳) کے معنی ہیں بیوی کے متعلق ظہیر* کا اعلان کر دینا - اس کا اعادہ (۳۸) میں ہوا ہے - سورة نور میں ہے لَمْ يَتَظَاهَرُواْ عَلٰی عَوْرَاتِ النَّيْسَاءِ (۲۴) - وہ ہورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہیں - سورة جن

میں ہے فَلَا يَظْهَرُ عَلٰی غَيْبِهِ أَحَدًا (۴۶) - وہ اپنے غیب سے کسی کو مطلع نہیں کرتا - سورۃ بقرہ میں أَبْوَآبٌ (دروازوں) کے مقابلہ میں ظُہُورٌ (پچھواڑے) آیا ہے (۲۸۹) - یعنی مکان کی پشت کی طرف سے -

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ وَلَا يَبْدِيَنَّ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِمَا ظَهَرْنَ مِنْهَا (۲۴) - وہ اپنی زینت (آرائش) کی چیزوں کی نمائش نہ کریں، بجز ان کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائیں - اسے مثال دیکریوں سمجھا دیا کہ وَلَا يَضُرُّنَّ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفَيْنَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (۲۵) - اور وہ اپنے پاؤں کو (زمین پر) اس طرح مار کر نہ چلیں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت کی اشیاء سے چھپائے ہوئے ہیں ان کا دوسروں کو علم ہو جائے - ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ آواز دار زیور ہے جسے ہنڈلیوں پر پہنا جاتا ہے اور جو معمولاً ڈھنپا رہتا ہے - اس کی نمود کا طریق یہ ہے کہ زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلا جائے جس سے اس زیور (چھاگل - جھانجن وغیرہ) سے آواز پیدا ہو جائے - یہ وہ اشیائے زینت ہیں جو شلوار وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہیں - باقی رہیں وہ اشیائے زینت جو اوپر کے حصے میں پہنی جاتی ہیں، سو ان کے لئے کہہ دیا کہ وَلْيَضُرَّ بَنَ يَخْمُرْنَ عَلٰی جُثُوْبِهِنَّ (۲۶) - وہ اپنے سر کی چادروں کو جیب گریبان (سینے پر) ڈال لیا کریں - دوسری جگہ ہے يَدْنِيْنَ عَلَيْنَهُنَّ مِنْ جَلَالِ يَمِيْنِهِنَّ (۳۳) - وہ اوپر اوڑھے ہوئے (یا اور کوٹ کی طرح پہنے ہوئے) کپڑے کو جسم کے ساتھ لگائے رکھیں -

ان اشیائے زینت کے اظہار کی ممانعت، باہر کے لوگوں سے ہے - اپنے گھر کے لوگوں سے نہیں - (۲۴) - اب رہیں وہ چیزیں جو خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں تو انکی مثال ہاتھ کی انگوٹھی یا کنگن کی سمجھئے - ہا ناک کے کسی زیور کی - اس لئے کہ اوڑھنی یا جلباب سے ہاتھ اور چہرہ بہر حال کھلے رہتے ہیں اور قرآن نے انہیں چھپانے کا حکم نہیں دیا - بلکہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں - انہیں بے باک نہ ہونے دیں (يَغْضُضُوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ ۲۳۱-۲۳۲) تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہ نہیں کہ چہرہ کو بھی چھپایا جائے - اس لئے کہ اگر عورتیں اپنے چہرے کو بھی چھپا کر باہر نکلیں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی -

یہ ہیں اظہار زینت کے متعلق قرآن کریم کی ہدایات - ممانعت، نمود آرائش کی ہے - خود بخود ظاہر ہو جانے والی اشیائے زینت کی نہیں -

سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے خدا کو محض بطور ظیہرؑ (۱۱) رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک اہمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں کی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی ہے لیکن خدا کو (محض بطور Extra) ساتھ اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے بھی اپنے مفاد کے لئے استعمال کر لیا جائے۔ غور کیجئے کہ یہی چیز آج ہم پر بھی کس طرح صادق آتی ہے۔

سورۃ حدید میں اللہ کی ایک صفت الظّٰہِرُ بھی آئی ہے۔ هُوَ الظّٰہِرُ (۱۰۰)۔ اس میں الظّٰہِرُ کے معنی آنکھوں سے نظر آ جانے والا نہیں۔ اس لئے کہ جب بنی اسرائیل نے تقاضا کیا تھا کہ ہم اللہ کو جہّۃً (اپنی آنکھوں سے) دیکھنا چاہتے ہیں (۲۵) تو ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا تقاضا طیفلانہ ہے۔ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ لہذا یہاں تو الظّٰہِرُ کے معنی ہیں وہ ذات جس کی ہستی پر کائنات کی سرئی اور مشہود اشیاء دلیل ہیں یا اس کے معنی ہیں سب پر غالب۔ لیکن اُس کا غلبہ ایسا ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ الظّٰہِرُ کے ساتھ (الْبَاطِنُ) بھی ہے (۱۰۰)۔ جیسا کہ (ب۔ ط۔ ن) کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ہے، خدا اپنے تخلیقی مظاہر (Created World) کی رو سے سامنے آتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشیاء کائنات خود خدا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اشیاء اپنے خالق کی ہستی کی علامات (آیات اللہ) ہیں۔ اور جو قانونِ خداوندی رگِ کائنات میں خونِ حیات بن کر دوڑ رہا ہے وہ اُس کے اقتدار و اختیار کی زندہ شہادت ہے۔ اسی اعتبار سے خدا الظّٰہِرُ ہے۔ لیکن خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے وہ الْبَاطِنُ ہے۔ اس سے (Immanence and Transcendence of God) کا وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جو مفکرین الٰہیات کے لئے اس قدر وجہٴ پیچ و تاب بنا رہتا ہے۔ یعنی یہ مسئلہ کہ خدا کائنات میں حاضر و موجود ہے یا اس سے الگ (کہیں اور۔ مثلاً عرش پر) بیٹھا ہے۔ وہ (اپنے قانون و اقتدار کے اعتبار سے) کائنات کے اندر ہے لیکن اس میں محسوس نہیں۔ اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) کائنات سے بالا ہے لیکن اس سے الگ (Excluded) نہیں۔ وہ بیک وقت الظّٰہِرُ بھی ہے اور الْبَاطِنُ بھی۔ (Immanent) بھی ہے اور (Transcendent) بھی۔ وہ اپنی ذات (Personality) رکھتا ہے لیکن مشخص (Personified) نہیں۔ اس کا اقتدار، ایک توانائی (Divine Energy) ہے لیکن بغیر ذات (Personality) کے نہیں۔

ع

عاد

جیسا کہ تذکرہ قوم ثمود (عدوان ث - م - د) میں لکھا جا چکا ہے، تاریخ کے ابتدائی ایام میں عرب اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ (شام - عراق وغیرہ) میں امم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قوم، عاد کی تھی جو ایک طرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار (ق - م) تک ان علاقوں پر اس قوم کا تسلط نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انہیں قوم نوح کا جانشین بتایا ہے (۶۹) جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ابتداء بہت قدیم زمانہ میں ہوئی تھی۔ اس قوم (عاد) کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف ریتیلے بل کھاتے ہوئے ٹیلوں اور ریگستانی صحرا کو کہتے ہیں۔ عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کہلاتا تھا۔ قرآن کریم کا بیان ہے کہ اس قوم کو (اُس زمانے کے لحاظ سے) سامان زیست افراط سے حاصل تھا۔ آپہاشی کے لئے قدم قدم پر چشمے۔ پھلوں سے لدے ہوئے باغات۔ اولاد اور مواشی کی کثرت (۱۳۳-۱۳۲)۔ وہ عرب بلند مقام یا شاہ راہ عام پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے (۲۶۸)۔ وہ علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۶۹) لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے انہیں ایسی غلط روش پر ڈال رکھا تھا کہ ان کا علم و بصیرت صحیح کاموں میں صرف نہیں ہوتا تھا (۲۶۸)۔ حضرت ہودؑ نے انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مافی اور ان پر ایسی مسلسل آندھی چلی کہ وہ تباہ و برباد ہو گئے (۲۶۸)۔ انہیں قرآن کریم نے عاد اولیٰ کہا ہے (۵۳)۔ ان میں سے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لا کر بچ گئے تھے ان کی نسل آگے چلی۔ انہیں عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔

(ان امور کی تفصیل - نیز اس نکتہ کی وضاحت کہ ان اقوام سابقہ کے اعمال، اور حوادث طبعی کے ذریعے ان کی تباہی میں باہمی ربط کیا تھا - میری کتاب ”جوئے نور“ میں ملیگی)

ع ب ا

الْعَبَثُ - بار - بوجھ - وزن، سامان وغیرہ کا - مَاعَبَاتٌ یہ - میرے نزدیک اسکا کوئی وزن نہیں - مجھے اسکی کچھ پرواہ نہیں * - قرآن کریم میں ہے مَا يَعْزُبُ عَنْكُمْ رَبِّي * (۲۵) - میرے نشوونما دینے والے کے نزدیک تمہارا وزن ہی کیا ہے - اس کی نگاہوں میں تمہاری قدر و قیمت کیا ہے - وہ تمہاری پرواہ کیا کرتا ہے - (ابن فارس)

ع ب ث

الْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو، یا ایسا کام جس کا فائدہ معلوم نہ ہو، یا ایسا کام جس کے کرنے والے کے سامنے اسکی کوئی غرض متعین نہ ہو۔ اسے معلوم نہ ہو کہ میں اسے کیوں کر رہا ہوں - بغیر مقصد اور غرض و غایت متعین کئے کوئی کام کرنا - اسی لئے کھیل کود کو عَبَثٌ کہتے ہیں * - اصل میں عَبَثٌ بالشتی کے معنی ہیں اسے کسی چیز میں ملایا - خلط ملط کیا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی خلط ملط کرنا ہی بتائے ہیں * - جب کوئی کام مقصد اور غایت کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو انسان اس میں کسی ایسی بات کو نہیں ملاتا جس سے وہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو۔ لیکن جب کوئی مقصد اور منزل ہی متعین نہ ہو تو پھر اس کام میں جو کچھ چاہے ملتا جائے - عَبَثٌ النَّاسِ - مختلف قبائل کے ملے جلے لوگ جو ایک جدا علیے کی اولاد نہ ہوں - الْعَبَثُ - ملی جلی بکریاں - لہذا الْعَبَثُ کے معنی ہیں غیر مفید کام، وہ کام جس سے کوئی غرض و مقصد مطلوب نہ ہو * -

قرآن کریم کی رو سے یہ تمام کائنات ایک متعین مقصد اور غایت کو سامنے رکھ کر پیدا کی گئی ہے اور انسانی تخلیق کی بھی ایک خاص غایت اور خاص مقصد ہے - صحیح روش زندگی وہ ہے جو انسان کو اس غایت اور مقصد کی طرف لے جائے - لیکن مادی نظریہ حیات کی رو سے کائنات اور انسان کی تخلیق یونہی اتفاقیہ عمل میں آگئی ہے - اسکی نہ کوئی غرض ہے نہ

غایت - لہذا انسان اپنی طبعی آسائش کے لئے جو روش بھی اختیار کر لے صحیح ہے - غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ قرآنی تصور زندگی اور مادی نظریہ حیات میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی بنیاد پر دونوں نظریوں کے مطابق زندگی کی پوری کی پوری عمارت (الگ الگ انداز سے) اٹھتی ہے - قرآن کریم نے اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ **أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا** (۱۱۳) - کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے؟ اور پوری کائنات کے متعلق ہے **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ** (۲۱) - نیز دیکھئے **جس میں السماء کی جگہ السَّمَوَاتُ ہے** - ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بطور کھیل تماشا کے نہیں بنا دیا - اسکی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے - اسے **بِالْحَقِّ** پیدا کیا گیا ہے (۲۸) - یعنی ایک غیر متبدل محکم پروگرام کے مطابق تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے - ہندو فلسفہ کی رو سے یہ تمام کائنات ”ایشور کی لیل“ ہے - یعنی خدا کا رچا ہوا ناول ، جس میں وہ خود سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے - اسی لئے اسے ”نٹ راجن“ کہا جاتا ہے - یعنی نٹوں (کھلاڑیوں) کا بادشاہ - قرآن کریم نے اس تصور کی خاص طور پر تردید کی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت (Seriousness) پر بڑا زور دیا ہے - اسی بنیاد پر انسان کے وہ تمام ایسے کام جو یونہی ، بلا صحیح غرض و غایت ، عمل میں آتے رہیں ، اُس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتے - چنانچہ اس نے قوم عاد کا ایک جرم یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں محض اس لئے بناتے تھے کہ وہ بطور یادگار فائیم رہیں - اسے اس نے **تَعْبَثُونَ** سے تعبیر کیا ہے (۲۸) - یعنی عمارت کا کوئی افادہ مقصد ہونا چاہئے - یونہی ایک عظیم الشان مقبرہ بنا دینا جو کسی مصروف میں نہ آسکے ، فعل عبث ہے - کس قدر عبرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جس قوم (مسلمانوں) کو اس قسم کی تعلیم دی گئی تھی ان کی سلطنت کے ہفایات ، مقبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں - اور ان پر ہم فخر کرتے ہیں - یادگار ایسی ہونی چاہئے جس سے منفعت بخش اور جمال آفریں نتائج مسلسل طور پر جاری رہیں - اسی لحاظ سے زندگی کا ہر کام جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں نہیں فعل عبث ہے - (اس سلسلہ میں عنوانات (ث - و - ب) - (ل - ع - ب) اور (س - د - ی) بھی دیکھئے)

ع ب د

عَبَثٌ - دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے - اس کے کھانے سے اونٹ فرہ عوجاتے ہیں اور

ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھائے ہیں تو وہ پیاسے عو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں۔ (۱) کشش و جاذبیت۔ (۲) ابتداء* پیاس کی تکلیف لیکن آخر الامر (۳) قربی اور دودھ کی فراوانی۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداء* تکلیف لیکن آخر الامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں۔ اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تار کول ملتے تھے تو اس سے کشتی بد صورت عو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے ایسی کشتی کو سَفِينَةٌ مَّعْبُودَةٌ* کہتے تھے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے۔ یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت۔ (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آتی جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عِبَادَةٌ* کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سرانجام دیا جائے (کیونکہ عِبْدٌ* پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش عو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲۸۶) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی انسان، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف عوتی ہے لیکن درحقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے پہلے کہا کہ وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ لِي تَنْفَعُ التَّوْمِينَ (۵۱)۔ ان کے سامنے خدا کا ضابطہ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱)۔ ان سے کہہ دے کہ ہم نے تمام انسانوں کو، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی**، اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداء* مشقت اٹھانی پڑیگی (اس لئے کہ السابقون الاولون کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں۔ بالکل نہیں۔ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ (۵۱)۔

*ناج۔ ** (جن و انس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)

ہم ان سے رزق نہیں چاہتے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائیں اور ہم کھائیں۔ ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ہے (تَسْتَفْعُ الثَّمَرُ مِیْنِہُنَّ)۔ آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کرینگے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑیگا اور یہ گراں گذریگا۔ لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی۔

”مشقت اور منفعت“ کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عِبَادَہ کے معنی سمجھئے۔ تَعْبِیْہُہ کے معنی ہیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا* (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ہیں۔ یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو۔ اسی طرح سڑک کو کسٹ کر ہموار کر دینا تاکہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں، یہی تَعْبِیْہُہ کہلاتا ہے*۔ آپ دیکھئے کہ ان کاسوں میں ابتداء کس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے۔

لہذا عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اُعْبُدُوا اللہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶۱) سے اس مفہوم کو واضح کر دیا۔ طَّاغُوتُ** کے معنی ہیں سرکش قوتیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے، یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو۔ دوسری جگہ ہے لَا تَعْبُدِ الشَّیْطَانَ (۱۶۸)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو***۔ ”شیطان“ کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے

* لین و تاج ** اسکے معنی (ط۔ غ۔ ی) کے تحت دیکھئے۔*** اسکے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو۔ دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا۔ عراق میں (موصل کے قریب) ایک باطن فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (”سلک طاؤس“ کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ہیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔

واضح کر دیا کہ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا (۱۶) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کرتے ہوئے ہے۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش۔ ط۔ ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ (۲۵) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الہ بنا لیا؟ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (۱۱) یوں ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ ”اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو“۔ اس تقابل سے ”اللہ کی عبودیت“ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتب سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں وَ يَرْيَدُونَ أَنِ يَنْتَحَاكُمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنِ يَتَّقُوا اللَّهَ يَكْفُرُونَ بِهِ (۲۶)۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں، حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۲۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات و خیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے، بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے۔ اسی کو اُعْبُدُوا اللَّهَ کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کریم نے ”خدا کی عبادت“ کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آجکل ”حکومت“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَ لَا يَشْرِكْ كُتُبُ يَعْبَادُوهَ رَبَّهُمْ أَحَدًا (۱۸)۔ ”ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ”عبادت“ میں کسی کو شریک نہ کریں“ اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَ لَا يَشْرِكْ كُتُبُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۹)۔ ”وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا“۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ إِنَّ الْخُكُومَ إِلَّا لِلَّهِ (۲۰)۔ ”حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی“۔ اور اس کے بعد کہا ”أَسْرَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ“ (۲۱)۔ ”اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محمکویت) اختیار نہ کرو“۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم

کس طرح ”حکومت“ اور ”عبادت“ کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔ قصہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو، تو وہ ان کے سوا کیا ہیں اُن ”عَبَدْتُ بَنِي إِسْرَآئِيلَ“ (۲۶) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ“ (۲۳)۔ اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات میں بھی یہ مادہ، حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّكُمْ بِحَيْثُكُمْ“ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ“ (۵۴)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ہو سکے (۲) یہ خدا کی ”عبادت“ کر سکیں (يَعْبُدُونَ تَنِي)۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں (لَا يُشْرِكُونَ رِي شَيْئًا ۝)۔ ظاہر ہے کہ اگر ”عبادت“ سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ”خدا کی پرستش“ کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہذا ”اللہ کی عبادت“ سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔

ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کر کے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو ”عَبِيد“ کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجہ استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی تھی۔ عَبِيد اور عِبَاد۔ عَبِيد کی جمع ہیں۔ عَابِد کی جمع عَابِدُونَ اور عَبَدَةُ ہیں)۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ہاتھ میں آئے ہوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنائے لگ گئے۔ اب انہی کو عَبِيد اور عَبِيد کہنے لگے۔ ہوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ قرآن کریم میں عَابِد کے معنی محکوم (۲۳)۔ عَبِيد کے معنی محکوم بنانا (۲۶) اور

عَبْدٌ کے معنی غلام (عَبْدٌ) واضح ہیں۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آ گیا ہے۔ چنانچہ اب تَعَبَّدٌ اور تَذَلُّلٌ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ (یعنی مطیع و متقاد ہو جانا، قانون کے سامنے جھک جانا)۔ تعبد و تذلل کا یہی جذبہ، پرستش کے اندر کار فرما ہوتا ہے۔ اس سے عِبَادَةُ کے معنی پرستش ہو گئے۔ قرآن کریم میں ہے قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا۔ (۱۱۱)۔ انہوں نے کہا، ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت درحقیقت مظاہر ہوتے ہیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت) کے خیال سے جھکتے ہیں۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظراسی مادہ سے عَبِيدَ یَعْبُدُ آتا ہے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ہیں۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌۢۙ لَّأَنَا آوَّلُ الْعَبِيدِۚ (۸۱)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہو سکتا ہے جسکے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہونگا جو اس قسم کے رحمن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کردے۔ (اسے رحمن کو دور ہی سے سلام ہے)۔ واضح رہے کہ اگر عَابِدِیْنَ کو عَبِيدَ - یَعْبُدُ ہی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرماں بردار کے ہونگے۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر رحمن کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں، لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرمان بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اَلْعَبْدُ کے پہلے معنی انسان کے ہیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ پھر کریم کے یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا۔

لہذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہونگے۔ چونکہ جذباتِ اطاعت و فرمان پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آ رہا ہے اس لئے قرآن کریم

نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صلوٰۃ جو ص۔ ل۔ و کے عنوان کے ماتحت درج ہے)۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں دیکھئے اَسْلَمْتُ اور نَعْبُدُ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی کو آلدین کہا گیا ہے (۱۳۱-۱۳۲)۔ نیز مُسْلِمُونَ اور عَابِدُونَ اور مُخْلِصُونَ بھی (۱۳۶-۱۳۸)۔

(۶) جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا توازن کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ”خدا کی عبادت“ سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت۔ خدا کی محکومیت۔

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

(۴) عِبَادُ الرَّحْمٰن کے معنی ہونگے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اُس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے ایٹاک نَعْبُدُ (۱) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اُس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلوٰۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اُسکی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان، زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱) سے بھی مقصود ہے۔

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ ”قوانین خداوندی کی محکومیت“ اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی

خوشگوار یوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشو و نما عو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ”محکومی“ درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل، اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا عوتا ہے۔ یہ (Self-Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں عوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

ع ب ر

عَبَّرَ کے معنی ہوتے ہیں ایک مقام (یا حالت) سے دوسرے مقام (یا حالت) تک پہنچ جانا۔ عَبَّرَ النَّهْرَ۔ اس نے نہر کو عبور کر لیا۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ عَبَّرَ السَّبِيلَ۔ اس نے راستہ قطع کیا، طے کیا۔ اَلْعَبْرَةُ۔ وہ چیز جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جائے۔ کشتی یا پل وغیرہ*۔ اس اعتبار سے راغب نے لکھا ہے کہ عِبَارَةٌ* وہ کلام ہے جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان میں پہنچتا ہے۔ اور عِبْرَةٌ* اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی دیکھی چیز کی وساطت سے آن دیکھے نتائج وغیرہ تک پہنچا جائے**۔ اس سے اَعْتَبَرَ الشَّيْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اچھی طرح سے پرکھنا اور اس کی کسی مثال کو سامنے لا کر اس کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا***۔ اَلْعَبْرَةُ۔ خواب کا انجام بتانا۔ اس سے فعل عَبَّرَ يَعْبُرُ عَبْرًا وَعِبَارَةً بھی آتا ہے**۔ ابن فارس نے اس معنی کی تائید میں خلیل کا یہ قول نقل کیا ہے عَبَّرْتُ اَللَّذْنَ اَنْبَرْتُ تَعْبِيرًا۔ جس کے معنی دیناروں کو ایک ایک کر کے تولنے کے ہیں۔ یعنی ہاٹ کو دیکھ کر دینار کے وزن کا اندازہ کر لینا۔

خواب کی تعبیر کے لئے یہ مادہ (۱۲) میں آیا ہے۔ عِبْرَةٌ* (۱۶) میں۔ فَاَعْتَبِرُوا يَا اُولِی الْاَبْصَارِ (۵۹) میں۔ یعنی مظاہر فطرت یا تاریخی شواہد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض و غایت اور قوانین خداوندی کے مقصود و مطلوب تک پہنچ جانا ارباب بصیرت کا کام ہے۔

عَبَّرَ السَّبِيلَ (راستہ قطع کرنے) سے، عَابِرِیْ سَبِيلٍ آیا ہے (۳۳) جس کے معنی ہیں، راستے کو پار کرنے والے۔

ع ب س

عَبَسَ وَجْهَهُ - اسنے اپنا چہرہ بگاڑ لیا۔ عَبَسَ تَعْبِيسًا کے بھی یہی معنی ہیں۔ اَلْعَبَّاسُ - وہ شخص جس کے چہرے پر ہر وقت شکن پڑی رہے۔ شیر کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْعَبَسُ دراصل اس گویر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے ساتھ لگ جائے اور خشک ہو جائے*۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ عَبَسَ (۴۲)۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی یا چہرہ بگاڑا۔ دوسری جگہ ہے۔ يَوْمًا عَبَسَ وَطَأَ قَعْمَطَرٍ يَرَأ (۴۰)۔ ایسا دن جس کا چہرہ سخت شکن آلود ہو۔ بڑا بھیانک دن۔ جسکی سختی سے لگوگوں کے چہرے بگڑ جائیں۔ راغب نے کہا ہے کہ سینہ کی تنگی سے چہرے کے بگڑنے کو کہتے ہیں**۔

ع ب ق ر

عَبْقَرٌ - صحراء میں ایک چشمہ یا آبادی کا نام تھا جسکے متعلق عربوں میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں۔ وہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتے جسکا بنانا دشوار ہوتا اور اسمیں نادرہ کاری کا نمونہ ہوتا تو وہ کہہ دیتے کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں، یہ تو عَبْقَرٌ والوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یعنی جنوں کی۔ ابن سینہ نے عَبْقَرٌ، یمن کے ایک شہر کا نام بتایا ہے جہاں کپڑوں اور فروش پر نقاشی، کڑھائی اور زری کا کام کیا جاتا تھا، وہاں کے کپڑے حسن و رعنائی میں ضرب المثل تھے۔ چنانچہ جب کسی چیز میں انتہائی حسن و جودت بتائی ہوتی تو اسکی طرف نسبت کردی جاتی تھی۔ اس کے بعد اَلْعَبْقَرِيٌّ۔ ہر کامل، غیر معمولی، اور سب سے اعلیٰ شے، نیز قبیلے کے سردار اور بلند مرتبہ شخص کو کہنے لگ گئے۔ فراء نے کہا ہے کہ اسکے معنی نہایت عمدہ دبیز فرش کے ہیں یا دیساج کے***۔ قرآن کریم نے عَبْقَرِيٌّ حِيسَانٍ کہا ہے (۵۹)۔ حسین اور نادر فروش۔

ع ت ب

اَلْعَتَبَةُ - دروازہ کی چوکھٹ۔ اَلْعَتَبَةُ (کسی معاملہ میں) سختی۔ یا نہایت ناخوشگوار بات۔ چنانچہ سخت اور پتھر بلی زمین کو بھی اَلْعَتَبُ کہتے ہیں****۔ نیز ایسی زمین کو بھی جو وہاں اترنے والے کے لئے سازگار نہ ہو**۔ اَلْعَتَبُ - اونٹ کا تین پاؤں پر چلنا جبکہ اسکا ایک

* تاج - ** راغب - *** تاج - راغب - محیط - **** تاج و محیط۔

پاؤں پسندھا ہوا یا زخمی ہو۔ آدمی کا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں پر کود کود کر چلنا۔ تَعْتَبْ عَلَیْهِ - وہ اس پر ناراض ہو گیا۔ اَلْمُعْتَابُ وَالْمُعْتَابَةُ - باہم غصہ اور ناراضگی کو بیان کرنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور صعوبت کے ہیں۔ چنانچہ سیڑھی کے درجات کو عَتَبَات* کہتے ہیں۔ نیز پہاڑوں میں پتھروں کی جو سیڑھیاں بنی ہوں انہیں بھی عَتَبَات* کہتے ہیں۔ دروازہ کی چوکھٹ کو بھی اس لئے عَتَبَةُ* کہتے ہیں کہ وہ نشیبی جگہ سے ذرا اونچی ہوتی ہے۔ اَلْعُتْبَىٰ کے معنی رضامندی ہیں۔ اِسْتَعْتَبَہ - اس کی رضامندی اور خوشنودی چاہی۔ نیز اس کے معنی اپنی ناراضگی دور کر کے اس سے راضی ہو گیا بھی ہیں*۔

قَدْ اَعْتَبْتَنِي فُلَانٌ*۔ جن باتوں کی وجہ سے میں فلاں آدمی پر ناراض تھا اس نے وہ باتیں چھوڑ دیں اور مجھے راضی کر لیا*۔ اِلَّا سَتِعْتَابُ* رضامندی طلب کرنا۔ معافی چاہنا۔ کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اس ناگواری، ناراضگی اور عتاب کو دور کر دے جو وہ محسوس کر رہا ہے۔ اَلْمُعْتَابُ - راضی کیا ہوا۔ جس سے عتاب دور کر دیا جائے*۔

قرآن کریم میں ہے وَ اِنْ يَسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ (۲/۱۸)۔ اگر وہ ان باتوں کو دور کرنا چاہیں جو ان کے لئے وجہ ذلت و عذاب ہوئی تھیں اور اس طرح ہماری رضامندی طلب کرنا چاہیں تو وہ (ایسا کر نہیں سکیں گے)۔ ذلت اور عذاب ان سے چھوٹ نہیں سکیں گے۔ ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔ (نیز ۱۸/۱)۔

ع ت د

عَتِيْدٌ*۔ تیار۔ موجود۔ حاضر۔ قریب**۔ (۵/۱۸)۔ اَعْتَدَ - تیار کرنا۔ حاضر رکھنا**۔ ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا***۔ (۳/۱۸)۔ جہنم چونکہ انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے مرتب ہوتی ہے اس لئے وہ اعمال کے ساتھ ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَعْتَدْنَا لَكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳/۱۸)۔ ان کے لئے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے خدا نے وہاں اپنے طور پر الگ تیار کر رکھا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی جنت یا جہنم، زندگی کے ہر سانس

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

میں ساتھ کے ساتھ تیار کرتا رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے عنوانات جہنمہ نام وغیرہ دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی ہر فرد جہنم کے سامنے موجود اور اس کے قریب ہے)۔ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی قرب اور موجودگی ہیں۔

ع ت ق

الْعَيْشِيُّ - حریت - آزادی - شرافت - نجابت - عزت - جمال - عَتَقَ الْعَبْدُ يَعْتِقُ - غلام آزاد ہوا۔ آزاد ہونے والا غلام عَتِيقٌ وَعَتَائِقٌ کہہ لائیگا*۔ قرآن کریم میں خزانہ کعبہ کو الْبَيْتُ الْعَتِيقُ کہا گیا ہے (۲۹)۔ یعنی نظام خداوندی کا وہ مرکز جو دنیا میں ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہے۔ جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہیں۔ نہ ذہنی نہ حکمرانی۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی انہی معانی کی تائید کی ہے۔ کس قدر بلند ہے وہ مقام جو ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو۔ اور کس قدر صاحب شرف و عظمت ہے وہ قوم جس کے مرکز کی بہ شان ہو۔ رَاحٌ عَتِيقٌ - وہ سر بند شراب جسکی مہر کسی نے نہ توڑی ہو۔ شراب کہنے - عَتَقَ الْفَرَسُ عَيْتًا - گھوڑا چلنے میں آگے نکل گیا*۔ تعریفات میں ہے کہ عَتِيقٌ کے معنی لغت میں قوت کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ (i) ساخت اور اخلاق دونوں اعتبارات سے معزز و مکرم ہونے کے لئے۔ اور (ii) قدیم ہونے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ الْعَتِيقُ ہر پیشرو چیز کو کہتے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار سے ہو، خواہ مکان کے اعتبار سے، یا رتبہ کے اعتبار سے***۔ لہذا کعبہ کے الْبَيْتُ الْعَتِيقُ (۲۹) ہونے میں اس کا آزاد، صاحب قوت، اور شرف و عظمت نیز زمان کے اعتبار سے سب سے بلند اور آگے ہونا، تمام معانی آجاتے ہیں۔ یہی مقام اقوام عالم میں امت مسلمہ کا تھا۔ اس لئے کہ کعبہ درحقیقت نشان (Symbol) ہے نظام خداوندی کا اور اس قوم کا جس کا وہ مرکز ہے۔ جس طرح دارالسلطنت یا عِلَمٌ کسی مملکت کا نشان ہوتا ہے۔ اور عِلَمٌ کی سربلندی سے مراد خود اُس مملکت کی سربلندی ہوتی ہے۔

زمان (Time) کے لحاظ سے کعبہ کے متقدم ہونے کے معنی یہ ہونگے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے قومی مرکز (بیت المقدس) سے بہت پہلے (ملت ابراہیمی کے مرکز کی حیثیت سے) وجود میں آیا تھا۔

ع ت ل

اَلْعَتَاتُ*۔ سوھے کا ایک موٹا سا ڈنڈا جس کا ایک سرا آگے سے ذرا چوڑا ہو (گینتی)۔ اس سے زمین یا دیوار کھودی یا ڈھائی جاتی ہے۔ نیز اس سے کھجور کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں۔ اَلْعَتَلُ*۔ کسی کو نہایت بیدردی اور بیرحمی سے گھسیٹنے اور اٹھا لینے، نیز ہانکنے میں نہایت سختی اور طاقت سے زیادہ زور ڈالنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اَخَذَ بِيْزِمَامِ الثَّانَةِ فَعَتَلَمَهَا۔ اس نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور اسے نہایت بے دردی کے ساتھ کھینچا۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ عَتَلَهُ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جیلخانے کی طرف نہایت بے دردی سے کھینچ کر لے جانا یا دھکے دیکر لیجانا۔ هُوَ مِعْتَلٌ*۔ وہ بیدردی کے ساتھ کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَتَلُ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس مقام سے پکڑنا جہاں اس کے مختلف حصے جمع ہو جاتے ہوں اور بزور اسے گھسیٹنا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہیں۔

سورہ دخان میں ہے فَاعْتَلُوا* اِلٰی 'مَتَوَاعِرِ الْجَحِيْمِ' (۴۴)۔ اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔ اَلْعَتَلُ*۔ بہت کھانے والا اور مال کو روک کر رکھنے والا۔ خیر خواہی کی باتوں سے اعراض کرنے والا۔ بہت جھگڑالو***۔ بیرحم۔ بیدرد۔ سخت گیر۔ اس میں یہ تمام معانی آجائینگے۔ قرآن کریم میں ہے عَتَلُ* بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيْمٌ (۱۸)۔ (زَنِيْمٌ کے لئے دیکھئے عنوان ز۔ ن۔ م)

ع ت و

عَتَا - يَعْتُو - عَتِيًّا وَ عَتُوًّا - حد سے تجاوز کر جانا۔ حکم عدولی کرنا۔ عَتَتِ الرِّيحُ*۔ ہوا تندی و تیزی میں حد سے بڑھ گئی۔ یعنی جھکڑ اور آندھی بن گئی***۔ سورۃ حاقہ میں قوم عَاد کے متعلق ہے قَاتُ هَالِكًا كَوًّا بِرِّ رِيْحٍ صَرَّصَرٍ عَاتِيَةٍ (۱۶)۔ انہیں سخت زبردست آندھی کے طوفان نے ہلاک کر دیا۔ لَتَيْلُ عَاتٍ - سخت تساریک رات کو کہتے ہیں***۔ مَلِكُ عَاتٍ - جابر اور سنگ دل بادشاہ کو***۔ سورۃ طلاق میں ہے عَتَتِ عَنَّا اَسْرَرُ رَبِّيْهَا (۸)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے حکم سے سرکشی کی۔

* تاج و محیط - ** راغب - *** تاج - **** محیط -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تکبر اور غرور کے ہیں۔ سورۃ فرقان میں ہے **وَعَتَوُا عَتُوًّا كَبِيرًا** (۲۹)۔ انہوں نے سخت سرکشی اختیار کی۔ سورۃ مریم میں ہے **أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ عِتِيًّا** (۱۹) جو رحمن کے خلاف سرکشی میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ لیکن دوسری جگہ یہ لفظ صرف شدت اور اتم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ **وَقَدْ بَلَغْتَ مِنْ الْكِبَرِ عِتِيًّا** (۱۸)۔ میں بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں۔ یعنی بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ راغب کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ جانا جہاں اصلاح اور مداوا کا امکان نہ رہے۔

ع ث ر

عَثَرَ السَّيْرَ ق۔ رگ پھڑکی۔ **عَثَرَ عَثُورًا**۔ کسی بات پر بغیر قصد کے مطاع ہو جانا۔ **عَثَرَ عَلَى السَّيْرِ**۔ وہ راز سے واقف ہوا۔ **أَعَثَرَهُ**۔ اسے آگاہ اور مطاع کیا۔ کہتے ہیں **أَعَثَرْتُ فُلَانًا عَلَى كَذَا**۔ میں نے فلان کو اس چیز سے باخبر اور اس پر مطلع کر دیا*۔ قرآن کریم میں ہے **وَكَذَٰلِكَ أَكْتَبَ أَكْثَرُ نَا عَلَيْنَاهُمْ** (۱۸)۔ اس طرح ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا۔ یعنی لوگوں کو ان کی خبر مل گئی۔ ان کا پتہ چل گیا۔ دوسری جگہ ہے **فَإِنْ عَثِرَ عَلَى آثَقَهُمَا اسْتَحَقَّتْ لَاهُمَا** (۶۵)۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو، یا اس کا علم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ **الْعِثْرُ** کسی چیز کے اثر، خفی کو کہتے ہیں۔ نیز مٹی۔

ع ث ی

عَثَى کے معنی ہیں سخت فساد پیدا کرنا۔ شیرازہ بکھیرنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ (ع۔ ث۔ ی) اور (ع۔ ی۔ ث) کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے، تاہم بیشتر یہ لفظ (یعنی عَثَى) ذہنی اور فکری فساد کے لئے بولا جاتا ہے***۔ صاحب المنار نے لکھا ہے کہ **عَثَا** کے معنی ہیں شر اور فساد پھیلانا، شرارت اور بد معاشری عام کرنا****۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فساد کے لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے **وَلَا تَعَثُوا فِي الْأَرْضِ مَفْسِدِينَ** (۲۰)۔ ملک میں انتشار پیدا نہ کرو۔ معاشرہ میں فساد مت پھیلاؤ۔

*تاج۔ **محیط نیز ابن فارس۔ ***راغب۔ ****المنار، ج ۱، ص ۳۷۷۔

ع ج ب

الْعَجَبُ* - جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے سلا ہوا ہو۔ ہر چیز کا آخری حصہ*۔ تَعَجَّبُ* اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی بات کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ یا اس کیفیت کو کہ تم کسی چیز کو دیکھو اور وہ تمہیں پسند آئے اور تم سمجھو کہ تم نے ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جس چیز سے تعجب کیا جاتا ہو، یا جس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے اس سے اظہار حیرت و انکار کیا جائے، اسے عَجَبٌ کہتے ہیں**۔ اس گھبراہٹ کو بھی عَجَبٌ کہتے ہیں جو کسی کام کو بہت بڑا سمجھنے سے طاری ہوتی ہے۔ جس جیسی چیز عام طور پر نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِيبٌ کہتے ہیں۔ الْعَجَبُ کے معنی غرور اور تکبر۔ خود رانی اور خود پسندی کے ہوتے ہیں*۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عَجِيبٌ اس بات کو کہتے ہیں جس سے تعجب پیدا ہو اور عَجَابٌ اسے کہتے ہیں جو عَجِيبٌ کی حد سے تجاوز کر گیا ہو۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ يَعْجِبُكُمْ قَوْلُهُ، فِي الْحَيَوةِ الدُّنْيَا (۴۰)۔ اس کے معنی حیرت میں ڈالنے یا بھلی معلوم ہونے کے ہیں۔ یعنی دنیاوی زندگی کے متعلق جس کی بات تمہیں حیرت میں ڈالتی ہے۔ سورۃ جن میں ہے اِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا (۹۲)۔ اس میں اس حیرت کی طرف اشارہ ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو۔ یعنی وحی کی مہارت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے تعجب، کہ یہ قرآن کریم اس قسم کا عجیب و غریب کس طرح بن گیا؟

سورۃ احزاب میں ہے وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ حَسْبُنَا (۳۳/۵۲) خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔

ع ج ز

عَجَزٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اسے اسے وقت میں حاصل کرنے کے ہیں جب کہ وہ بالکل ہاتھ سے نکل رہا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی بات سے قاصر رہ جانے اور اسے کرنے کی طاقت نہ ہونے

*تاج و راغب - **قرآن کریم (۹۲) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کے یہی معنی موزوں نظر آتے ہیں اگرچہ کتب لغت میں یہ معنی نہیں ملتے۔ اس کے مصدری معنی بھی کئے جا سکتے ہیں۔

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کا پچھلا حصہ لکھے ہیں۔ پیچھے رہ جانا خود عَجَزٌ کی دلیل ہے۔ چنانچہ اَلْعَجْزَةُ - بوڑھے آدمی کے سب سے آخری بچے کو کہتے ہیں۔ تَعَجَّزْتُ اَلْبَعِيْرَ - میں اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار ہو گیا*۔ اَلْعَجْوُزُ کے قریب ایک سو معانی کتب لغت میں لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (عَجْوُزٌ عَقِيْمٌ ۵۱۴) - بوڑھی یا کمزور اور ضعیف عورت کے لئے آیا ہے۔ اَلْعَجْزُ - کولہا - کسی چیز کا آخری حصہ۔ اس کی جمع اَعْجَازٌ ہے۔ نیز درخت کے تنے کے آخری حصہ کو بھی کہتے ہیں جو زمین سے متصل ہوتا ہے۔ اَعْجَازُ نَخْلٍ (۵۱۳) کے معنی ہیں کھجور کے درختوں کے جڑ والے تنے۔ اَعْجَزَ - عاجز کرنا - کمزور کرنا - سمجھنا۔ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۵۱۶) - وہ عاجز نہیں کر سکتے۔ مُعْجِزٌ - عاجز کرنے والا۔ شکست دینے والا (۵۱۷)۔ نیز مُعْجِزٌ یُنْ (۵۱۸)۔ ایک دوسرے کو شکست دینے اور بے بس کرنے کی کوشش کرنے والے۔

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والے جو جی میں آئے کرلیں، وہ کبھی قانون خداوندی کو شکست نہیں دے سکتے۔ جو قانون انسانوں سے شکست کھا جائے وہ خدا کا قانون کیا ہوا؟ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انسانوں کی جماعت اس قانون کے نفاذ کی کوشش کرے تو وہ اپنے نتائج انسانی پیمانوں کے مطابق (جلدی) سامنے لے آتا ہے، اور اگر وہ کائناتی طریق پر کارفرما رہے تو اس کے نتائج کائناتی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتے ہیں (جن کی رو سے ایک ایک ”یوم“ ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے)۔ شکست اس قانون کو کبھی نہیں ہوسکتی۔

ہمارے عال جن معنوں میں معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، (یعنی نبی سے کسی ایسی خارق عادت بات کا سرزد ہونا جسے دیکھ کر دوسرے عاجز آجائیں) قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا۔

ع ج ف

اَلْعَجْفُ - موٹاپے کا جاتے رہنا۔ اَعْجَفْتُ** (جمع عَجَافٌ) - دبلا، لاغر،***۔ سورۃ یوسف میں سَبْعٌ عِجَافٌ (۱۲) آیا ہے۔ یعنی سات دبلی ہتلی (گائیں)۔ عَجَفَتْ نَفْسُهُ عَنِ الطَّعَامِ - اس نے بھوک کی خواہش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کھانے سے روک لیا***۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (i) لاغری اور (ii) ضبطِ خویش کے لکھے ہیں۔

*تاج و راغب۔**بظاہر یہ عجیف کی جمع معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاغر ہیں۔***تاج و محیط۔

ع ج ل

الْعَجَلُ - الْعَجَلَةُ - جلدی - تیزی - راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں کسی چیز کو اسکے وقت سے پہلے ہی حاصل کر لینے کی خواہش۔
 أَعْجَلْتُ النِّقَاطَةَ - اونٹنی نے وقت سے پہلے ہی نا تمام بچہ دیدیا۔
 أَلَا عَجَلٌ فِي السَّيْرِ - اونٹ کا اٹھ کھڑے ہونے میں جلدی کرنا۔ یعنی سواری ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے اور اونٹ اٹھ کھڑا ہو۔ أَلَمْ يَعَجَلْ - وہ کھجور کا درخت جسکا پھل پہلے ہک جائے۔ أَلَمْ يَعَجَلْ - وہ تھوڑا سا کھانا جو کھانے سے پہلے یونہی سہارے کے لئے پیش کیا جائے۔ مُسْتَعْجَلَاتٌ الطَّيْرِ يَمْنَى - قریب اور مختصر راستے*۔

قرآن کریم میں تَعَجَّلْ بمقابلہ تَأَخَّرَ آیا ہے (۲/۳)۔ اور عَاجِلَةٌ بمقابلہ آخِرَةٌ (۱۸۰/۱۹)؛ (۲/۵۰-۴۱)۔ قرآن کریم کی یہ دو اصطلاحات (عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ) بڑی غور طلب ہیں۔ (انکے تفصیلی مفہوم کیلئے ا-خ-ر اور د-ن-و کے عنوانات دیکھئے)۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے جو انہوں نے بیج کے لئے رکھے ہیں۔ انکے ہاں کھانے کی تنگی ہے۔ ان میں سے ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا لاتا ہے۔ اسکے گھر میں گھنٹہ بھر میں روٹیاں ہی روٹیاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن دوسرا کسان اس وقتی تنگی کو برداشت کر لیتا ہے اور اس گندم کو اپنے کھیت میں بو دیتا ہے۔ اس پر چھ سات مہینے کا زمانہ تو بڑا سختی کا گزرتا ہے لیکن اسکے بعد اسکے گھر دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں اور وہ بڑی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اول الذکر کسان نے عجلت سے کام لیا۔ یعنی اسکی نگاہ مفاد عاجلہ پر تھی۔ ایسے مفاد پر جو جلدی سے ہاتھ آجائیں۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ مفاد آخرہ پر تھی، یعنی مستقبل کی خوش حالی اور فارغ البالی پر۔ یہ ہے فرق عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ کا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر ہوتی ہے ہم انہیں مفاد عاجلہ دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل کی خوشگوار یوں میں انکا کوئی حصہ نہیں ہوتا (۱۸۰/۱۹)۔ اسکے برعکس جو لوگ مستقبل کی خوشگوار یوں پر نگاہ رکھتے ہیں تو انکا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور (ابتدائی محنت کے بعد) حال بھی خوشگوار (۱۸۰/۱۹)۔ یہی دو گروہ ہیں جنکا تقابل سارے قرآن کریم میں نظر آتا ہے۔

ایک پیش پا افتادہ، قریبی مفاد کی طرف لپکنے والے۔ (تَحْيِثُونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ)۔ (۲۵۰: ۲۵۱)۔ اور دوسرے، مستقبل کی خوشگوار یوں کیلئے کوشش کرنے والے۔ ”مستقبل“ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں موجودہ نسل کے بعد آنے والی انسانیت (Humanity)۔ اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس میں عاجلہ اور آخرہ*۔ حال اور مستقبل۔ دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جائیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک گروہ وہ ہے جو انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی (Physical Life) قرار دیتا ہے جس کے مفاد اور تقاضے پیش پا افتادہ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ، انسان کو عبارت سمجھتا ہے اسکی طبیعی زندگی اور اسکی ذات سے۔ طبیعی زندگی، موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات مرنے کے بعد آگے چلتی ہے۔ اس لئے جن مفادات کا تعلق انسانی ذات سے ہے وہ عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ ہیں۔ یہ مستقل اقدار سے حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے۔ یوں ”دنیا اور آخرت“ دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

الْعَاجِلُ۔ لغت حمیر میں مٹی کو کہتے ہیں۔ اسی لئے خَلِيقُ الْاِنْسَانِ مِّنْ عَجَلٍ (۲۱) کے معنی کئے گئے ہیں انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے*۔ (اسکی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں تخلیق انسانی کی ابتدا طین۔ مٹی سے بتائی گئی ہے۔ ۳۲)۔ لیکن سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا (۱۶)۔ انسان جلد باز ہے۔ اس لئے (۲۱) میں بھی اسکے یہی معنی لئے جائیں تو زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ بالخصوص جب اسی آیت میں فَلَا تَسْتَعْجِلُوْا بِهٖ (۱۶)۔ انسان جلد باز ہے۔ کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ مفاد عاجلہ کے پیچھے جاتا ہے۔ یہ صرف وحی کا قانون ہے جس کے تابع چلنے سے اسکی نگاہ مستقبل پر بھی رہتی ہے۔ دوسری طرف، اسی عجلت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ اسکی غلط روش کے نتائج فوراً سامنے کیوں نہیں آتے۔ حالانکہ خدا کے قانون مہلت کی رو سے ہر عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جس طرح بیج اور اسکے پھل کے درمیان ایک مہلت کی مدت ہوتی ہے)۔ جن کی نگاہ خدا کے اس قانون پر ہوتی ہے وہ اس سے نہیں گھبراتے کہ مخالفین کی غلط روش کا نتیجہ فوراً کیوں نہیں سامنے آتا؟ انہیں خدا کے محکم قانون کی نتیجہ خیزی پر یقین ہوتا ہے۔

الْعِجْلُ - بچھڑا - بعض کا خیال ہے کہ ایک ماہ تک کی عمر کے گائے کے بچے کو عِجْلُ کہتے ہیں *۔ (۲۴)؛ (۲۸) - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایک سال تک کی عمر کے گوالہ کو عِجْلُ کہتے ہیں **۔ راغب نے کہا ہے کہ اس میں عجلت کا تصور موجود ہے - یعنی بچھڑا پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے اور یہ پھرتی اور تیزی بیل بننے کے بعد اس میں باقی نہیں رہتی ***۔

سورہ القیصہ میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُعْجِرْکَ بِہِ لِسَانُکَ لِتَعْجَلَ بِہِ (۲۹) - اس کے لفظی معنی ہیں، تو اپنی زبان کو اس کے ساتھ حرکت نہ دے تاکہ اسے جلدی لے لے - لیکن (جیسا کہ ح - ر - ک کے عنوان میں بھی لکھا گیا ہے) اس کے معنی (۲۱۳) کو ساتھ ملانے سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے کہہ وَلَا تَعْجَلَ بِالْقُرْآنِ مِّنْ قَبْلِ أَنْ یُقَضَّیَ لَکَ وَحِیُّہُ، یعنی تو (کسی نقطہ کے متعلق) عملی قدم اٹھانے میں عجلت نہ کر تا آنکہ اس کے متعلق پورا پروگرام بذریعہ وحی تجھے دیدیا جائے۔ جب وحی سارا پروگرام سامنے لے آئے پھر اس کے متعلق عملی اقدام کرو۔

ہم نے (ح - ر - ک) کے عنوان میں ضمناً یہ بھی کہا ہے کہ اس سے انسانی اعمال نامہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے - اس صورت میں (۲۱۳) کا (۲۱۳) سے تعلق نہیں ہوگا - لیکن (۲۱۳) کا مفہوم اس کے بغیر بھی واضح ہے۔

ع ج م

لغت عرب میں (ع - ج - م) کا مادہ ابہام اور اخفاء کیلئے آتا ہے - یعنی وضاحت اور بیان کے خلاف - اَلْأَعْجَمُ - وہ آدمی جسکی بات فصیح اور واضح نہ ہو اگرچہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو (جمع اَعْجَمٌ - اَعْجَمُونَ اَعْجَمِیْنَ) - پھر اس کے بعد اَلْعَجَمِیُّ ہر غیر عرب کیلئے بولا جانے لگا خواہ وہ فصیح ہی کیوں نہ ہو - اَلْأَعْجَمُ - گونگا۔

لطائف اللغۃ میں ہے کہ اَلْعَجَمِیُّ غیر عرب کیلئے بولا جاتا ہے خواہ وہ فصیح البیان ہی کیوں نہ ہو - اور اَلْأَعْجَمِیُّ غیر فصیح، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو - اَعْجَمَ فُلَانٌ اَلْکَلَامَ - فلان نے بات مبہم رکھی - بَابُ مُعْجَمٍ - بند دروازہ - اسْتَعْجَمَتِ الْقَدَارُ - گھر سونا ہو گیا اور اسمیں جواب دینے والا کوئی نہ رہا **** - ابن فارس نے سکوت اور خاموشی

کو اس کے بنیادی معنوں میں لکھا ہے۔ قرآن میں **أَعْتَدَ** بمعنی **بمقابلہ** **عَرَبِيٌّ** **مُسْلِمِينَ** آیا ہے (۱۰۳)۔ نیز دیکھئے (۱۶۸؛ ۱۶۹)۔ **الْعَرَبِيٌّ** کے معنی فصیح ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ ب)

ع د د

إِعْدَادٌ کے معنی ہیں تیار کرنا۔ مہیا کرنا۔ **أَعْدَدْتُ لِيَحْوِثَ** **الْقَدْحُ مِنَ الْمَلِ وَالسَّيْلِ** کے معنی ہیں میں نے حوادثِ زمانہ کے لئے مال و ہتھیار کی پوری پوری تیاری کر لی۔ **إِسْتَعْدَقْتَهُ** کے معنی بھی یہی ہیں۔ یعنی اس کے لئے مستعد اور تیار ہو گیا۔ **عَدَّ يَعْدُو عَدًّا** کے معنی ہیں شمار کرنا۔ گنتی کرنا۔ **عَدَّدَ** اور **عَدَّدَ** اس سے اسم آیا ہے *۔
(**وَلَا تَعْدُوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا**) (۱۱۲)۔ **مَعْدُودٌ**۔ گنے ہوئے *۔ **أَيَّامًا مَعْدُودَةً** (۱۸۰) گنتی کے دن *۔ وہ دن جن کی تعداد معلوم ہو۔ چنانچہ جب حضرت یوسفؑ کو قافلہ والوں نے بازارِ مصر میں بیچا ہے تو اس کے لئے قرآنِ کریم میں **دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ** (۱۲۰) آیا ہے۔ یعنی انہوں نے اسے چند گنتی کے سکون کے عوض بیچ ڈالا۔ روزوں کے لئے بھی **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** آیا ہے (۱۸۳)۔ لیکن اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کردی گئی ہے جہاں کہا گیا کہ **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (۱۸۵)۔ یعنی جو تم میں اس مہینہ (رمضان) میں اپنے مکان پر موجود ہو اسے چاہئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اس سے واضح ہے کہ روزے رمضان کے پورے مہینے کے ہیں۔ **عِدَّةٌ** اس شمار کی ہوئی مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی *۔ اور **الْعِدَّةُ** اس مال و دولت یا ساز و سامان کو کہتے ہیں جسے حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان تیار رکھے *۔ **عَدَّاهُ** شمار کرنا۔ (۱۸۱)۔ **عَدَّدَ**، گنے ہوئے، (۱۸۱)۔ **عِدَّةٌ**۔ تعداد۔ گنتی (۱۸۱)۔ **عِدَّةٌ**۔ سامان جو تیار ہو۔ جو کسی حادثہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھا جائے۔ (۱۸۱)۔ **أَعْدَدَ**۔ تیار کرنا۔ مہیا کرنا (۱۸۱)۔ **إِعْتَدَ**۔ شمار کرنا (۱۸۱)۔

ع د س

الْعَدَسُ۔ مسور کو کہتے ہیں *۔

قرآنِ کریم میں یہ لفظ (۲۱) میں آیا ہے۔

ع د ل

الْعِدْلُ* - اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے - ان میں سے ہر ایک عِدْلُ* کہلاتا ہے - لہذا اس کے بنیادی معنی ہیں برابر ہونا - عِدْلُ الثِّمَارِ* - میزان کو برابر کر دیا - فَاعْتَدِلْ* - پس میزان برابر ہو گئی - عَادَلَهُ* مُعَادَلَةً* - اس کے هموزن اور برابر ہوا - عَادَلْ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ* - دو چیزوں کو باہم دگر ہم وزن کیا - برابر کیا - نیز دو چیزوں کا موازنہ کیا - عِدْلَهُ* فِي الثَّمَنِ* - ساتھ ساتھ کسی دوسرے کے ساتھ سوار ہونا اور اس کے ساتھ وزن میں برابر ہونا - اَلْعِدْلُ* - اَلْعِدْلُ* - اَلْعِدْلُ* - مثل اور نظیر - هموزن - اِعْتَدِلْ* - کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دو حالتوں کے درمیان ہونا - تناسب و توازن - قرآن کریم میں ہے فَعَدَلْتُكَ (۸۲) - خدا نے انسان کو متناسب الاعضاء بنایا - اس میں پورا پورا توازن و تناسب قائم رکھا - اسے سیدھا کھڑا کیا - اس کے لئے توازن کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے -

کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عِدْلُ* کہلاتا ہے - اَوْ عِدْلُ ذَا لِكْتَ صِيَامًا (۹۵) - ”یا اس کے برابر روزے رکھنا“ - ابن قاس نے عِدْلُ* کے معنی فدیہ بھی بتائے ہیں - لَا يَتَوَخَّذُ مِنْهَا عِدْلُ* (۲۸) - اس سے معاوضہ یا فدیہ نہ لیا جائیگا - يَا وَ اِنْ تَعْدِلْ* كُلَّ عِدْلٍ (۱۶) - اور اگر وہ ہر قسم کا معاوضہ دینا چاہے - سُوْرَةُ حِجْرَاتِ مِیْنِ عِدْلُ* اور قِیْسُطُ* کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۲۹) - (قِیْسُطُ* کا مفہوم عنوان ق - س - ط میں بیان کیا جائیگا) - قرآن کریم نے عِدْلُ* اور اِحْسَانُ* کا حکم دیا ہے (۹۶) - کسی کو پورا پورا معاوضہ دے دینا عِدْلُ* ہے اور اس کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا اِحْسَانُ* ہے (دیکھئے عنوان ح - س - ن) -

مثل اور نظیر کے معنوں میں یہ لفظ سُوْرَةُ اِنْعَامِ میں آیا ہے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وَ هُمْ بِرَبِّهِمْ* يَعْدِلُوْنَ (۱۵۱) - یہ لوگ دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں -

عَدَلْ عَنِ الطَّرِيقِ* کے معنی ہیں راستہ سے ہٹ جانا - عَدَلْ الطَّرِيقَ* - راستہ ایک طرف کو مڑا یا جھکا* - عَادَلْ الشَّيْءَ* - وہ چیز ٹیڑھی ہو گئی** - سُوْرَةُ النَّمْلِ مِیْنِ هُوَ بَلْ عُمٌ قَوْمٌ يَعْدِلُوْنَ (۲۶) -

یہ وہ لوگ ہیں جو سیدھے راستے سے ایک طرف ہٹ گئے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی ہموار ہونا۔ اور ٹیڑھا ہونا۔ لیکن غالب یہ ہے کہ ٹیڑھا ہونے کا مفہوم عَن سے پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ مقدر کیوں نہ ہو۔

قرآنی معاشرہ کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ہوتی ہیں۔ اس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے۔ کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن اس معاشرہ کے افراد نے شروع ہی سے یہ عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ اتنا ہی لینگے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت ہامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینگے۔ (۲۱۹)۔ یہ بقایا ان لوگوں کے لئے ہوگا جو کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے اور جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ ان کی اس کمی کو پورا کر دینے کا نام احسان* ہے۔ یہ احسان کسی پر ”احسان“ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی شکل خیرات کی ہوتی ہے۔ ان تمام افراد معاشرہ نے اس امر کا عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ ان کی محنت کا ماحصل سب کی نشو و نما کے لئے کھلا رہے گا۔ یہ سب کچھ نظام معاشرہ کی تحویل میں رہتا ہے اور تمام افراد معاشرہ کی نشو و نما کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عدل و احسان کے حکم کے ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ فَحَسْبُكَ اور مَنَّكَ۔ سے باز رہو (۹۶)۔ فَحَسْبُكَ کہتے ہیں۔ بخل کو، اور مَنَّكَ کہتے ہیں عقل فریب کار کی حیلہ جوٹیوں کو جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اکساتی رہتی ہے۔

ع د ن

عَدْنٌ - يَتَعَدْنُ وَا يَتَعَدْنُ - کسی جگہ قیام کرنا۔ ٹھہرنا۔ جَنَّاتٌ عَدْنٌ - ایسے باغات جن میں جم کر قیام کیا جاسکے۔ اَلْمَعْدِنُ - کان۔ (Mine) - ہر چیز کی جگہ جہاں اس کی پیداوار ہو اور وہ وہاں مستقل طور پر پائی جائے۔ ہر چیز کا مرکز۔ اَلْمَعْدَانُ - جڑیں*۔ قرآن کریم میں جَنَّاتٍ عَدْنٍ (۹۶) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں راحت و آرام کی قیام گاہیں۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ”قیام کرنے کے باغ“ لکھے ہیں۔ یعنی ایسے باغیچے جن میں قیام بھی کیا جاسکے۔

ع د و

الْعِدَاءُ وَالْعِدْوَاءُ کے معنی ہیں دوری۔ اَلْعِدَائِی - اجنبی لوگ جو ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ اَلْعِدْوَةُ - دور جگہ۔ اَلْعِدْوَةُ (ع) ہر تینوں حرکتیں) کنارہ۔ اَلْعِدَائِی - وہ لکڑی جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے (اس طرح وہ دونوں لکڑیاں ایک دوسرے سے دور رہتی ہیں)۔ تَعَادَلِ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے دور ہونا*۔ گویا اس مادہ میں ایک بنیادی مفہوم دوری کا پایا جاتا ہے۔

اسی بُعد اور افتراق کی وجہ سے عِدُوٌّ وَّ دُشْمَنٌ کہہ رہے ہیں۔ یعنی صَدِیقٌ* (دوست) کی ضد۔ نِیْزٌ وَّ اِلَیَّ کی ضد (یعنی جو مددگار نہ ہو)۔ تَعَادَلِ الْقَوْمُ*۔ قوم نے ایک دوسرے سے دشمنی رکھی*۔ اَلْعِدَائِی - وہ دشمن جس سے تمہاری جنگ ہو۔ اَلْعِدَادِیَاتُ*۔ مجاہدین کے دوڑنے والے گھوڑے۔ (یعنی دور دور تک دوڑ کر چلے جانے والے)۔

عَدَا - یَعْدُوْ - عَدُوٌّ - عَدُوٌّ وَّ اَنَا - تَعَادَاءُ کے معنی ہیں تیز چلنا۔ دوڑنا۔ تَعَادَاؤُا کے معنی ہیں انہوں نے تیز رفتاری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا*۔ رَاغِبٌ نے کہا ہے کہ عَدُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھنا اور باہمی تطابق و ہم آہنگی نہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صورت محض رفتار کے اعتبار سے ہو تو اسے عَدُوٌّ کہا جاتا ہے اور اگر دلی کیفیت کے اعتبار سے ہو تو یہ عَدَاوَةٌ کہلاتی ہے، اور اگر عدل و انصاف میں ابتری سے ہو تو عَدُوٌّ وَّ اَنَا کہلائیگی*۔ عَدَا عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس نے اس پر ظلم کیا۔ یعنی حد سے تجاوز کیا۔ تَعَادَاہُ - وہ اس سے تجاوز کر گیا، آگے بڑھ گیا۔ اور اِعْتَدَلِ عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس پر ظلم و زیادتی کی*۔ عَدُوٌّ وَّ اَنَا کے معنی بزور اور بدترین طریقہ سے، حد سے تجاوز کرنا بھی ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں حد سے بڑھنا اور ایسے معاملہ میں آگے بڑھ جانا جس میں ایک خاص حد میں رہنا چاہئے تھا۔

اَعْدَائِی الْاَمْرَ - وہ ایک معاملہ سے دوسرے کی طرف بڑھ گیا۔ اَعْدَاہُ الدَّعَا - بیماری اس کے ساتھ دوسرے کو لگ گئی۔ مرض متعدی ہو گیا*۔ التَّعَادِیُّ ناہموار جگہوں کو کہتے ہیں*۔ اَلْعِدْوَةُ کے معنی ہیں بیماری کا متعدی ہونا۔ نیز کسی والی یا امیر سے ظالم کے خلاف مدد طلب کرنا**۔

قرآن کریم میں قصہ "آدم میں ہے کہ جب انسانوں نے "امت واحدہ" کے بجائے باہمی تشت و افتراق (مشاجرت) کی زندگی شروع کر دی تو ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل ہو گئیں اور ان میں دوری اور بُعد پیدا ہو گیا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ * (۲/۱۶)۔ اس کے برعکس زندگی بَيْنَ قَتْلُوْكُمْ بَيْنَ قَتْلُوْكُمْ (۱۶/۲) کی ہے، جس میں دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جائے جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے میں جذب ہو جاتا ہے۔ باہمی عداوت سے التَّعَادِيٰ نامہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ مادہ مَوَدَّة کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۱۶)۔

سورة بقرہ میں اَعْتَدَآءٌ اور عِيَصِيَانٌ مرادف معنوں میں استعمال ہونے میں (۲/۱۶)۔ یعنی سرکش اور حدود فراموش۔ اسی طرح عَدُوٌّ وَّ اَن کا لفظ تَقْوٰی کے مقابل میں آیا ہے (۲/۱۶)۔ تقویٰ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (حدود اللہ) کی نگہداشت کرنا۔ لہذا عَدُوٌّ وَّ اَن کے معنی ہونے حدود فراموشی۔ حد سے تجاوز کر جانا۔ (۱۶/۲) میں یہ لفظ (عَدُوٌّ وَّ اَن) اس زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے سزا کہا جاتا ہے۔ یعنی ظالموں کو۔ و خود ان کا عدوان گھیر لیتا ہے۔ سورة مائدہ میں عَدَاوَةٌ اور بَغْضَاءٌ اکٹھا آیا ہے (۱۶/۲)۔ سورة کہف میں ہے وَلَا تَعْدُوْا عَيْنَاكَ عَنْهُمْ (۱۶/۲)۔ تم انہیں (Over Look) نہ کرو۔ نظر انداز نہ کرو۔ (۱۶/۲) میں عَدُوٌّ وَّ اَن کے معنی کنارہ ہیں۔

قرآن کریم میں جرم کے لئے اِثْمٌ اور عُدُوٌّ وَّ اَن کے الفاظ بالعموم اکٹھے آئے ہیں (مثلاً ۲/۸)۔ اِثْم کے معنی ہیں ایسا کام جس سے انسان کی صلاحیتوں میں کمی آجائے اور اس لئے وہ دوسرے افراد کارواں کے ساتھ نہ چل سکے بلکہ ان سے پیچھے رہ جائے (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م)۔ اور عَدُوٌّ وَّ اَن کے معنی ہیں سرکشی کر کے آگے بڑھ جانا۔ اسلالم کا نظام یہ ہے کہ تمام افراد امت باہمدگر، بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں (دیکھئے عنوان س۔ ل۔ م)۔ جو شخص جماعت سے بچھڑ کر پیچھے رہ گیا (اِثْم) وہ بھی مجرم ہے اور جو سرکشی اختیار کر کے ان سے آگے نکل گیا (عَدُوٌّ وَّ اَن) وہ بھی مجرم ہے۔ اور اگر عَدُوٌّ وَّ اَن کو تَعْدِيَّة سے لیا جائے تو اس سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر متعدی ہو، یعنی جن کے

* تفصیل ان امور کی ا۔ د۔ م اور ش۔ ج۔ ر کے عنوانات میں دیکھئے۔

اثرات سے دوسرے افراد معاشرہ بھی متاثر ہوں، اور اِثْم سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر اس شخص کی ذات تک محدود رہے۔ (مزید تفصیل ا۔ ث۔ م کے عنوان میں دیکھئے)۔

عَذَابٌ (۱۳۲) - حدود شکنی یا سرکشی کرنے والا۔ تَعَذَّلَی (۴۴۹) تجاوز کرنا۔ حد سے آگے بڑھ جانا۔ اِعْتَدَلَی (۱۳۸) زیادتی کرنا۔ مُعْتَدِلٌ (۱۶۰) - زیادتی کرنے والا۔ اس کی جمع مُعْتَدِلُونَ اور مُعْتَدِلُونَ ہے۔

ع ذ ب

اس سادہ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہیں (۱) پانی کی خوشگوار اور شیرینی جو پیاس کو روک دیتی ہے۔ (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہوتی ہے۔ اور (۳) بندش، منع کرنا، اور رکاوٹ*۔ ان معانی کو سمجھنے کیلئے صحرائے عرب کی زندگی کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ وہاں پانی بہت کمیاب تھا، اور پھر شیریں پانی؟ یہ نعمت بڑی تلاش و جستجو، محنت و مشقت اور لڑائی جھگڑوں کے بعد ملا کرتی تھی۔ کئی کئی دن اس سے رکنا پڑتا تھا (یعنی بغیر پانی کے رہنا پڑتا تھا) تب کہیں جا کر آب شیریں حاصل ہوتا تھا۔ اس نقشہ کو سامنے رکھتے اور پھر اس سادہ کی تفصیلات پر غور کیجئے۔ اَلْعَذَابُ - خوشگوار شیریں پانی۔ قرآن کریم میں ہے اَلْعَذَابُ فَرَاتٌ (۲۵۵)۔ یہ خوشگوار اور شیریں (پانی والا) ہے۔ اِسْتَعَذَبَ الْقَرْجُلُ مَاءَهُ - وہ شخص میٹھا پانی لایا۔ اور اَعَذَبَ الْحَوَاضَ کے معنی ہیں نالاب میں پانی کے اوپر جو تنکے وغیرہ پڑ گئے ہوں انہیں صاف کر دینا۔ اَلَا عَذَابَ - دو خوشگوار چیزیں - یعنی کھانا اور لذت جماع - یا شراب اور لعبِ دہن*۔

اب اذیت اور تکلیف کا پہلو لیجئے، عَذَابٌ ان تنکوں (یا کوڑے کرکٹ) کو کہتے تھے جو پانی کے اوپر پڑ جائیں اور اس طرح اسے مکدر کر دیں۔ ان کوڑے کی چندیسوں کو بھی کہتے ہیں جسے نوحہ کرنے والی عورتیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ عَذَابَةٌ ایک درخت جسے کھسا کر اونٹ مر جائے ہیں۔ عَذَابٌ - سزا، نیز بھوک، پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں*۔

اب بندش اور رکاوٹ کے مفہوم کو لیجئے۔ عَذُوبٌ اور عَذَابٌ اُس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے

کھانا پینا چھوڑ دے۔ جو بغیر کچھ کھائے رات گزار دے اسے بھی عَذَابٌ کہتے ہیں*۔ نیز اسے بھی جسے حفاظت اور سایہ کے لئے جہت نصیب نہ ہو**۔ لہذا بھوک، پیاس، تکلیف، خانماں خرابی، سب کیلئے عَذَابٌ کا لفظ آیا ہے۔ روکنے کیلئے عَذَابٌ عَنْ الشَّمْسِ عَوْءٌ أَعْذَبُہُ وَأَسْتَعْذِبُہُ کہتے ہیں۔ یعنی اسے کسی چیز سے روک دیا***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معانی کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا نہ ہی ان سب کو کسی ایک معنی پر متحد کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام سختیوں اور تکلیفوں کیلئے جو فرعون کی قوم غالب اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھا کرتی تھی عَذَابٌ کا لفظ استعمال کیا ہے (مثلاً ۲۰۶)۔ اور سورہ بقرہ کے شروع ہی میں مُقْلِحُونَ (کامیاب اور کامران گروہ) کے مقابلہ میں لَہُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲) لا کر بتا دیا ہے کہ عَذَابٌ کے معنی زندگی کی خوشگوار یوں سے محرومی و ناکامی ہیں۔ ایسی محرومی کہ پھر زندگی کی شیرینیوں سے متمتع ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہے۔

نیز یہ لفظ جرم کی اس سزا کے لئے بھی آیا ہے جو عدالت سے ملتی ہے (۲۵۰؛ ۲۵۱)۔ اس میں اذیت کے مقابلہ میں روکنے کا پہلو زیادہ نمایاں ہے کیونکہ سزا سے مقصود ہی جرائم کی روک تھام ہے۔

خدا کی طرف سے عَذَابٌ کے معنی ہیں انسانوں کے غلط کاموں کے تباہ کن اور ہلاکت انگیز نتائج۔ اس اعتبار سے اللہ کو مُعَذِّبٌ کہا گیا ہے (۱۶۶)۔ اور جو اس طرح تباہ و برباد ہو جائے وہ مُعَذَّبٌ ہے (۲۱۳)۔

قرآن کریم کی رو سے دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری، خدا کا عذاب ہے (۲۳۳)۔ بھوک اور خوف، عذاب ہے (۱۱۲)۔ برکاتِ سماوی اور ارضی کے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (۹۶)۔ گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (۶۵)۔ باہمی اختلاف، عذاب ہے (۳۳)۔ [اختلافات کا مٹ جانا رحمت ہے۔ ۱۱۸؛ ۱۱۹]۔ یہ عذاب خداوندی کی طرف چند شکلیں ہیں۔ تفصیل اس کی قرآن کریم کے صفحات میں شروع سے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

عذر

أَلْعَذْرُ - ایسی کوشش جس سے انسان اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کو مٹا دینا چاہے****۔ نیز وہ حجت جسے انسان بطور اعتذار پیش کرے*****۔

* تاج و لین - ** لین - *** تاج و محیط - **** راغب - ***** محیط -

ابن فارس نے اس کے معنی لکھے ہیں انسان کا مجھض باتوں سے ان اعتراضات و الزامات کو رفع کرنے کی کوشش کرنا جو اس پر عائد کئے جائیں۔ عذْرَةٌ کے اصلی معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہیں۔ اس کے بعد ان نجاستوں اور گندگیوں کو کہنے لگے جو ان میدانوں میں پھینکی جاتی ہیں *۔ عَذْرَ الشَّيْءِ - چیز کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔ پھر (سلب خاصیت کے طور پر) باب افعال سے نجاست اور آلودگی کو الگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوئے لگا۔ چنانچہ عَذْرَ الْغَلَامِ لَعَذْرًا کے معنی ہیں اس نے لڑکے کا ختنہ کر دیا۔ لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عذْرَةٌ کہتے ہیں۔ دوسری طرف عَذْرَ الرَّجُلِ لَعَذْرًا کے معنی ہیں اس آدمی کے عیوب بہت زیادہ ہو گئے۔ عَذْرَتِ الدَّارِ - گھر میں غلاظت بہت ہو گئی۔ لَعَذْرَتِ الثَّمَنَازِلِ - مکانوں کے نشانات مٹ گئے **۔ اس مادہ کے اسی قسم کے مختلف معانی کے پیش نظر ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں قیاس کو بالکل دخل نہیں، بلکہ اس کا ہر لفظ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض اس کے معنوں میں آلودگیوں کا زیادہ ہو جانا بھی اور آلودگیوں کے نشان کا مٹ جانا بھی۔

سورة مرسلات میں ہے عَذْرًا أَوْ تَعَذْرًا (۴۰)۔ سورة روم میں مَعَذِرَتُهُمْ (۳۰) آیا ہے۔ یہاں مَعَذِرَةٌ مصدر بمعنی عذر ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے معنی عذر خواہی اور معذرت کے علاوہ حجت بھی ہیں **۔ اور سورة فیمہ میں مَعَاذِ يَوْمِهِ (۱۵) ہے، جس کا واحد مَعَاذٌ ہے۔ لغت بمن میں مَعَاذِ يَوْمٍ کے معنی پردے اور حجابات ہیں۔ اس طرح الثَّقَلِ مَعَاذِ يَوْمِهِ کے معنی اصل حقیقت پر پردے ڈالنا ہونگے۔ نیز اس کے معنی حجتیں پیش کرنا بھی ہیں۔

سورة توبہ میں ہے لَا تَعْتَذِرُوا (۱۶) جس کے معنی بہانہ بازی کرنا ہیں۔ عَذْرَ کے معنی ہیں ایسا عذر پیش کرنا جو ثابت نہ ہو **۔ چنانچہ سورة توبہ میں مَعَذِرَتُهُمْ (۱۶) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والے۔ بہانہ سازی کرنے والے۔ کوتاہیاں کرنے والے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ان لوگوں کے ہیں جن کے پاس کوئی عذر تو نہ تھا لیکن وہ بتکلف عذر بناتے تھے۔ تَعَذَّرَ الْاِمْرُؤُ عَمَلِيَّتِهِ۔ اس پر کام مشکل یا دشوار ہوا۔

لہذا عذر^۲ جہاں سچے دل سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو اپنی خطا کا احساس ہے اور وہ صحیح طور پر بتاتا ہے کہ اس سے ایسا کیوں ہوا، یہ عذر مستحسن ہے۔ لیکن دوسری قسم کا عذر یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر اپنے قصور کی غلط توجیہ کرتا ہے اور اس طرح محض باتوں سے اس کا ازالہ کر دینا چاہتا ہے۔

عرب

الْعَرَبُ - الْعَرَبُ - اہل عرب - راغب نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کو الْعَرَبُ کہتے ہیں*۔ لیکن صاحب تاج کے نزدیک يَعْرَبُ بَنٌ قَحْطَانٌ کی اولاد عرب عاربہ کہلاتی ہے۔ یہ شخص یعنی قبائل کا جد اعلیٰ تھا اور اسی نے پہلے پہل عربی زبان میں گفتگو کی تھی**۔ (لیکن یہ توجیہ کچھ وقیع نظر نہیں آتی)۔ لَا عَرَابُ - عَرَابِيٌّ کی جمع ہے۔ یہ لفظ بادِیہ نشین (یعنی دیہات اور جنگلوں میں رہنے والے) عربوں کے لئے مختص ہو گیا***۔ قرآن کریم میں لَا عَرَابُ (۹۶) انہی بادِیہ نشینوں کو کہا گیا ہے۔

الْعَرَبِيَّةُ - واضح کرنے والا - فصیح*۔ لَا عَرَابُ - کسی بات کو صاف اور واضح کر دینا - بولنے میں غلطی نہ کرنا - عَرَبْتُ لَهٗ الْكَلَامَ - میں نے اس سے بات کھول کر کہدی**۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں آتا ہے حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳۳) یا قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۱۴۱)۔ یا لِسَانًا عَرَبِيًّا (۱۴۲)۔ تو اس کے معنے صرف عربی زبان کا قرآن نہیں، بلکہ اس کے معنے ہیں واضح کتاب۔ ایسی کتاب جو ہر بات کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ چنانچہ سورۃ زمر میں قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (۳۸) کہہ کر اس کی وضاحت کردی۔ یعنی ایسی واضح کتاب جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔

الْعَرُوبُ - وہ بیوی جو اپنے شوہر کو محبوب ہو۔ اس کی عاشق ہو۔ اپنی محبت کو ظاہر کرتی ہو۔ اس کے ساتھ ہنستی بولتی ہو****۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے (۱) کھولنا اور واضح کرنا (۲) نشاط اور طیب نفس (۳) جسم یا عضو میں خرابی کے ہیں۔ نشاط اور طیب نفس سے، عَرُوبٌ خوش دل اور پر نشاط عورت کو کہینگے، لیکن عَرَبَتْ مَعِيْدَتُهُ کے معنے ہیں اس کا معدہ خراب ہو گیا۔ اس اعتبار سے امْرَأَةٌ عَرُوبٌ خراب اور بد اطوار عورت کو بھی کہتے ہیں۔ عَرُوبٌ کی جمع عَرُوبٌ ہے۔

*راغب - **تاج - ***محیط - ****ابن قتیبہ (القرطبی - ج/۲ صفحہ ۱۵۴)۔

”جنت“ کی بیویوں کے متعلق ہے عَرُبًا آثَرَابًا (۵۶)۔ لیکن سباق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ (سجبت اور پیار کے علاوہ، جو ایک اچھی بیوی کی بنیادی صفت ہے) اس سے مراد شائستہ، مہذب، فصیح الکلام، واضح اور صاف باتیں کرنے والیاں بھی ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے عہد جاہلیہ کی (غیر تربیت یافتہ) عورت کو غَیْرُ مَبِیِّنٍ (۳۸) کہا ہے۔ یعنی جو متنازعہ فیہ امور میں اپنی بات کو واضح طور پر بیان نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہی عورتوں کو جب قرآنی معاشرہ میں صحیح تربیت ملی تو وہ تمہایت فصیح اور واضح باتیں کرنے والی ہو گئیں۔

الْمَبِیِّنَاتُ یُتَّبَعْنَ۔ صرف واضح بات کرنے ہی کو نہیں کہتے، بلکہ دلیل کے ساتھ بات کرنے کو بھی کہتے ہیں*۔ لہذا قرآنی معاشرہ میں مرد اور عورتیں سب کی باتیں صاف، واضح اور دلیل کے ساتھ ہوتی ہیں۔

ع ر ج

عَرَجٌ۔ اوپر چڑھنا۔ عَرَجَ فِی الدَّرَجَاتِ۔ سیڑھی پر چڑھنا۔ مَعْرَجٌ سیڑھی (جمع مَعَارِجٌ)۔ مَعْرَجٌ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا)۔ عَرَجٌ۔ یَعْرَجُ۔ اس کے پہاؤں میں کوئی چیز لگ گئی اور اس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگ گیا۔ یہ لنگڑا پن عارضی ہوگا۔ مستقل طور پر لنگڑانے کے لئے عَرَجٌ یَعْرَجُ کہیں گے۔ اَعْرَجٌ۔ لنگڑا لنگڑا*۔ (یعنی وہ آدمی جو ہموار زمین پر ایسے چلے جس طرح کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) عارضی یا مستقل جھکاؤ اور ٹیڑھ پن (۲) بلندی اور ارتقاء کے ہیں۔ اَلْعَرَجُ۔ لنگڑا ہونا، اس اعتبار سے ہے کہ لنگڑا آدمی ٹیڑھا چلتا ہے۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے سلسلہ ارتقاء کے ضمن میں آیا ہے۔ یَدَبِیْرُ الْاَیَّامِ مِنَ السَّعْمَاءِ الَّتِیْ لَا رُحْرُ۔ خدا کسی اسکیم کو اپنے قانون مشیت کی رو سے طے کرتا ہے۔ پھر اس کا آغاز پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ ثُمَّ یَعْرَجُ الَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِیْقَادَہُ الْاَلْفِ سَنَۃً مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۴)۔ پھر وہ شے اس نقطہ آغاز سے بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھتی ہے اور ایک ایک مرحلہ کو ہزار ہزار سال (اور پچاس پچاس ہزار سال (۶۰) کی مدت میں طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسی نہج

سے خدا نے اپنے آپ کو ذی "الْمَعَارِجِ" (۳۰) کہا ہے۔ "سیڑھیوں والا خدا"۔ یعنی جو اس طرح بتدریج تمام اشیاء کو ان کی ارتقائی منازل طے کراتا ہے۔ وہ خدا صراطِ مستقیم پر بھی ہے (۱۱۱)۔ یعنی ایک توازن بدوش سیدھے راستے پر۔ اور اس کے ساتھ ہی ذی "الْمَعَارِجِ" بھی "صراطِ مستقیم" پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کائنات کو آگے کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک دفعہ اس کائنات کو بنا دیا اور اب یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں ایک ساکن اور جامد ڈھیلے کی طرح پڑی ہے، بلکہ یہ کہ اس میں حرکت ہے اور یہ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ (Dynamic) ہے۔ نیز اس کی حرکت خطِ مستقیم پر (Linear) ہے۔ دوری (Cyclic) نہیں۔ یہ تصور یونانیوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ اوپر کی طرف بھی چڑھ رہی ہے۔ یعنی اس میں ارتقاء بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یعنی ہر آن آگے بڑھنے والی اور اوپر چڑھنے والی۔ قوانین خداوندی کی یہی راہ ہے جس پر چلنے کی تاکید انسان کو کی گئی ہے۔ یعنی انسان کو بھی ساکن اور جامد نہیں رہنا چاہئے۔ اسے آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا چاہئے (Progressive and Ascending)۔

أَعْرَجُ بمعنی لنگڑا سورۃ نور میں آیا ہے۔ وَلَا عَلٰی الْأَعْرَجِ (۲۳)۔ چونکہ لنگڑے کی ٹانگ میں خم ہوتا ہے اس لئے کھجور کے خوشے کی خمیدہ ڈنڈی کو عُرْجُونُ* (۳۶) کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الْأَعْرَجُ الطَّيْرُ بِقِيَ* کے معنی ہیں راستہ ٹیڑھا ہو گیا۔

أَلْعَرَجُ* اسی سے نونے تک اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ابن فارس)

ع ر ج ن

عُرْجُونُ* (دیکھئے ع۔ ر۔ ج)۔ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی۔ (۳۶)

ع ر ر

الْعَرَّةُ۔ الْعُرَّةُ۔ الْعُرَّةُ*۔ خارش کی بیماری۔ الْعَمْرَةَ*۔ ہر قسم کی مضرت، تکلیف، اذیت، گزند یا نقصان۔ نیز گناہ و قصور کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عَرَّةٌ* اس نے اسے تکلیف دی*۔ سورہ فتح میں ہے فَتَصَدِّجْكُمْ مِّنْهُمْ مَّعْرَّةٌ* (۳۸)۔ تمہیں انکی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔ عَرَّةٌ*۔ لَعْنَةُ*۔ کسی کے پاس جانا اور بغیر سوال کئے اس کا احسان طلب

کرنا - بخشش طلب کرنے کے لئے کسی کے سامنے آنا - ابن القطاع نے کہا ہے کہ **الْمُعْتَشِرُ** ملنے والے کو کہتے ہیں، لیکن اہل لغت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ **الْفَتَانِيعُ** تم وہ ہے جو سوال کرے (دیکھئے ق - ن - ع) اور **مُعْتَشِرٌ** وہ ہے جو تم سے کچھ لینے کیلئے تمہارا چکر لگائے خواہ زبان سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے * - اس کا مطلب مصیبت زدہ یا حاجت مند ہی ہے - قرآن کریم میں **الْفَتَانِيعُ** وَالْمُعْتَشِرُ (۲۶) اکٹھا آیا ہے، مطلب مصیبت زدہ سے ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس محتاج کو کہتے ہیں جو ہر وقت تمہارے ساتھ چمٹا رہے اور تمہارا پیچھا لے لے - اس لئے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ”کسی چیز کو کسی خراب چیز کے ساتھ لتھیڑ دینے“ کے بھی آتے ہیں -

عرش

الْعَرْشُ - کسی چیز کا رکن - ستون - گھر کی چھت - یا وہ سہارے جس پر چھت کھڑی ہو - سائبان * - راغب نے کہا ہے کہ **الْعَرْشُ** دراصل ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں - اسکی جمع **عُرُوشٌ** ہے - نیز بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ (تخت) کو بھی کہتے ہیں ** - اسی سے اس کے معنی حکومت و سلطنت اور قوت و اقتدار کے ہو گئے - صاحب لطائف اللغة نے اس کے معنی غلبہ اور قوت کے کئے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بنائی ہوئی چیز میں بلندی کے ہیں -

سورہ النمل میں ملکہ سبا کے متعلق ہے وَلَمَّا عَرَّشَ عِظِيمُ (۲۳) - اسکا بہت بڑا تخت تھا - سورہ بقرہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (۲۵۶) - اس بستی کے مکانات اپنی چھتوں یا ستونوں پر گرے پڑے تھے - جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ (۲۴۲) - ایسے باغات جن میں اس قسم کی بیلین ہوں جو بانس وغیرہ کی ٹٹیوں پر چڑھائی جائیں - جیسے انگور کی بیلین -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے **عَرْشٌ** کا لفظ متعدد بار آیا ہے - مثلاً **هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ** (۲۶) - اس کے معنی اقتدار اعلیٰ - مرکزی کنٹرول کے ہیں - یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اسکا اقتدار اور کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں ہے - اور یہ کنٹرول اسکی بڑی محکمہ گرفت

میں ہے، جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آسکتی۔ ثمّ "استتویٰ" علیّ العرش (۵۳)۔ "استتویٰ" کے معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھنا۔ یعنی پوری طرح غالب آجانا ہیں۔

سورہ ہود میں ہے وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْأَمْعَارِ (۱۱)۔ اسکا عرش (مرکزی اقتدار) پانی پر ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَعَارِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱)۔ ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی عطا کی ہے۔ یعنی حیات کا سرچشمہ پانی ہے۔ اسکی تائید دور حاضر کی تحقیق سے ہو رہی ہے کہ پانی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ حیات کی جل پری نے آنکھ ہی پانیوں میں کھولی ہے۔ لہذا جب قرآن کریم نے کہا کہ خدا کا عرش پانی پر ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ سرچشمہ حیات پر واحد کنٹرول خدا کا ہے۔ خدا کا یہ کنٹرول اسکے قانون کی رو سے کار فرما ہے۔ اسنے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے۔ خارجی کائنات کی طرح انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کیلئے بھی خدا کا قانون ہے (جسے وحی کہتے ہیں)۔ انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا گیا ہے اسلئے اسے اسکا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو خدا کے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اپنے لئے کوئی اور قانون وضع کر لے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ، قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے زندگی کے خوشگوار نتائج مرتب کر لے۔ نتائج ہمیشہ قانون خداوندی کے مطابق ہی مرتب ہونگے۔ اس پر صرف خدا کا کنٹرول ہے، کسی اور کا نہیں۔ خدا کا عرش تمام کائنات پر بچھا ہوا ہے۔

ع ر ض

عرش* کے معنی ہیں کسی چیز کا ظاہر ہو جانا، یا کسی کے سامنے پیش کرنا (۳۶)۔ عرش لہ کذا۔ اسے ایسا مساجرا پیش آیا۔ سرمری طور پر کوئی چیز اسے نظر آئی۔ عرش علیہ کذا۔ اسے فلاں چیز دکھلائی۔ عرش الشقیی*۔ چیز ظاہر ہو گئی۔ ألعارض*۔ وہ چیز جو تمہیں پیش آئے یا تمہارے سامنے آئے۔ ألعارضة*۔ دروازے کی چوکھٹ کی بالائی لکڑی جس میں دروازہ گھومتا ہے۔ ألعارض*۔ وہ بادل جواق میں پھیلا ہوا ہو* (۲۱)۔ ألعرض*۔ کسی چیز کی چوڑائی کسو کہتے ہیں*۔ قرآن

کریم میں جنت کے متعلق ہے عَرَضَتْهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۲۹) جسکی وسعت اور کشادگی تمام ارض و سماء (ساری کائنات) جتنی ہے۔
 أَعْرَضَ عَنْهُ۔ اس سے اعراض کر لیا۔ پیٹھ موڑ لی۔ عَرَضَ الْفَرَسُ
 فِي عَدْوٍ۔ گھوڑا اپنی دوڑ میں ہر اور مینے کو ایک طرف ٹیڑھا کر کے
 دوڑا۔ یعنی اپنے آپ کو سیدھا رکھنے کے بجائے چوڑائی (عرض) میں رکھ کر دوڑا۔
 اعْتَرَضَ۔ کسی چیز کا اس طرح سامنے آجانا کہ اس سے راستہ رک
 جائے۔ عَرْضَةٌ (۲۴)۔ آڑ۔

الْعَرْضُ۔ گھر کا ساز و سامان۔ مال و دولت۔ (۲۳)۔ سورة اعراف
 میں ہے يَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّذِي أُتِيَ بِالْبَيِّنَاتِ۔ یہ لوگ پیش
 پا افتادہ مفاد (ساز و سامان) حاصل کر لیتے ہیں (اور مستقبل کا خیال نہیں
 رکھتے)۔ یہاں عَرْضُ کے معنی ساز و سامان ہیں۔ راغب نے العَرْضُ کے
 معنی ناپائدار شے بھی لکھے ہیں۔ سورة توبہ میں ہے لَوْ كَانَ عَرَضًا
 قَرِيرًا (۲۶) اگر کوئی فائدہ یا سامان ایسا ہو جو جلد مل جائے۔ یہاں بھی
 عَرْضُ کے معنی واضح ہیں۔ ***

قرآن کریم نے مَعْرِضُونَ کی تشریح تَوَلَّيْتُمْ سے کر دی ہے
 (۲۳ و ۲۴)۔ یعنی روگردانی کرنے والے۔ گریز کی راہیں نکالنے والے۔ پھر جانے
 والے۔ ایک طرف ہٹ جانے والے۔ أَعْرَضَ عَنْ الْمُنْشَرِكِينَ (۱۵)
 کے معنی ہیں فَاصْفَحَ (۱۵)۔ ان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔

ع ر ف

الْعَرَفُ۔ ہو (سہک) کو کہتے ہیں۔ عَرَفْتَهُ۔ میں نے اس کی ہو
 پالی۔ یہیں سے اس کے معنی پہچاننے کے آتے ہیں۔ راغب کے نزدیک، کسی
 چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کر لینا، مَعْرِفَةٌ یا
 عِرْفَانٌ کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا جاننا عِرْفَانٌ سے کم درجے کا
 ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اللَّهُ يَعْلَمُ کہتے ہیں (خدا کو اس کا علم ہے)۔
 اللَّهُ يَعْرِفُ (خدا کو اس کی معرفت ہے) نہیں کہتے، کیونکہ خدا کا علم
 (ہر شے کے متعلق) یقینی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ذات کا علم انسان
 کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اس کی صفات کا
 اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسے خدا کی معرفت کہہ سکتے ہیں۔ (قرآن کریم
 میں اللہ کے لئے معرفت کا لفظ نہیں آیا)۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عَارِفٌ بِلِلّٰہ (خدا کی معرفت رکھنے والوں) کے متعلق جو عام تصور ہے کہ وہ خدا کی ذات کا علم رکھتے ہیں، کس قدر غلط ہے۔ کائنات کے مشاہدہ اور قرآنی حقائق پر غور و فکر سے قوانین خداوندی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خود ذات خداوندی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا یکے بعد دیگرے۔ پے در پے ہونا۔ اور (۲) سکون اور اطمینان۔ چنانچہ اَلْعُرْفُ (اور اَلْعُرْفُ) گھوڑے کی ایال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بال یکے بعد دیگرے، پے در پے، ہوتے ہیں۔ عَرَفَ کے معنی پہچاننا اس لئے ہیں کہ نہ جانی پہچانی چیز سے انسان کو وحشت ہوتی ہے اور جانی پہچانی سے سکون و اطمینان ہوتا ہے۔ اَلْعُرْفُ - عمدہ خوشبو کو کہتے ہیں۔

عَرَفَ يَعْرِفُ - مَعْرِفَةٌ - عِرْفَانًا - کسی چیز کو پہچان لینا۔ مَعَارِفُ اَلْاَرْضِ - زمین کے جانے پہچانے راستے* - تَعَارَفُوا - انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اَمْرٌ عَرِيفٌ - جانا پہچانا ہوا کام**۔ اَلْعَرِيفُ - جو اپنے آدمیوں کو پہچانتا ہو۔ (یا ان کا تعارف کراتا ہو)۔ رئیس قوم - نقیب جو سردار کے نیچے ہوتا ہے۔ اَلتَّعْرِيفُ - کسی چیز کو پہچنوا دینا**۔

پہچاننے کے اعتبار سے بلند چیز کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْعُرْفُ - ریت کا بلند ٹیلہ یا بلند جگہ۔ اَلْعَرَفُ - بلند جگہ۔ نیز جو کھیتی ڈولوں اور کناروں پر ہو۔ قَلْبَةُ عَرَفَاءَ - بلند چوٹی - نَاقَةُ عَرَفَاءَ - بلند کوہان والی اونٹنی - اَلْعُرْفَةُ - دو چیزوں کے درمیان کی حد**۔

اِعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ - اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا**۔ (۲۱)۔ عَرَفَ فُلَانًا - فلان کو اس کے جرم کی سزا دی**۔

آگے پہچھے آنے کو بھی عَرَفًا کہتے ہیں۔ جَاءَ الْقَوْمُ عَرَفًا - قوم آگے پہچھے آئی۔ اس سے بعض نے کہا ہے کہ اَلْمُرْسَلَاتِ عَرَفًا (۶۴) کے معنی ہیں وہ فرشتے جو یکے بعد دیگرے آئیں**۔

قرآن کریم میں يَعْرِفُونَ بمقابلہ یُنْذِرُونَ آیا ہے (۸۳)۔ اسی سے اَمْرٌ بِالْمَعْرِوفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ متعدد مقامات پر آیا ہے۔

(مثلاً ۳۹/۱)۔ سورۃ اعراف میں اَلْمَعْرُوفُ وَفَتْ کی جگہ اَلْعَرَفُ آیا ہے (۱۹۹/۱)۔
 مَعْرُوفُ وَفَتْ سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم
 (Recognise) کر لے۔ اور مُنْكَرٌ*۔ وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ
 کرے۔ جنہیں وہ (Recognise) نہ کرے۔ یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح
 ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لیکر اس معاشرہ کے
 روزمرہ کے رسوم و آداب تک سب آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان رسوم و آداب
 کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہیں گے کیونکہ وہ قرآن کریم نے متعین کر
 دئے ہیں، لیکن ان کی شکل و صورت اور تفصیل و جزئیات زمانہ کے تقاضوں
 کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ لہذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین و آداب کو اپنے
 وقت میں (Recognise) کر لے وہ معروف ہوں گے، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں
 یا وہ انہیں خود تجویز کرے، حتکہ کسی قوم یا ملک کے رسم و رواج کو
 بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی مَعْرُوفُ وَفَتْ کے ذیل میں آجائیں گے۔
 لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ان میں سے کوئی چیز
 قرآن کریم کے اصول و احکام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے۔ ایسی بات منکر
 ہو جائیگی (دیکھئے عنوان ن۔ ک۔ ر)۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر اَلْعَرَفَاتُ کا بھی ذکر آتا ہے۔ وَعَنَّا
 اَلْعَرَفَاتِ رَجَالٌ يَمْعُرُونَ كَلًّا بَيْسِيْمُهُمْ* (۴۶/۱)۔ عام طور پر
 اَلْعَرَفَاتُ اس مقام کو کہا جاتا ہے جو جنت اور دوزخ کے بین بین ہے اور ان
 لوگوں کو اعراف والے سمجھا جاتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہونگی
 اور ان کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا ہوگا کہ انہیں کدھر بھیجا جائے۔ لیکن
 یہ مفہوم درست نہیں۔ قرآن کریم میں صرف اَصْحَابُ الْجَنَّةِ اور اَصْحَابُ
 النَّارِ کے دو گروہوں ہی کا ذکر ہے۔ کسی ایسے (تیسرے) گروہ کا ذکر
 نہیں جو بین بین معلق ہو۔ دوسرے یہ کہ ان اہل اعراف کا مقام اتنا بلند
 بتایا گیا ہے کہ وہ تمام اہل جنت اور اہل جہنم کو انکی نشانیوں سے پہچانتے
 ہونگے۔ لہذا باندی کے اعتبار سے (جو اَلْعَرَفَاتُ کا صحیح مفہوم ہے۔ یعنی
 بلند مقامات*)۔ یہ طبقہ بلند ترین انسانوں کا ہے۔ یہ حضرات اپنے اپنے گروہوں
 پر بطور شاہد حامی آئیں گے (۳۱/۲)۔ یہ گروہ، اَصْحَابُ الْجَنَّةِ میں سے غالباً وہ
 طبقہ ہے جسے اَلْسَّابِقُونَ اور اَلْمُقَرَّبُونَ کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۱۱/۱)۔
 یہ وہ جماعت مومنین ہے جسے شَهِدَاءُ عَنَّا النَّاسِ (۲۳/۲) کہا گیا ہے۔

حج کے اجتماع میں عَرَقات کا بھی ذکر ہے (۱۶۸)۔ یہ وہ میدان ہے جس میں تمام دنیا کی ملت اسلامیہ کے نمائندوں کا باہمی تعارف ہوتا ہے۔

سورۃ محمد میں جنت کے متعلق ہے، عَرَاقَتُہَا (۲۶)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جنت جسے ان کے لئے خوشگوار بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جنت ان کی جانی پہچانی ہے، کیونکہ اس کا تعارف قرآن کریم نے کرا دیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جنت کو خوشبو سے بسا دیا۔ لیکن اس کے معنی متعارف کے زیادہ سوزوں نظر آتے ہیں۔

ع ر م

عَرَامُ الْجَنَّةِش۔ لشکر کی تندی و تیزی، شدت اور کثرت۔ اَلْعَرَامُ مِّنَ الشَّجَلِ۔ آدمی کی تندی و درشتی، سختی اور اذیت رسانی۔ اَلْعَرَمُ۔ بند یا دیگر رکاوٹیں جنہو وادیوں میں بنا دی جائیں۔ نیز سخت بارش جسے برداشت نہ کیا جاسکے*۔

قرآن کریم میں سَبِيلُ الْعَرَمِ (۳۳) آیا ہے۔ جسکے معنی نہایت تند و تیز سیلاب کے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی سختی اور تیزی کے ہیں۔

ع ر و

عُرْوۃ*۔ بیری وغیرہ کی قسم کی خاردار جھاڑیوں یا پیلو کی قسم کے درختوں کا جھنڈ (جن کی جڑیں زمین میں پائیدار رہتی ہوں اور) جن کے ہتے سردی میں بھی نہ گریں۔ چنانچہ جب جانوروں کے لئے کوئی اور چارہ نہ رہے تو یہی درخت ان کی جان بچاتے ہیں۔ ان پر ہر موسم میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نہج سے ہر وہ شے جس پر بھروسہ کیا جاسکے عُرْوۃ* کہلاتی ہے۔ نیز ڈول وغیرہ کا دستہ جس سے اسے پکڑا جائے عُرْوۃ* کہلاتا ہے**۔ ہر وہ سہارا جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمٹے رہنے اور جم کر باقی رہنے کے ہیں۔ اسی جہت سے عُرْوۃ* کاج کو بھی کہتے ہیں جس میں ہٹن اٹکا رہتا ہے۔

سورہ بقرہ میں خدا پر ایمان کو اَلْعُرْوۃُ الثَّوْتٰی (۲۵۶) کہا ہے۔ یعنی ایسا محکم آسرا جس پر کامل بھروسہ کیا جاسکے۔ زندگی کا ایسا قانون

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج۔ *** راغب۔

جو اپنی نتیجہ خیزی میں کبھی خطا نہ کرے۔ جسکی محکمیت پر پورا پورا اعتماد ہو۔ جو کبھی دغا نہ دے۔ جو راستہ ہی میں نہ ٹوٹ جائے۔

عَرَاهُ - اَعْتَرَاهُ - اس کے سامنے آیا - پیش آیا - یعنی وہ بات اس کے سامنے اس طرح آگئی کہ اس کے اور اس بات کے درمیان کوئی آڑ نہ رہی **۔
سورہ ہود میں ہے اَعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ (۵۳)۔ ”ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر کوئی مصیبت ڈال دی ہے“۔

ع ر ی

الرَّيُّ - ننگا ہونا۔ عَرَى - يَعْرَى - عُرِيًا - ننگا ہونا *۔
قرآن کریم میں ہے لَا تَعْرَىٰ (۲۱۸)۔ تو ننگا نہ رہیگا۔ لباس کی محتاجی نہ ہوگی۔ جنتی معاشرہ میں جو بنیادی ضروریات ہر ایک کو میسر ہونگی ان میں لباس بھی ہے۔ (نیز کھانا پینا اور مکان) (۲۱۸-۱۹)۔ اَلْعَرَاءُ - کھلی جگہ جہاں کوئی چیز آڑ کے لئے نہ ہو *۔ قرآن کریم میں ہے فَتَبَدَّدْنَاهُ بِالْعَرَاءِ (۱۳۵)۔ ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈال دیا۔ نیز نَبِذَ بِالْعَرَاءِ (۶۸)۔ اَلْعَرَىٰ کے معنی ہیں کنارہ، گوشہ، صحن، آنگن نیز دیوار۔ اَعْرَاءُ الارض - زمین کے ابھرے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں *۔

[عَرَاهُ اور اَعْتَرَاهُ کے لئے دیکھئے عنوان ع - ر - و]

ع ز ب

عَزَبَ - يَعْزُبُ - غائب ہو جانا - پوشیدہ ہو جانا - دور ہو جانا۔
چلا جانا۔ اَلْمِعْزَابُ - وہ آدمی جو اپنے جانوروں کو لیکر لوگوں سے بہت دور چراگاہ میں چلا جائے۔ اَلْعَزِيبُ - وہ آدمی جو اپنے اہل و عیال سے بہت دور چلا جائے۔ اِبِلٌ عَزِيبٌ - وہ اونٹ جو شام کو اپنے گھروں پر نہ آئیں ***۔
قرآن کریم میں ہے وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ (۲۱) تیرے رب (کے علم) سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دور نہیں جاسکتی۔ غائب نہیں ہو سکتی۔ یعنی خدا کے قانون کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔

ع ز ر

الرَّعْرُءُ کے بنیادی معنی کسی کو روکنے (منع کرنے) کے ہوتے ہیں۔
عَزَرْتُ الرَّجُلَ - میں نے اس آدمی کو روک دیا۔ اِمْسِي سے تَعْزِيرٌ

کے معنی تادیب کے آتے ہیں۔ یعنی کسی کو وحد شرعی سے کم سزا دینا تاکہ وہ آئندہ جرم سے رک جائے۔ چونکہ یہ تادیبی کاروائی درحقیقت اُس آدمی کی اصلاح کے لئے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے، اس لئے اَلتَّعْزِیْرُ نصرت کو بھی کہتے ہیں جس میں تعظیم کا جذبہ شامل ہو۔**۔ قرآن کریم میں ہے وَعَزَّزْتُ مُؤْمِنَهُمْ (۱۲۴)۔ تم نے ان کی مدد کی تعظیم کے ساتھ۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں قوت بہم پہنچانا۔ تلوار اور زبان سے مدد دینا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں تعظیم و نصرت اور تعزیر (مار کی سزا) دونوں لکھے ہیں۔

سورہ اعراف میں ہے فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِم وَعَزَّزُّوهُمْ وَنَصَرُوهُمْ (۱۲۵)۔ اور سورہ فتح میں ہے لِيَتَّخِذُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِم وَتُعْزِزُوهُمْ وَتُوَفِّرُوهُمْ (۱۲۶)۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کی مدد کریں (نصرت)۔ تعظیم کریں (توقیر)۔ اور عزَّزُوهُمْ۔ اس کے مضمیٰ میں رسولؐ کی ایسی مدافعت کرنا جس سے اس کی ذات اور اس کا پیغام تمام شریک عناصر کی تخریب سے محفوظ رہے۔ یعنی رسول اللہؐ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہونے دی جائے جس سے حضورؐ کی ذات پر کسی قسم کا طعن آئے یا آپؐ کی تعظیم پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

ع ز ز

اَلْعِزَّةُ۔ قوت۔ شدت۔ غلبہ۔ رفعت اور حفاظت کو کہتے ہیں۔ بصائر میں ہے کہ عِزَّةٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔ (یعنی اپنے اندر ایسی سختی پیدا ہو جانا کہ کسی کے دبائے سے دب نہ سکے)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معنی صلابت اور شدت کے لکھے ہیں۔ اسلئے کہتے ہیں اَلْمُعْزِزُ الشَّرْمَلُ۔ ریتیلاییلہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا اور ڈھیلا ہو کر نیچے نہیں گرا***۔ اَلْمُعْزِزُ وَزَّةٌ سخت زمین۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر بارش ہونے سے اسکی مٹی یا ریت جم جائے اور وہ سخت ہو جائے۔ تَعَزَّزَتِ النَّفَقَةُ۔ اونٹنی کے تھنوں کے سوراخ تنگ ہوئے اور ان سے مشکل سے دودھ نکلا۔ تَعَزَّزَ اللَّحْمُ۔ گوشت سخت ہوا۔ لہذا عِزَّةٌ بِعِزَّةٍ کے معنی ہیں کسی پر غالب آجانا۔ اسے اپنی صلابت اور سختی کی وجہ سے زیر کر لینا (۳۸)۔ اسلئے اَلْمُعْزِزُ يَزَّةٌ۔ عقاب کو کہتے ہیں***۔ عِزَّةٌ کے مضمیٰ میں قوی ہوا۔ عِزَّةٌ۔ اسے تقویت دی (۳۶)

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و محیط۔

عَزَّ عَلَيَّ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا - مجھ پر یہ بات بڑی ہی گدراں گذری کہ تم ایسا کرو*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ذِلَّة کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵) اور اسکے معنی بتائے ہیں قوت و اختیار کا ملجانا (۲۵) - سورہ کہف میں آعَزُّ نَفَرًا (۱۸) آیا ہے - یعنی قبیلہ اور جتھے کے اعتبار سے میں زیادہ صاحب اقتدار ہوں - سورہ ص میں ہے رَفِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ (۳۸) - قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے اپنی قوت کے نشہ میں بدست ہو کر اسکی مخالفت پر اتر آئے ہیں - سورہ التوبہ میں نبی اکرم کے متعلق ہے عَزَّيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹۸) - جس بات سے تمہیں تکلیف پہنچے وہ اس پر سخت شاق گزرتی ہے -

قرآن کریم میں خدا کیلئے الْعَزَّيْزُ آیا ہے - (۲۹) - یعنی کائنات میں غلبہ و اقتدار صرف اسیکے قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسکے قانون پر غالب آسکے - انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ و اقتدار اس جماعت کو حاصل ہو سکتا ہے جو ایک مرکز کے ماتحت، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے (۳۸) - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے : اقتدار اور غلبہ صرف خدا کیلئے ہے - لیکن اس نے ایسے قوانین بنا دیے اور بتا دیے ہیں جنکے مطابق چلنے سے انسان کو بھی اپنے دائرے میں غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جاتا ہے - یہ قوانین طبعی دنیا سے بھی متعلق ہیں اور انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی متعلق - جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائیگا - یہ معنی ہیں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۲۵) کے - یعنی اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق عزت اور ذلت عطا کرتا ہے - یونہی اندھا دھند کچھ نہیں ہو جاتا -

سورہ یوسف میں الْعَزَّيْزُ (۱۲) وہاں کے رئیس کے لئے آیا ہے - یعنی صاحب اقتدار - اسی رئیس کی بیوی نے حضرت یوسف پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے - اس عورت کا نام قرآن کریم میں نہیں آیا - اسے صرف امْرَأَتُ الْعَزَّيْزِ کہا گیا ہے - (۱۲) یعنی عزیز کی عورت -

الْعِزُّ (۱۹) ایک بت کا نام ہے جسکی عہد جاہلیت میں قبیلہ غطفان پرستش کرتے تھے - (یہ لفظ اَلَا عَزَّ کا مؤنث بھی ہے) -

الْعَزَى

عرب کے زمانہٴ جاہلیت میں، قبیلہٴ غطفان کا ایک بت تھا۔ (۵۳/۱۹)
(دیکھئے عنوان ع - ز - ز)

ع ز ل

عَزَلَتْهُ عَنِ التَّمَتُّلِ وَعَزَلَتْهُ - اسے کام سے الگ کر دیا۔
فَاعْتَزَلَ - پس وہ الگ ہو گیا۔ یعنی اسے ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ہٹ
گیا۔ مَعَزُؤْلٌ - الگ کیا ہوا۔ ہٹایا ہوا۔ اَلْعَزْلَةُ - الگ ہو جانا۔
علیحدگی۔ اَلْاِعْتِزَالُ - کسی چیز کا ایک طرف ہو جانا۔ اَلْعَزْلُ - ضبط
ولادت کے لئے مادہٴ تولید کو رحم تک نہ پہنچنے دینا*۔

سورہ کہف میں ہے وَ اِذَا اَعْتَزَلْتُمْ عَنْهُمْ (۱۸/۱۶)۔ جب تم ان سے
الگ ہو گئے۔ سورہ شعراء میں ہے اَنْتَهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمْعَزُوْلُوْنَ
(۲۶/۲۶)۔ وہ سننے سے الگ ہٹا لئے گئے۔ سننے سے روک دئے گئے۔ سورہ ہود
میں ہے وَ كَانْ رَفِیْ مَعَزِلٍ (۱۱/۲۲)۔ وہ ان لوگوں سے ہٹ کر کسی الگ
جگہ میں تھا۔ سورہ احزاب میں ہے مِمَّنْ عَزَلْتَ (۳۳/۵۱)۔ جن سے تو نے
علیحدگی اختیار کی تھی۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حیض کے دوران میں فَاَعْتَزَلْ لَوْ
النِّسَاءَ - عورتوں سے الگ رہو۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَسْطِیْهُنَّ
(۲/۲۲۰)۔ اس کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی جب تک وہ حیض سے ہساک نہ
ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

ع ز م

اَعْتَزَمَ السَّجُلُ - وہ دوڑنے، چلنے نیز دیگر امور میں درمیانہ روی
پر قائم رہا۔ اَعْتَزَمَ الطَّرِیقُ - وہ راستہ پر بغیر مڑے سیدھا چلتا چلا
گیا۔ عَزَمَ عَلَى الْاَمْرِ وَ اَعْتَزَمَ عَلَيْهِ - کسی کام کو قطعی طور پر کرنے
کا ارادہ کیا۔ اس اعتبار سے عَزَمٌ اور عَزَزَ بِمَعْنٰی کے معنی ہیں کسی بات
کا فیصلہ کر کے اس پر پختگی سے جم جانا۔ مَالِیْفُلَانِ عَزَزَ بِمَعْنٰی - فلاں
آدمی کسی بات پر جمنا ہی نہیں۔ اَلْعَزْمُ - ارادے کا دھنی۔ شیر*۔
ابن قاری نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معاملہ کو حتمی اور قطعی
کرنے کے ہوتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (۲۴۰)۔ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں۔ سورہ طہ میں آدم کے متعلق ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (۲۱۵)۔ ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تَعَزَّزُوا عَقْدَةَ الثَّيْكَاحِ (۲۳۵)۔ تم نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اُولَئِكَ السَّعَازُ (۳۵)۔ عزم و استقلال والے۔ عَزَمَ اَلْاُمُورَ (۲۳)۔ معاملات میں پختگی اور عزیمت۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ اور مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال کے مالک) ہوتے ہیں۔ اور ان کے عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن اب عَزَّزْتُہ کے معنی ہیں تعویذ، اور عَزَّزْنِی الْقُرْآنُ کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعویذ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے۔ اور اَلْمُعَازُہ کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا۔

ع ز و

اَلْعِزَّةُ۔ لوگوں کا گروہ۔ جماعت۔ فرقہ۔ اسکی جمع (حالت رفعی میں) عِزٌّ وُنٌّ اور (حالت نصبی اور جری میں) عِزٌّ بَنٌّ آتی ہے۔ یعنی جماعتیں جو متفرق ہوں۔ (۱۰۰)۔ راغب کا خیال ہے کہ یہ عَزَّزْتُہ سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں منسوب کیا۔ اس طرح یہ لفظ ایسی جماعت کیلئے بولا جائیگا جو کسی کی طرف منسوب ہو، لیکن راغب ہی نے دوسرا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ عَزَّزْتُہ سے مشتق ہے جسکے معنی صبر و تسلی حاصل کر لینے کے ہیں۔ اس طرح اس سے مراد وہ جماعت بھی ہو سکتی ہے جو کسی خاص عقیدہ وغیرہ پر مطمئن ہو، یا وہ جماعت جسکے افراد آپس میں ایک دوسرے سے صبر و تسلی حاصل کر لیتے ہوں۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی منسوب ہونے اور وابستہ ہونے کے لکھے ہیں۔

عزیر

سورہ توبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزِّيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ (۱۰۰)۔ ”یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔“

عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا

مجموعہ* (کتاب) ان سے ضائع ہو چکا تھا۔ کتاب بحمیاہ۔ (باب ۸) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہ* اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرا فقیہ) نے دوبارہ مرتب کیا۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے (تفصیل میری کتاب ”معراج انسانیت“ کے باب اول ”ظہر الفسّاد“ میں ملے گی)۔

یہود لٹریچر میں ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیانات ملتے ہیں۔ جیونٹس انسائیکلو پیڈیا نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی۔

قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔ نہ ہی زمرہ* انبیائے کرام میں ان کا نام لیا ہے۔ اس لئے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ (قرآن کی اصطلاح میں) نبی تھے یا نہیں۔ یہودیوں کے ہاں ”نبی“ ہیکل کے ایک بڑے منصب دار کو کہتے تھے جس کا کام کھانت ہوتا تھا۔

”ابنیت عزیر“ کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ یہودی قرآن کریم کے اس بیان کو چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی عزیر نبی کو ابن اللہ نہیں مانا۔ ہمارے ہاں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ یہودی اس قسم کا اعتقاد رکھتے تھے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوق فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہ عقیدہ تھا*۔ لیکن یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند نہیں قرار پا سکتیں۔ یہودیوں کے موجودہ لٹریچر سے بھی ان کے اس عقیدہ کی شہادت نہیں ملتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہودی (اور نصرانی) لٹریچر میں جس طرح مسلسل رد و بدل ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے پہلے ان کے ہاں اس قسم کا عقیدہ موجود ہو اور بعد میں انہوں نے اسے اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہو۔ نیز ہمارے زمانے میں جس انداز سے عہد قدیم کے تاریخی انکشافات ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ کل کو کونسی تاریخی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آنے والی ہے؟ اس حقیقت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ (فرعون کی لاش کی طرح) مزید تحقیقات کے بعد یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی نقاب کشائی ہو جائے۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ”ابن اللہ“ مانتے تھے، اس سے مراد عزرا نبی نہیں بلکہ مصر کا ”عزیر دیوتا“ ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہیروڈوٹس نے، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام (Osiris) یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد ”س“ ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ”ایزاری“ آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سائنڈ بیل ہوجا جاتا تھا اس کا نام ”ایزار ہاپی“۔ یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ”فتاح“ یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے)۔ حضرت موسیٰؑ نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپؑ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ پروبعام اول (۹۳۳ ق۔ م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے قراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ”اسیر“ سمجھ کر اس کا ترجمہ ”قیدی“ کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔

مصر کے آثار قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے، عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ”آمن رع“ کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ابک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔

ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عزرا نبی۔ بہر حال، یہ تاریخی قیاسات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات حقیقت کو حتم و یقین کے ساتھ بے نقاب کر دیں۔

ہمارا ایمان بہر حال یہ ہے (اور یہی ہونا چاہئے) کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرفاً حرفاً سچ ہے اور اگر کسی زمانے تک کا علم انسانی بس کے کسی بیان کی تصدیق نہیں کرتا تو یہ علم کی کوتاہ دستی کا قصور ہے نہ کہ قرآن کریم کے نخیل بلند کا گناہ*۔

ع س ر

الْعُسْرُ - یہ یُسْر کے مقابلہ میں آتا ہے جس کے معنی نرمی، کشادگی، فارغ البالی کے ہیں (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر) لہذا عُسْر کے معنی تنگی، سختی، مصیبت، مشقت، کے ہیں**۔ (۱۸۵) (۲۸) - سورہ الفرقان میں ہے وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عُسْرًا (۲۸)۔ وہ دن کافرین کے لئے بڑی سختی کا ہوگا۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ معاملات میں کشادہ روی کی کمی، اور اخلاق کی تنگی، ہو جانے کو بھی عُسْر کہتے ہیں***۔ سورہ طلاق میں ہے وَلَئِنْ تَعَسَّرْتَ ثُمَّ (۱۵)۔ اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور شدت کے ہوتے ہیں۔ اگر مسوت الجھ جائے اور سلجھ نہ سکے تو کہیں گے قَدْ تَعَسَّرَ الْغَزْلُ۔ تنگ حالی اور تنگ دستی کو عُسْر کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے آسانیاں حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تم مشکلات کا سامنا کرو۔ جو مشکلات کا سامنا نہیں کرتا اسے آسانیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ (۱۲۰)۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ یہ نہیں کہ جب یُسْر (آسانیاں) مل جائیں تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اُسوقت بھی انسان کے سامنے مشکلات آئیں گی جن پر غلبہ پانے کے لئے اسے سعی و عمل کی ضرورت ہوگی۔ حیات جاوداں اندر ستیزاست۔ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اِنْ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴)۔ یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ فی الواقعہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

* اس عنوان میں ہم نے شیخ عبد القادر صاحب کے ایک مقالہ سے مدد لی ہے جو رسالہ الفرقان کی اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (لفظ Apis) - لے گوسی آف ایچٹ (Glanville) - ارلی ہسٹری آف ایچٹ (Sidney Smith) - اور آکسفورڈ جونیئر انسائیکلو پیڈیا کے حوالے دیے ہیں۔ ** تاج - *** محیط۔

ع س ع س

عَسْعَسَ اللَّيْلُ* - رات آئی یا ختم ہو گئی - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی گذر جانے کے ہیں، اور دوسروں کا خیال ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی آنے اور چلے جانے دونوں کے آتے ہیں - چنانچہ صاحب لطائف اللغة نے بھی اسے اضداد میں سے کہا ہے - لغت میں العَسْعَسَةُ کے معنی تاریکی کے ہلکا ہونے کے بھی ہیں اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب رات جانے والی اور صبح آنے والی ہو، یا دن جانے والا اور رات آنے والی ہو* - ابن فارس نے عَسْعَسَ کے معنی آنے ہی کے لکھے ہیں اور کہا ہے کہ جانے کے لئے جو عَسْعَسَ بولا جاتا ہے وہ دراصل سَعَسَعَ ہے - عَسْعَسَ اللَّيْلُ* - اس نے اس چیز کو حرکت دی - عَسْعَسَ إِلَيْكَ* - بھیڑیا رات میں گھوما* - قرآن کریم میں ہے وَاللَّيْلُ إِذَا عَسْعَسَ (۱۱۷) اس کے معنی رات کی تاریکی جانے کے ہی ہونگے کیونکہ اس سے آگے وَالصُّبْحُ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۱۸) ہے - یعنی طلوع فجر - قرآن کریم نے ان مظاہر فطرت کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۱۱۹) یہ ایک صاحب عزت و تکریم رسولؐ کی (زبان سے تم تک پہنچی ہوئی) بات ہے - یعنی جس طرح فطرت کے قوانین خدا کے متعین فرمودہ اور اہل ہنس اسی طرح قرآنی حقائق بھی خدا کے نازل کردہ اور غیر متبدل ہیں -

ع س ل

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) اضطراب اور (۲) شہد کے ہیں - اول الذکر کے اعتبار سے ہلنے والے لچکدار نیزہ کو رُمَحٌ* عَسَّالٌ کہتے ہیں - نیز جو بلبلی عوا کے زور سے سطح آب پر چلنے لگ جائیں انہیں الْعَسَّالُ کہتے ہیں - الْعَسَّالُ شہد کو کہتے ہیں - الْعَسَّالُ* - شہد کا چہتہ توڑنے والا - عَسَّالُ اللَّهِ فُلَانًا - خدا فلاں آدمی کو لوگوں میں محبوب بنائے - الْعَسَّالُ وَالْعَسَّالُ* - تیز رفتار اونٹنی - الْعَسَّالُ نیک اور صالح لوگ - الْعَسَّالُ* - نیک عمل انسان جسکی تعریف بھلی اور شیریں سمجھی جائے - هُوَ عَلَى الْعَسَّالِ مِّنْ آبِيهِ* - وہ اپنے باپ کی خصوصیات کا حامل ہے*** - قرآن کریم میں جنت کی انہار کے متعلق ہے - أَنهَارٌ مِّنْ عَسَّالٍ مُّصَفًّى (۱۲۰) - عام معنی ہیں صاف کردہ شہد کی نہریں - لیکن چونکہ یہ

سب بیان تمثیلی ہے (مَثَلُ الْجَنَّةِ) اس لئے اس سے مراد پاکیزہ، شیریں اور قابل ستائش اوصاف و خصوصیات بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں رزق کی فراوانیاں بھی مقصود ہیں۔ ”وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں“ انتہائی فراوانی کے لئے بولا جاتا ہے۔

عَسَى

عَسَى - یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں (۱) قریب ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۲) امید ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۳) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ (۴) شاید ایسا ہو جائے۔ مثلاً عَسَىٰ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا - (۹۶) قریب ہے یا امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کر دے۔ یا مثلاً سورہ تحریم میں ہے عَسَىٰ رَبُّهُ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُبَدِّلَهٗ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكَنَّ (۶۶) - ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو اس کا رب اُسے تم سے بہتر بیویاں دیدے۔ یا عَسَىٰ اَنْ تَكُوْنُوْا اَشْيَآءٌ وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲۱۶) - ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز نا پسند ہو لیکن وہ درحقیقت تمہارے فائدے کی ہو۔ دوسری جگہ اسی سورہ میں ہے - هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلَيَّ كُفْرًا اَلَّا تَقَاتِلُوْا (۲۱۶) - تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر تم پر جنگ کرنا ضروری قرار دیدیا جائے تو تم جنگ نہ کرو۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر“

ع ش ر

الْعَشْرَةُ وَالْعَشْرُونَ - دس - اَلْعِشْرُونَ - بیس - اَلْعَشِيرَةُ وَالْعَشِيرَةُ - دسواں حصہ * - فَمَا تَبَوَّآ بِعِشْرَتِهِمَا سُوْرًا (۱۱۸) - دس سورتیں لاؤ۔

عَاشَرُوا - وہ لوگ مل جل کر رہے * - یہیں سے مُعَاشَرَةُ ہے۔ عَشِيرَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں آدمی کے باپ کی قریبی اولاد یا قبیلہ۔ راغب نے اس کے معنی آدمی کے اقرباء پر مشتمل جماعت لکھے ہیں۔ اَلْعَشِيرَةُ - جماعت - گروہ *۔

ذَهَبَ الْقَوْمُ عَشَارَاتٍ - قوم ہر طرف متفرق ہو کر منتشر ہو گئی ** - عَشِيرَةٌ (۲۱۳) قبیلہ - کنبہ - نیز ساتھ رہنے والے - الْعَشِيرَةُ (۲۱۳) رفیق - ساتھی - مَعَشَرَ (۲۱۳) جماعت - گروہ - مِعْشَارٌ (۳۳۵) دسواں حصہ - عِشَارٌ (۸۱) دس ماہ کی گاہن (حاملہ) اونٹنیاں - عَاشَرَ (۱۶۹) - مل جل کر رہنا - ہنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) دس اور (۲) باہمی اختلاط ہیں -

ع ش و (ع ش ی)

الْعِشَاءُ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجانا۔ اندھا ہوجانا * - عِشَاءُ عَنَتٌ - وہ اسکی طرف سے ہٹ کر کسی دوسرے کی طرف مائل ہو گیا۔ اس سے اعراض برتا ** - چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے وَ مَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ... (۲۳۳) - جو خدا کے رحمن کے قانون سے آنکھیں پھیر لے - جو اس کی طرف سے ہٹ کر کسی دوسرے قانون کو اختیار کر لے - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں جو خدا کے ذکر سے آنکھیں بند کر لے - اس کی طرف سے اندھا ہو جائے *** - مطلب دونوں کا ایسک ہی ہے - یعنی قانون خداوندی سے اعراض برتنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھندلکا (روشنی کا کم ہو جانا) - اور کسی چیز کا کم واضح ہونا ہیں -

الْعِشَاءُ - عام طور پر اس سے مراد رات سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا اطلاق مختلف اوقات پر ہوتا ہے۔ مثلاً ابتدائی تاریکی، مغرب سے عشاء کی وقت تک - زوال آفتاب سے طلوع فجر تک کا وقت - الْعِشَاءُ وَالْعِشْيَةُ - دن کا آخری حصہ - مغرب سے عشاء کے وقت تک - الْعِشَاءُ - زوال آفتاب سے صبح تک کا وقت - زوال آفتاب سے غروب آفتاب - کبھی عِشَاءُ سے مراد رات بھی ہوتی ہے کیونکہ اس مادہ میں عِشَاءُ کے معنی تاریکی کے ہیں - شام کے کھانے کو الْعِشَاءُ کہتے ہیں - صَلَاتَا الْعِشَاءِ سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں - لیکن الْعِشَاءُ آن - مغرب اور عشاء کی نمازوں کو کہتے ہیں *** - سورۃ آل عمران میں ہے وَ سَبِّحْ بِالْعِشْيَةِ وَالْاُكْحَارِ (۳۳) - یہاں عِشَاءُ بمقابلہ اُكْحَارِ (دن کا پہلا حصہ) آیا ہے - سورۃ النّٰازِعَاتِ میں عِشْيَةً اَوْ ضُحًّیًّا (۹۶) آیا ہے - یعنی صبح کے مقابلہ میں شام - سورۃ ص میں عِشْيَةٍ کا لفظ (۳۸) دن کے پچھلے حصے کے لئے آیا ہے - سورۃ روم میں عِشْيَتَا کَا لَفْظِ حَيٰثِنَ تَطْهَرُوْنَ (۳۸) کے ساتھ آیا ہے -

* تاج - ** محیط - *** راغب - **** یہ تمام معانی تاج نے مختلف حوالوں سے نقل کئے ہیں -

سورة يوسف میں خالی عیشاء آیا ہے (۱۲/۱۶)۔ اس سے مراد پچھلا پھر،
شام کا وقت یا رات کا وقت لیا جاسکتا ہے۔ سورة نور میں مین "قَبْلَ صَلَوةِ
الْفَجْرِ کے مقابلہ میں مین "بَعْدَ صَلَوةِ الْعِشَاءِ آیا ہے (۲۴/۵۸)۔

ع ص ب

الْعَصَبُ*۔ بدن کے پٹھے بالخصوص جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں،
قوم کے بہترین آدمی۔ عَصَبُ کے بنیادی معنی موڑنے۔ لپیٹنے اور بل دینے کے
کے ہیں۔ نیز کس کر باندھنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ عَصَبُ الشَّجَرَةِ
کے معنی ہیں درخت کی متفرق شاخوں کو یکجا کر کے رسی سے کس کر باندھنا
پھر اس کے پتے جھاڑنے کے لئے اسے جھنجھوڑنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ
اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ لمبائی یا گولائی میں
باندھنے کے ہوتے ہیں۔ الْعَصَابَةُ*۔ پٹی (جو باندھی جاتی ہے)*۔ أَلَا مَرَّ
الْعَصِيْبُ*۔ سخت معاملہ*۔ هَذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ (۱۲/۱۶)۔ یہ سخت
دن ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے وہ دن مراد ہے جس نے ہر طرف سے
ان کو باندھ رکھا ہو اور انہیں گھیر لیا ہو۔ یعنی جس سے بچ نکلنا ان کے
لئے دشوار ہو۔ الْعَصَبِيَّةُ*۔ آدمی کا اپنے خاندان کی مدد کے لئے لوگوں کو
بلانا اور حق و ناحق، بہر طور، اپنی جماعت ہی کی حمایت و مدافعت کرنا۔
عَصَبِيَّةُ*۔ جماعت*۔ (ایک قدر مشترک کے ساتھ بندھے ہوئے افراد)۔ قرآن
کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ نَحْنُ عَصَبِيَّةُ
(۱۲/۸)۔ ہم ایک اچھی خاصی جماعت ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے وجہ
تقویت ہیں۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کم از کم
دس مردوں پر مشتمل جماعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے کم تعداد پر اس کا
اطلاق نہیں ہوتا۔

ع ص ر

عَصْرُ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) وقت
اور زمانہ۔ (۲) کسی چیز کو دبانا یا نچوڑنا۔ اور (۳) کسی چیز کے ساتھ
چمٹ جانا۔ عَصَرَ الْعَيْنَ*۔ انکسور کا شیرہ نچوڑ لیا**۔ سورة يوسف میں
ہے اِنِّیْ اَرَاۤیْ اَعْصِرُ خَمْرًا (۱۲/۱۶)۔ میں نے اپنے آپ کو شراب
کشید کرتے ہوئے دیکھا۔ نیز (۱۲/۱۶)۔ اَلْعَصْرُ۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام

*تاج و راغب۔ **تاج۔

کا وقت آفتاب کے سرخ ہونے تک۔ ہر طویل مدت جو غیر محدود ہو اور کچھ اُمتوں (قوموں) پر مشتمل ہو جن کے ختم ہو جانے سے وہ عصر بھی ختم ہو جائے*۔ (Age or Period) - صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معانی اَلْعَصْرُ (زمانہ) کئے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَالْعَصْرُ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَقَفِيْۙ خُسْرٍ (۱:۳)۔ زمانہ (یعنی تاریخ انسانیت) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان (جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے) وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ اَلْعَصْرُ کے معنی روکنے کے بھی ہوتے ہیں*۔ (یعنی وقت کی وہ حدیں جن کے اندر کوئی واقعہ رکا ہوا ہو)۔ اَلْعَصْرُ۔ قبیلہ اور خاندان کو بھی کہتے ہیں*۔ اَلْعَصْرُ جائے پناہ کو کہتے ہیں (ابن قارس)۔ اَلْعَصَارُ۔ بگولا۔ (جو تند و تیز ہو)۔ گرد و غبار والی تندہوا۔ (۲:۶)۔ اَلْمُعْصِرَاتِ۔ بادل یا وہ ہوائیں جو بادلوں کو لاتی ہیں*۔ وہ بادل جو برستے ہیں**۔ (۹:۱۵)۔ صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ اَلْمُعْصِرَاتِ وہ ہوائیں ہیں جو بارش لاتی ہیں اور اَلْمُبْتَسِرَاتِ وہ جو بادل لاتی ہیں۔

ع ص ف

اَلْعَصْفُ۔ کھیتی کی سبزی۔ کھیتی کے پودوں کے تنوں کے پتے جو سوکھ کر جھڑتے اور چورہ چورہ ہو جاتے ہیں۔ پودوں کے تنوں کے پتے۔ کھیتی کے پتے۔ بھوسہ۔ (غلے کے دانوں کے اوپر جو چھاکا ہوتا ہے اس کے بھوسے کو کہتے ہیں)۔ خود بال کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں اصحابُ الْفَيْلِ کے متعلق ہے کہ انہیں كَعَصْفٍ مَّاءٍ كُؤْلٍ (۱:۵) کر دیا۔ یعنی جیسے کھایا ہوا بٹھس ہو۔ یا وہ کھیتی جس کے دانے کھائے گئے ہوں، یا اسے کیڑا لگ گیا ہو۔ کلیات میں ہے کہ ہر چیز کے پتے عَصْفُ کہلاتے ہیں۔ اسی سے دانے نکلتے ہیں۔ پہلی شکل یہ ہوتی ہے کہ پتے نمودار ہوتے ہیں، پھر تنا بنتا ہے، پھر اس میں سے دانوں یا پھلوں کے خول نکلتے ہیں***۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم میں وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ (۵۵:۱۴) آیا ہے۔ یعنی وہ دانے جو چھاکے کے اندر ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پودوں کے تنوں کے وہ پتے ہوتے ہیں جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جائیں*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کھیتی اور پودوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گر چکا ہو اسے عَصْفُ کہتے ہیں****۔

الْمُعْصِفَاتُ*۔ وہ ہوائیں جو بادلوں، پتوں، اور خشک پتوں کے چورے کو اڑا کر لاتی ہیں*۔ رِيْحٌ* عَصِيفٌ - تیز چلنے والی ہوا۔ آندھی۔ جھکڑ۔ (۱۲۲)۔ اس کے مقابل میں رِيْحٌ طَيِّبَةٌ* آیا ہے (۱۲۲)۔ یعنی خوشگوار ہوا۔ سورۃ مرسلات میں ہے فَالْمُعْصِفَاتِ عَصْفًا (۲۴)۔ غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر لے جانے والی آندھیاں۔ اَلْعَصْفُ*۔ تیزی اور سرعت کو بھی کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ اَلْعَوَاصِفُ وہ تند و تیز ہوائیں ہیں جو میدانوں یا صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور اَلْعَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں طوفان لے آئیں۔

ع ص م

عِصْمَةٌ* کے اصلی معنی روکنے یا منع کرنے، نیز کسی چیز کو باندھنے کے ہیں۔ گردن کے پٹہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَعْصَامٌ* ہے۔ اَلْعِصَامُ*۔ محمل کی اس رسی کو کہتے ہیں جو محمل کو جمانے کے لئے اس کے ایک طرف باندھی جاتی ہے۔ ایسی دو رسیوں کو عِصَمَانُ کہتے ہیں۔ اَلْعِصَامُ مِّنَ الدَّقَلِ وَالْقِرْبَةِ*۔ ڈول یا مشک کی وہ رسی جس سے باندھ کر انہیں اٹھایا جاتا ہے۔ عَصَمَ الشَّيْءُ* يَعْصِمُهُ، کے معنی ہیں کسی چیز کو روک دینا۔ عَصَمَهُ اللهُ مِّنَ التَّكْرُرِ*۔ خدا نے نما پسندیدہ اور تکلیف دہ چیز سے اس کی حفاظت کی اور بچا لیا۔ عَصَمَ إِلَیْهِ اور اَعْتَصَمَ* یہ، کے معنی ہیں کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ (اَعْتَصَمَ* کے بھی معنی ہیں)۔ اَعْتَصَمَ بِاللهِ کے معنی ابن فارس نے خدا کی حفاظت میں آکر محفوظ ہو جانے کے لکھے ہیں۔ اَعْصَمَ بِفُلَانٍ*۔ اس نے فلان کو پکڑ لیا اور اس سے چمٹا رہا۔ اَعْصَمَ بِالْفَرَسِ*۔ اس نے گھوڑے کی ایال پکڑ لی تاکہ وہ گھوڑے کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس پر سے گر نہ پڑے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پکڑ لینا، تھام لینا، روکنا اور ساتھ لگے رہنا ہیں۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَمَنْ يَعْصِمْ بِاللهِ فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ* (۱۰۶)۔ جس نے قانون خداوندی کو مضبوطی سے تھام لیا اُسے زندگی کی متوازن راہ کی طرف راہِ نمانی مل گئی۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا (۱۰۷) کے بھی یہی معنی ہیں۔ سورۃ سائدہ میں ہے وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۲۵) (اسے رسول تو اس قانون خداوندی کو لوگوں

پہنچائے جا۔۔۔۔) وہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضورؐ کے جسم کی حفاظت مراد نہیں۔ اس لئے کہ آپؐ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے أَفَإِنِّ مَيِّتٌ أَوْ قَتِيلٌ (۱۳۳)۔ تو کیا اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے۔ یعنی اس میں قتل کر دئے جانے کے امکان کی وضاحت ہے، لہذا (۱۳۴) میں حضورؐ کے جسم کی حفاظت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حفاظت رسالت (پیغامات خداوندی) مقصود ہے۔

عَصَائِمُ۔ حفاظت کرنے والا (۱۳۵)۔ اسْتَعَصِمَ۔ اس نے اپنی آپکو بچانے رکھنا چاہا۔ (۱۳۶)۔ تاج نے اسْتَعَصِمَ کے معنی انکار کیا، باز رہا بھی لکھے ہیں۔ عِصْمٌ جمع ہے عِصْمَةٌ کی۔ اس کے معنی عقد نکاح کے ہیں (۱۳۷)۔ یعنی وہ عورتیں جو تمہارے نکاح میں ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں۔ ونا چاہتیں، انہیں روکے نہ رکھو۔ بلکہ انہیں عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

ع ص و

عَصَا کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں۔ لاثھی کہو اس لئے عَصَا کہتے ہیں کہ اسے ہکڑنے کے لئے انگلیوں کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے۔ عَصَوْتُ الْقَوْمَ کے معنی ہیں میں نے قوم کو جمع کر لیا۔ * اَلْعَصَا۔ جماعت کو کہتے ہیں۔ شَقَّ الْعَصَا۔ جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ * اَلْقُلِيُّ الْمُسَافِرُ عَصَاهُ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مسافر نے اپنی لاثھی ڈال دی۔ لیکن یہ معاورہ ہے یہ بتانے کے لئے کہ وہ منزل پر پہنچ کر ٹہر گیا اور پڑاؤ ڈالا۔ * صاحب لطائف اللغة نے اَلْعَصَا کے معنی اَلْوَبَيْلُ (یعنی سخت۔ گراں) کئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ (۲۰) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں اپنی جماعت کو ماتھ لیکر پتھریلی زمین کی طرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنی عصا سے چٹان کو مار۔ اس سے اسکی اوپر کی مٹی اتر جائیگی اور چشمے کا پانی باہر نکل آئیگا۔ اسی طرح اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۱) کے ایک معنی ہیں اپنی جماعت کو لیکر سمندر (یا دریا) کی طرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنا عصا ٹیکتا ہوا سمندر کے راستے چلا جا۔

عصائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۲۸) اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے * تاج و راغب۔ تاج نے لکھا ہے کہ "اَلْعَصَا۔ جماعۃ الاسلام" یعنی عصا مراد اسلامی جیت ہے۔ راغب نے معاورہ "شَقَّ الْعَصَا" کے معنی "جماعت سے الگ ہو جانا کئے ہیں۔

مراد لائھی ہوگی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنوں میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطہ خداوندی (وحی کا پیغام) ہوگا جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لئے وجہ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرین فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جاسکتے ہیں۔

ع ص ی

عَصٰی - یَعَصِیْ - عِصْیَانًا - مَعْصِیَۃً - سرکشی کرنا - نافرمانی کرنا * - وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ (۱۳۱) آدم نے اپنے نشوونما دینے والے کی نافرمانی کی۔ اصل میں اَلْعَصٰی اس اونٹ کے بچے کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہ چلے۔ ادھر ادھر نکل جائے * - عَصٰی الطَّاقِیْرِ - پرندہ اڑ گیا - عَصٰی الْعِرْقُ - رگ سے خون بند نہیں ہوا اور برابر جاری رہا * * - اَعْتَصَتِ النَّوَاۃُ - گٹھلی سخت ہو گئی - تَعَصَّی الْاَمْرُ - معاملہ شدید ہو گیا * - ان مثالوں سے اَلْعِصْیَانُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورہ حجرات میں ہے کہ جو (مؤمن) کفر و فسوق و عصیان سے نفرت کرتے ہیں، وہ اَلرَّاشِدُوْنَ ہیں (۱۱) - یعنی خدا کے تجویز کردہ صحیح راستہ پر۔ سورہ مجادلہ میں مَعْصِیَۃَ الرَّسُوْلِ (۱۸) سے روکا گیا ہے۔ سورہ مدہم میں عَصِیًّا (۱۱) نافرمان بردار کے معنوں میں آیا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ معصیت کا اطلاق بعض اوقات لغزش پر بھی ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ قانون خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ صحیح راستہ پر چلتے ہیں۔ جو اس راستہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں وہ زندگی کی تباہ کن روش اختیار کرتے نہیں۔ یہی مَعْصِیَۃً ہے۔

راغب نے عَصٰی کو عَصَا (ع - ص - و) کے تابع لکھا ہے اور کہا ہے کہ عَصٰی کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ اپنی لائھی (عَصَا) سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ نیز اس شخص کے لئے جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے فَلَانٌ شَقِیٌّ اَلْعَصَا کہتے ہیں۔ یہیں سے عَصٰی کے معنی نافرمانی کے لئے جانے لگے ***۔ لیکن یہ توجیہ کچھ جچتی نہیں۔ عَصَا کے لئے عنوان (ع - ص - و) دیکھئے۔

ع ض د

اَلْعَضِدُ - ہاتھ کا کہنسی سے لیکر کندھے تک کا حصہ - (بازو) مجازاً عَضِدَہ کے معنی ہیں اسکی مدد و اعانت کی، دستگیری کی - اَلْعَضِدُ -

جہامی و مسددگار - کسی کا دست و بازو* - قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُمْ
مُسْتَعِذِينَ بِالْمُضِلِّينَ عَصُدًا (۱۸/۱) - میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے
والوں کو اپنا دست و بازو بناتا۔

اعْضَادُ الْحَوَاضِ وَغَيْرِهِم - حوض وغیرہ کے ارد گرد جو ہشتہ
مضبوطی اور حفاظت کی خاطر بنا دیا جاتا ہے۔

ع ض ض

عَضُّ - کسی چیز کو دانتوں سے پکڑ لینا - دانتوں سے کاٹنا۔ عَضُّ
عَلَى يَدِهِ غَيْظًا - اسوقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی سے انتہائی
عداوت رکھے اور دشمنی میں بہت زیادتی سے کام لے** - سورہ آل عمران میں
ہے - عَضُّوْا عَلَیْكُمْ اِلَّا نَامِلًا مِّنَ الْغَيْظِ (۱۱۸/۱) - یعنی تمہارے
خلاف ان کی دشمنی کا یہ عالم ہے کہ یہ غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔
دراصل یہ محاورہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کوئی غصے میں اپنا ہسی کچھ بگاڑ لے،
اپنے مقابل پر اس کا بس نہ چل سکے۔

ع ض ل

الْعَضَلَةُ - پٹھا جسکے ساتھ موٹا گوشت ہو (مچھلی جو پتلی اور
بازو وغیرہ میں عوقی ہے)** - عَضَلْتُهُ - مینے اسکی مچھلی پر مارا - اسکے بعد
اسکے معنی ہو گئے کسی کو زبردستی اور سختی سے (کسی کام سے) روک
دینا - فَلَا تَعْضِلُوْهُنَّ (۲۲۲/۱) انہیں مت روکو - نیز اس کے معنی تنگ
کرنے اور مجبور کرنے کے بھی ہیں** - عَضَلَ عَلَیْهِ - اس نے اس پر تنگی
کی - اسے روکا اور باز رکھا - الْمُعْضِلَاتُ - مشکل اور پرپیچ مسائل جنہیں
سلجھایا نہ جاسکے - سختیاں - مصیبتیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے
بنیادی معنی سختی اور معاملہ میں پیچیدگی کے عوئے ہیں۔

ع ض و

الْعَضْوُ - الْعِضْوُ - بدن کا ٹکڑا - جسم کا کوئی ایک حصہ** -
(مثلاً ہاتھ، کان، ٹانگ وغیرہ) - مجموعہ کا ایک فرد - جماعت کا ایک فرد*** -
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے حصے کو دینے
کے ہوتے ہیں - اَلْعَضِيَّةُ - ٹکڑے ٹکڑے کر دینا - تقسیم کر دینا -

متفرق کر دینا۔ اَلْعِضَّةُ*۔ چیز کا ٹکڑہ۔ لوگوں کا فرقہ۔ جھوٹ۔ (یہ دراصل عِضْوَةٌ* تھا) اسکی جمع عِضْوُونَ اور عِضِيَّتُنَ* ہے۔ نیز یہ عِضَّةُ* (ہاء کے ساتھ) کی بھی جمع ہو سکتی ہے جسکے معنی سحر (جادو) کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاضِيَّةُ*۔ ساحر*۔ غالباً اس لئے کہ جادو ٹونا عام طور پر گوشت کے ٹکڑے (یا ہڈی) پر کیا جاتا ہے۔

سورہ حجر میں ہے اَلَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِيَّتِنَ* (۱۵۱)۔ جنہوں نے قرآن کریم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔***۔ جس بات سے اپنا مطلب حل ہوتا ہو اسے مان لیا۔ جو بات اپنے مفاد کے خلاف جاتی ہو اسکی جگہ اپنی خود ساختہ شریعت کا اتباع کر لیا۔ ایسی روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے (۸۵) میں دیکھئے۔

یہاں اسے معض متتروں کی طرح پڑھنے یا تعویذ گندے لکھنے کے لئے رکھ چھوڑا*۔

ع ط ف

عِطْفٌ*۔ ایک جانب۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سرنے اور ٹیڑھا ہونے کے ہیں۔ عِطْفًا الرَّجُلُ۔ آدمی کے دونوں پہلو (Sides)۔ سر سے لیکر سرین تک۔ عِطْفًا كُلُّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کے دونوں جانب۔ اَلْعِطْفُ*۔ لوٹنا۔ مڑنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے سرے کی طرف موڑ دیا جائے۔***۔ قرآن کریم میں ہے ثَانِي عِطْفِهِ (۲۴)۔ پہلو تہی کرتے ہوئے۔ عَطْفٌ۔ يَعْطِفُ*۔ عَطْفًا کے معنی مسائل ہونے کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاطِفَةُ*۔ مہربانی۔ شفقت۔ صلہ رحمی*۔

ع ط ل

عَطَلٌ*۔ عَطْوُلٌ*۔ زیور سے خالی ہونا۔ عَطِلَتِ الْمَرْأَةُ*۔ عورت زیور سے خالی ہوئی۔ ایسی عورت کو اَلْعَاطِلُ* اور اَلْعَطْلُ* کہتے ہیں۔ (اَلْمِعْطَالُ* اس عورت کو کہتے ہیں جو زیور کے بغیر رہنے کی عادی ہو)۔ اَلْعِطْلُ*۔ خالی کر دینا۔ بیکار کر کے چھوڑ دینا۔ چنانچہ اس ڈول کو جس کی رسیاں ٹوٹ چکی ہوں اور اس سے پانی نہ نکالا جاسکے اَلْعِطْلَةُ* کہتے ہیں۔ قَتْوُسٌ* عَطْلٌ*۔ وہ کمان جس پر تانت نہ ہو۔ بِشْرٌ* مِعْطَلَةٌ*۔

*تاج۔ **محیط۔ ***ابن قتیبہ (الفرطین - ج ۱/ صفحہ ۲۴۱)۔*** راغب۔

وہ کنواں جس کے آس پاس آبادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیکار ہو چکا ہو، اور اس سے ہائی نہ بھرا جاتا ہو *۔ (۲۴/۲۵)۔ سورہ تکویر میں ہے اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۱۱) جب حاملہ اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا جائیگا۔ اَلْعِشَارُ ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو بچہ دینے کے قریب ہوں۔ عربوں میں اونٹ کی جو اہمیت تھی وہ واضح ہے۔ اور ایسی اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہوں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دینے سے مفہوم یہ ہے کہ اس دور میں خود اونٹوں کی قدر و قیمت ہی نہیں رہیگی۔

عَطِّلَ الْاَجِيرُ - مزدور کا بیکار رہنا **۔

ع ط و

اَلْعَطْوُ - لینا۔ کسی چیز کو لینے کے لئے سر اور ہاتھوں کو اوپر اٹھا دینا۔ ظَبْيٌ عِطْوٌ - (عین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ) وہ ہڈن جو درخت سے پتے کھانے کے لئے اپنے سر کو اوپر اٹھائے *۔

اَلْاِعْطَاءُ - دینا۔ اَلْعَطَاءُ وَالْعَطِيَّةُ - جو کچھ دیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِيتَاءُ (دینے) اور اِعْطَاءُ میں فرق یہ ہے کہ اِيتَاءُ کسی واجب کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ایسی چیز پر بھی جو محض تفضلاً دی جائے۔ لیکن اِعْطَاءُ صرف تفضلاً دینے کو کہتے ہیں *۔ اَلْاِعْطَاءُ - سپردگی۔ اَعْطَى الْبَعِیْرُ - اونٹ نے منہ زوری ختم کی اور مطیع ہو گیا۔ قَوْمٌ عَطْوٰی - نرم اور آسانی سے کھینچ جانے والی کمان *۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۲۰)۔ جو سامان زیست نوع انسانی کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے مفت عطا ہوا ہے (یعنی رزق کے قدرتی وسائل) ان پر کوئی روک نہیں۔ جب خدا نے انہیں عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے عام کر دیا ہے تو ان پر روک کون ڈال سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے نظام ربوبیت کو قائم کرنے والوں کے متعلق کہا کہ مَنْ اَعْطٰی وَآتٰی (۲۲) جو دیتا ہے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسی کے لئے آحائیاں ہیں۔ برخلاف اس کے مَنْ يَبْخِلْ وَاسْتَغْنٰی (۲۲)۔ جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھتا ہے اور اس طرح دوسروں سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے دشواریاں ہی دشواریاں ہیں۔

* تاج و راغب - ** معیا

یہ ظاہر ہے کہ انسانی جسم کی پرورش کا مدار ہر اس چیز پر ہے جسے انسان اپنے لئے لیتا ہے۔ جسے وہ خود کھاتا پیتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نوالہ آپ کے منہ میں جائے اور پرورش میرے جسم کی ہوتی جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس، انسانی ذات (Self) کی نشوونما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اور ہر رضا و رغبت دیتا ہے۔ اسی کو إعطاء کہتے ہیں۔ قرآنی نظام کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ پوری پوری محنت کرنا لیکن اپنی محنت کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی سب نوع انسانی کی نشوونما کے لئے دیدینا۔ یہ ہے جماعت مؤمنین کا شعار زندگی۔

التَّعَاطِي * - جس چیز کا حق نہ ہو اسے لے لینا۔ باہم کسی چیز کو لینے کے لئے کشمکش کرنا۔ پاؤں کے پنجوں پر کھڑے ہونا اور ہاتھ بڑھانا۔ بہت بڑی جرات کرنا *۔ سورہ قمر میں اس سرکش کے متعلق ہے جس نے اس اونٹنی کو جسے حضرت صالح ؑ نے خدا کے نام پر چھوڑا تھا قتل کر دیا تھا کہ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَّرَ (۲۹)۔ اس نے بڑی جرات کر کے ہاتھ بڑھایا اور اونٹنی کو مار دیا۔ یعنی اس چیز کو جا لیا جس کا اسے حق نہیں تھا (ابن فارس)

ع ظ م

عَظِيم * - ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظِيمُ الْفِدَّانِ - کسان کے ہل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جسکے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ عل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ - قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے سالک ہوتے ہیں۔ عَظَمُ الطَّيْرِ - راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظَمَةُ * کے معنی تکبر و غرور۔ بڑائی۔ نیز عزت و حرمت کے بھی ہیں۔ الْعَظِيْمَةُ * - سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں عَظِيمُ (جمع عِظَامُ اور عَظْمُ) ہڈیوں کے معنی میں متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۱۶۹؛ ۱۶۸؛ ۱۶۷؛ ۱۶۸)۔ سورہ نور میں ۲۵۔ (آسان) کے مقابلہ میں عَظِيمُ کا لفظ اہمیت کا مفہوم لئے ہوئے ہے (۲۵)۔ اور النَّبَا الْعَظِيمُ (۴۸) میں سخت حادثہ یا انقلاب عظیم کے معنوں میں۔

اور الْقَرَّ أَنْ الْعَظِيمِ (۱۵۸) کے معنی ہیں زندگی کے بنیادی حقائق کا ضابطہ۔ ”عَظِيمٌ الْقَدْرُ“ کی رعایت سے، قرآن کریم وہ ضابطہ ہے جس سے زندگی کی سنگلاخ زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے۔ جس سے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں خدا کے متعلق ہے وَعَوَّالُ الْعَالِيَةِ الْعَظِيمِ (۲۵۹)۔ یعنی بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اور انسان کو شرف کی بلندیاں اور زندگی کی بنیادی قوتیں عطا کرنے والا۔ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۲۶۰)۔ جس کے قبضہ قدرت میں کائنات کی اساس و بنیاد کا کنٹرول ہو۔

ع ف ر

الْعَفْرُ - مٹی - عَفْرَةٌ فِي الشَّرَابِ يَعْفِرُہ - اسے مٹی میں لت پت کر دیا۔ مٹی میں دبا دیا۔ الَّعْفُورُ - وہ چیز جس پر مٹی مل دی گئی ہو۔ الَّعْفُورُ - موٹا۔ مضبوط آدمی۔ نیز بہادر چست آدمی۔ رَجُلٌ عِفْرٌ وَعِفْرٌ يَنْ - (نیز عِفْرٌ يَنْ) - عِفْرٌ يَنْ - چالاک اور شریر آدمی۔ نہایت تیز و طرار آدمی۔ حیرت انگیز ہوشیاری کے ساتھ معاملات میں گھس جانے والا آدمی۔ نیز ضبط کرنے والا، قوی تند خو انسان جو اپنے مد مقابل کو زیر کر لے۔

سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں سے ایک کے لئے عِفْرٌ يَنْ مِّنَ الْجِنِّ (۲۶۰) آیا ہے۔ یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل، اور چست و چالاک آدمی، جس میں قوت اور معاملات کے اندر تک گھس جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ تیز و طرار۔ زیرک اور ہوشیار۔ انتہائی معاملہ فہم۔

ع ف ریت

حضرت سلیمانؑ کے لشکر کا ایک زبردست اور شاہ زور (پہاڑی قبیلہ کا) سردار (۲۶۰) جو بہت تیز طرار اور معاملہ فہم تھا۔ دیکھئے عنوان (ع - ف - ر)۔

ع ف ف

الْعِفَّةُ - نفس کا ایسی حالت میں پہنچ جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے۔ عِفَّةٌ - عِفَّافٌ کے معنی ہیں حرام و نازیبا چیزوں

* تاج و محیط و راغب - ** راغب -

سے خود کو روکنا۔ قبائح سے رک جانا**۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اَعْتَفَّتْ الرِّبَالُ الْيَمِينُ۔ اونٹوں نے اپنی زبانوں سے خشک گھاس کو مٹی سے صاف کرتے ہوئے اٹھا لیا**۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں رک جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اَلْعَفَافَةُ اس تھوڑے سے دودھ کو کہتے ہیں جو دودھ دوہ لینے کے بعد تھنوں میں رک کر رہ جائے**۔ عَفَّتِ الرِّبَالُ۔ آدمی نامناسب چیزوں سے رکا۔ تَعَفُّفٌ۔ کے معنی ہیں تھوڑی چیز پر کفایت کر لینا*۔ بتکلف اپنے نفس کو روکنا اور کسی چیز سے دور رکھنا**۔ بے جا باتوں سے شرم و حیا کرنا۔ ضرورت کے باوجود کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا۔ (م۱۴)۔ سورۃ نور میں ہے وَ اَنۡ يَّسْتَعْفِفُوۡنَ (۲۶) اگر وہ اس کی بھی احتیاط رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ نیز وَلَيَسْتَعْفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا (۳۰)۔ جو نکاح کا سامان نہیں پاتے انہیں چاہئے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ اسی کو عفت (ہاکی بازی) کہتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی عفت پر بڑا زور دیتا ہے۔ یعنی جنسی اختلاط کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیتا ہے جسے نکاح کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنسی اختلاط سخت جرم ہے۔ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں اضطراری حالت کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں حرام تک کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے وہ اس کی تسکین کے لئے ناجائز اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔ بھوک اور پیاس انسان کے اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے ابھرتا ہے۔ اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ اس لئے جس جذبہ پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ع ف و

عَفُوٌ۔ اس کے اصلی معنی ”ترک“ کے ہیں۔ عَفَا عَنْهُ۔ اسے سزا دے بغیر چھوڑ دیا اور جائے دیا۔ معاف کر دیا***۔ قرآن کریم میں عَفُوٌ اور صَفْحٌ کے لفظ اکٹھے آئے ہیں (۱۶۰)۔ ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ صَفْحٌ بلیغ تر ہے۔ یعنی بالکل چھوڑ دینا، اور عَفُوٌ میں یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ کہہ سن کر چھوڑ دیا جائے***۔ صاحب محیط کے نزدیک عَفُوٌ اور مَغْفِرَةٌ میں فرق یہ ہے کہ مَغْفِرَانٌ میں سزا قطعاً نہیں ہوتی اور عَفُوٌ

*راغب۔ **محیط و تاج۔ ***تاج۔

سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی **۔ (سزا کے بعد عَفْوٌ سے مراد ہوگا سزا کے اثرات کو مٹا دینا۔ کیونکہ عَفْوٌ کے معنی مٹا دینا بھی ہیں۔ اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہونگے ان اثرات سے شروع ہی سے بچانے رکھنا)۔ عَفْوٌ۔ مٹا دینا۔ نیز مٹ جانا۔ عَفَا أَسْرُهُ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ اسکا نشان تک مٹ گیا۔ أَلْعَفَاءُ۔ وہ بارش جو آثار منازل تک کو مٹا دے*۔

صحاح میں ہے کہ عَفْوُ الْمَالِ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے خرچ سے زائد ہو۔ أَعْطَيْتُهُ عَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں میں نے اسے بغیر مانگے مال دیا*۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ أَلْعَفْوُ سِنِ الْمَاعِ۔ وہ پانی جو پینے والوں سے بچ جائے اور بلا کافت و مزاحمت حاصل ہو سکے۔ عَفَا شَعْرُ الْبَعِیْرِ۔ اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے۔ عَفَا عَلَیْهِ رِیَالُ الْعِلْمِ۔ وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کی معلومات پر اضافہ کیا۔ عَفَا الصَّوْفُ۔ اون کو زیادہ بڑھا کر کاٹا*۔ صاحب لطائف اللغة نے اسے اَضَاد میں سے لکھا ہے۔ یعنی اس کے معنی مٹا دینے کے بھی ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی۔

لہذا اسکے معنی ہیں ضرورت سے زائد۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلی رکھیں اور کس قدر خود اپنے لئے رکھیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الْعَفْوُ (۲/۱۹)۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ یہ ہے قرآن کریم کے نظام ربوبیت کا اصل الاصول۔ یعنی ہر فرد معاشرہ پوری پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لئے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے قرآنی نظام کے حوالے کر دے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد فاضلہ دولت (Surplus Money) ہے۔ قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس لئے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے۔

أَلْعَافِيَّةٌ وَالْمُشْعَافَةُ کے معنی ہیں دوسروں کی ایذا سے محفوظ رکھنا۔ بیماریوں اور آفتوں سے بچانا*۔ ابن اثیر نے اس کا یہ مفہوم بنایا ہے

کہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مستغنی کر دینا۔ ایک کی اذیت سے دوسرے کو محفوظ کرنا۔ گویا نہ کوئی تمہارا محتاج ہو اور نہ تم کسی کے محتاج ہو۔ اَلْمُعْتَفِيّی*۔ وہ شخص جو تمہارے ساتھ رہے لیکن تم سے کسی سلوک کا طلبگار نہ ہو*۔ طلبگار نہ ہونے کے اعتبار سے اَعْطِيَتْهُ عَفْوًا کے معنی ہیں میں نے اس کو بے مانگے دے دیا۔ نیز عَفْوُ* کے معنی بہترین چیز کے ہوتے ہیں۔ نیز وہ چیز جس میں کسی قسم کی تکلیف و مشقت نہ اٹھانی پڑے*۔

سورة بقرہ میں بنی اسرائیل کی خطا کاری کے بعد کہا ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ* (۵۲)۔ یعنی اس غلطی کے مضر اثرات کو مٹا دیا۔ اسے معاف کرنا یا درگزر کرنا کہتے ہیں (واضح رہے کہ یہ اثر اس طرح سے مٹتا ہے کہ کوئی ایسا اچھا کام کیا جائے جس کے خوشگوار نتائج پہلی غلطی کے مضر نتائج کی تلافی کر دیں)۔ (دیکھئے عنوان ح۔ س۔ ن اور س۔ و۔ ا)۔ اپنے حق کو چھوڑ دینے کے معنوں کے لئے (۱۳۴) دیکھئے۔ آگے بڑھ جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۱۴۰) میں آیا ہے۔ یعنی وہ تعداد میں زیادہ ہو گئے۔ ترقی کر گئے۔ سورة شوریٰ میں ہے وَ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ یعنی قانون عدل کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ سزا ہمیشہ جرم کی نسبت سے دی جائے۔ جیسا جرم ویسی سزا۔ اس کے بعد ہے وَ مَن عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (۲۱۸)۔ لیکن اگر مستغیث معاف کر دے اور اس طرح مجرم کی اصلاح کر دے اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب بن جائے، تو اس کا اجر اللہ سے ملیگا۔ یعنی عدل سے مقصد تلافی مساوات ہوتا ہے یہاں اصلاح۔ انتقامی سزا اس صورت میں دی جاتی ہے جب اول الذکر صورتوں کا امکان نہ ہو۔ [گناہوں کے معاف ہو جانے کے متعلق عنوانات (ت۔ و۔ ب) و (غ۔ ف۔ ر) اور (ح۔ س۔ ن) دیکھئے۔]

ع ق ب

اَلْعُقُوبُ*۔ اَلْعُقَابُ*۔ اَلْعُقَابَةُ*۔ اَلْعُقُوبَةُ*۔ اَلْعُقُوبَةُ*۔ ان الفاظ کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر۔ یہی اس سادہ کے اصلی معنی ہیں۔ باقی تمام معانی (جو بہت سے ہیں) اسی مرکزی مفہوم کے گرد گھومتے ہیں۔ اَلْعُقُوبُ*۔ ایڑھی (جمع اَعْقَاب*)۔ اولاد۔ نسل جو انسان کے پیچھے آتی ہے۔ بیٹے ہوتے۔ اَلْعُقَابُ*۔ عروہ چیز جو کسی دوسری چیز کی جانشین ہو۔

اسکے پیچھے آئے۔ مثلاً بیٹا۔ سردار قوم کے پیچھے آئے والا افسر۔ عَقَبَتَہ۔ وہ اسکا جانشین ہوا۔ تَعَاقَبَ الْمُسَافِرَ اَنْ عَلَي الْقَدَابِقَہ۔ دو مسافر یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہوئے۔ اَلْعُقْبَتَہ۔ دن کو بھی کہتے ہیں اور رات کو بھی، کیونکہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ نیز اس کے معنی باری یا بدل کے بھی ہیں۔ تَعَقَّبَہ۔ ادھر ادھر دیکھنا یا مڑ کر پیچھے کو دیکھنا یا لوٹنا۔ تَعَقَّبَہ۔ کسیکا پیچھا کرنا۔ نیز کسی کو جرم کی وجہ سے گرفتار کرنا اور اسے جرم کی سزا دینا*۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلْعُقْبَہ وَالْعُقْبَی۔ اچھے بدلے کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔ نیز عَاقِبَتَہ بھی۔ اور عِقَابٌ اور عُقُوبَتَہ سزا کیلئے**۔ لیکن یہ کلیہ نہیں۔ قرآن کریم میں عَقْبَی کا لفظ مسومین کی جزا اور تنفار کی سزا دونوں کے لئے آیا ہے (۱۳۳)۔ محیط میں اَلْمُعَقَّبُہ کے معنی ثالِ مَثُول کرنے والے کے بھی ہیں***۔ قرآن کریم میں ہے وَاللّٰہُ یَعْزِکُمْ لَا مُعَقَّبَہ لَیَحْکُمِہ (۱۳۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا۔ اَلْعَقَبَتَہ۔ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ*۔ (۱۳۱)۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی، سختی اور صعوبت بھی لکھے ہیں۔

قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کیلئے اس سادہ کے مشتقات استعمال کر کے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے۔ قانون مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اسکے ساتھ ہی لگا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی آگے آگے کام جاتا ہے اور اسکے پیچھے پیچھے اسکا نتیجہ چلا جاتا ہے۔ اسے جزا اور سزا کہتے ہیں۔ لہذا جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں آتی۔ خود اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اعمال کا جزء ہوتی ہے۔ جیسے ورزش کا نتیجہ (صحت) خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ اسلئے سورہ وعد میں کہا ہے کہ لَہُ مُعَقَّبَتٌ مِّنْ بَیْثِنِ یَسُدُّہُ وَمِنْ خَلْدِیْہِ یَحْفَظُوْنَہُ مِّنْ اَمْرِ اللّٰہِ (۱۳۱)۔ ہر انسان (یا اسکے عمل) کے ساتھ آگے اور پیچھے ایسی قوتیں لگی ہوئی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسکی نگرانی کرتی ہیں اور اس کے ہر عمل کو آخری نتیجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں، اسی کو مآل کار، یا کام کا آخری نتیجہ کہتے ہیں۔ یہی ہر انسانی عمل کی عَاقِبَتَہ یا عَقْبَی ہے۔

یعنی اس کا آخری نتیجہ - تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّخَذُوا (۱۳۵) - بہ مآل (انجام) ہے ان لوگوں کا جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں - لہذا عُقْبَى کے معنی اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہی نہیں - اس کے معنی ہر کام کا نتیجہ یا انجام ہیں - خواہ وہ انجام اسی دنیا میں سامنے آجائے - (یہ اس کے بعد کی زندگی میں) - چنانچہ (۱۳۶) میں جو آیا ہے اُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الْقَادِرِ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ان کے لئے اس دنیا کا انجام نہایت اچھا ہے - یہی معنی عَاقِبَةُ الْقَادِرِ (۱۳۶) کے ہیں جہاں یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ فَتَسْتَوُونَ تَعْمَاتُونَ - تمہیں جلدی معلوم ہو جائیگا - یعنی اسی زندگی میں بات واضح ہو جائیگی کہ دنیا کی خوشگواریاں کس کے لئے ہیں -

يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ - اپنی ایڑھیوں پر لوٹ جانا - بمقابلہ اتباع (۱۳۷) - اس کے معنی پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جانا ، پھر اسی روش زندگی کو اختیار کر لینا ہیں جس پر کوئی پہلے ہو - یعنی جاہلیت کے بعد اسلام قبول کرنا ، اور اسلام کے بعد پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا - (۱۳۸) میں یہی معنی ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نظام ، رسول اللہ کی زندگی تک ہی نہیں کہ ان کی وفات کے بعد تم پھر نظام جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ - یہ نظام علیٰ حالہ جاری رہیگا - اس سے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظام ، افراد یا شخصیتوں کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتا - وہ اپنے اصولوں کے زور پر آگے چلتا ہے - شخصیتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں - لیکن جب تک وہ اصول قائم رہتے ہیں جن پر وہ نظام متشکل ہوا تھا ، وہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا رہتا ہے - البتہ جب ان اصولوں کو ترک کر دیا جائے تو پھر وہ نظام ختم ہو جاتا ہے - ختم نبوت کے معنی یہی یہ تھے کہ اب یہ نظام (اسلام) شخصیتوں کے سہاروں کا محتاج نہیں رہیگا - یہ اپنے محکم اصولوں کی قوت پر آگے چلے گا - جب تک امت ان اصولوں پر قائم رہی وہ نظام آگے بڑھتا گیا - جب اس نے وہ اصول چھوڑ دئے تو وہ نظام بھی ختم ہو گیا - اب اس کے احیاء کی صورت یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصولوں کو پھر سے ضابطہ حیات بنا لیا جائے -

ع ق د

عَقْدٌ - مضبوطی سے گره باندھنا - یہ حَلٌّ (گرہ کھولنا) کی ضد ہے - پھر اس کے معنی کسی بات کو مؤکد کرنے کے ہو گئے - عَقْدَ الْعَهْدَ -

اسنے عہد کو مضبوط کر دیا *۔ اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ * (۳۳) وہ لوگ جن سے تم نے محکم عہد باندھ رکھا ہے۔ اَلْعُقُودُ۔ عہد و پیمان *۔ (جمع عُقُودٌ)۔ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ (۱)۔ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ اَلْعُقُودَةُ۔ (جمع عُقُودٌ) گرہ *۔ عُقُودَةُ النِّكَاحِ (۳۵)۔ نکاح کی گرہ۔ وَاَحْمِلْ عُقْدَةَ مِیْنٍ لِّیَسَّانِیْ (۲۷)۔ میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ایسے روانی اور طلاق عطا کر دے۔ تَبَاکُہُ یَفْتَقِہُہُ اَقْوَالِیْ (۲۸) اہل فرعون میری (حضرت موسیٰؑ کی) بات کو سمجھ لیں۔

عُقُودَةٌ *۔ ارادے کو پختہ کرنا۔ حکومت۔ حکومت کی بیعت و فاداری۔ (جمع عُقُودٌ)۔ اَللّٰهُ شَیْءٌ فِی الْعُقُودِ (۱۳)۔ وہ جماعتیں جو کسی حکومت کو کمزور کرنے یا اسکی وفا شعاری میں تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یا نفسیاتی اثرات سے کسی کے محکم یقین کو متزلزل کر دیں۔ اَلْعُقُودَةُ *۔ دل میں مضبوطی سے جمی ہوئی بات **۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا)۔

ع ق ر

عَقَرَ النَّخْلَةَ۔ کھجور کے درخت کے بالائی حصہ کو گاہے کے ساتھ کاٹ دینا، جس کے بعد وہ خشک ہو جاتا ہے *۔ اور راعب کے نزدیک اس کے معنی ہیں کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دینا ***۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اس کے معنی اسے اس طرح کر دینے کے ہیں کہ وہ پھل نہ لاسکے۔ اس لئے اَلْعَقْرَةُ کے معنی ہیں رحم کا عقیم (باجھ) ہو جانا۔ حمل قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھنا۔ اَلْعَقْرُ۔ زخمی کرنا۔ نَاقَتٌ عَقِیْرٌ *۔ وہ اونٹنی جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں *۔ قرآن کریم میں عَاقِرٌ کونچیں باجھ عورت کے لئے (۳۹؛ ۱۵) میں آیا ہے۔ اور عَقَرَ اُونْثٰی کی کونچیں کاٹ دینے (یا اسے قتل کر دینے) کے لئے (۵۲؛ ۹۱) میں۔

ع ق ل

عَقَلَ کے معنی ہیں روکنا۔ منع کرنا۔ عِقَالٌ * اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی ٹانگ کے نچلے حصہ کو سوڑ کر اس کی ہڈی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ اُعْتَقِلَ لَیْسَانُہُ *۔ اسکی زبان رک گئی۔ وہ بول نہ سکا۔ عَقَلَ۔ اس نے عقل سے کام لیا۔ عَقَلَ الشَّیْءَ *۔ کسی چیز کو سمجھا، اس میں غور و تدبیر کیا۔ عَقَلَ فُلَانًا۔ فلاں کو روک دیا۔ بند کر دیا۔

قید کر دیا۔ اَلْعُقْلَہ - وہ چیز جس سے کسی کو ہاندہ دیا جائے۔ مثلاً بیڑی وغیرہ۔ اَلْمَعْقِل - جائے پناہ (کیونکہ آدمی اس میں پناہ گیر ہوتا اور رک جاتا ہے۔ نیز اس لئے کہ وہ جگہ دشمن کو وہاں آنے سے روک دیتی ہے)۔ بلند پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جو روک بن جاتا ہے۔ *

قرآن حکیم میں عقل و فکر سے کام لینے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے انہیں حیوانات سے بدتر قرار دیا گیا ہے، اور ان کا مقام جہنم بتایا گیا ہے (۱۶۹)۔ قرآنی حقائق کو نہ ماننے والوں (کفار) سے بار بار کہا گیا ہے کہ تم عقل و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔ تم قرآن حکیم میں غور و تدبر کیوں نہیں کرتے۔ انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ (۱۶۴)۔ اس اعتبار سے عقل کا مقام بہت بلند ہے۔ خود عربوں کے ہاں بھی اَلْعَقْلَہ اس صاحب شرف و عزت خاتون کو کہتے تھے جو پردہ نشین ہو۔ نیز قوم کے سردار کو۔ بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین چیز کو۔ * - عَقْلَہ السَّحْرِ۔ موتی کو کہتے ہیں۔ اور اَلْعَقَاوِل - سمندر کے گہرے اور بہت پانی والے حصہ یا سمندر کی موج کو۔ * - واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں کے اعتبار سے ان تمام الفاظ میں یہ مفہوم مشترک ہوگا کہ ان کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی زیادہ حفاظت کرتے ہیں اور انہیں روک کر رکھتے ہیں۔

عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نا مناسب باتوں سے روکے۔ لیکن یہی عقل اگر جذبات کے تابع ہو جائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے (۱۶۸)۔ ایسا انسان (یا قوم) علم و عقل کے باوجود زندگی کی غلط روش پر چل نکلتا ہے۔ وَاَضَلَّہُ اللہُ عَلٰی عِلْمِہ (۱۶۸)۔ اور اس کے ذرائع علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ (۱۶۶)۔ جس طرح نشے کی حالت میں انسان کے حواس صحیح کام نہیں کرتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی۔ وہ جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے حصول کا ذریعہ۔ اس مقام پر عقل، انسان کو اسکی انفرادی مفاد پرستیوں کے زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور اسے ربوبیت ہامہ (عالمگیر انسانیت کی نشو و نما) سے روکتی ہے۔ لہذا عقل کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسے وحی کے تابع رکھا جائے۔ یعنی انسان اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھے تو اسکی عقل اسے صحیح فائدہ پہنچا سکتی ہے (۱۶۸)۔

بالفاظ دیگر، عقل کو اپنی راہ نمائی کے لئے اسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یہ ہے تعلق عقل اور وحی کا۔ اس طرح عقل سے کام لینے والوں کو مومن کہا گیا ہے (۱۵)۔ جو عقل وحی کے تابع نہیں چلتی اسے شیطان اور ابلیس کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوانات ب۔ ل۔ س اور ش۔ ط۔ ن)۔

ع ق م

عَقِمَ - دراصل اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے میں مانع ہو۔ عَقِيمٌ - وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عورت تک ہی محدود نہیں۔ رَجُلٌ عَقِيمٌ وَعَقَامٌ - اس مرد کو بھی کہتے ہیں جسکے اولاد نہ ہو۔ رِيحٌ عَقِيمٌ - خشک ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا بارش نہیں برساتی، یا درختوں کو بار بار نہیں کرتی۔ يَوْمٌ عَقِيمٌ - سخت دن۔ ایسا دن جس میں ٹھنڈ (سامان راحت) نہ ہو۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ عَقِمَ کے اصل معنی بند کرنا، روکنا۔ اور قطع کرنا ہیں۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نمایاں نہ ہونا۔ تنگ ہونا اور سخت ہونا ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے عَجُوزٌ عَقِيمٌ - (۱۹)۔ بڑھیا بانجھ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے الرَّيْحُ الْعَقِيمُ آیا ہے (۲۱)۔ بمقابلہ رِيْحٌ لَّوْ اَقِيحٌ (۲۲) کے جو پاتی برساتی ہیں۔ سورہ حج میں عَذَابٌ يَوْمٌ عَقِيمٌ (۲۵) آیا ہے۔ ”تباہ کرنے والے دن کا عذاب“۔ یعنی ایسا عذاب جس سے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جائیں۔ جس سے اسکی جڑ کٹ جائے۔ وہ عقیم رہ جائے۔

ع ک ف

عَكَفَ - کسی چیز کو روکنا، یا رکنا۔ عَكَفَ عَلَيْهِ - اسکی طرف مسلسل بڑھا اور اس سے اپنا رخ نہ پھیرا۔ عَكَفَ - کسی چیز کو بکھرے سے بچانے کیلئے لڑی میں پرو دینا، جس طرح موتیوں کو پرو دیا جاتا ہے۔ عَكَفَ الْجَوَّ هَرٌّ فِي السَّطَمِ - گوہر لڑی میں پر گیا۔ شَعَرٌ مَعَكَوْفٌ - کنگھی کٹے ہوئے، گندھے ہوئے بال (برخلاف پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں کے)۔ اسلئے عَكَفَ کے معنی ہیں (معاملات کو) درست کرنا۔ راغب

نے لکھا ہے کہ اَلْبَعَثُكُوْفُ* تعظیماً کسی شے کی طرف بڑھنے اور اس سے مستقل طور وابستہ ہونے کو کہتے ہیں**۔ عَكَفَ الْقَوْمُ حَوْلَهُ*۔ قوم نے اس کے گرد گھیرا بنا لیا*۔

قرآن کریم میں ہے اَلْهَدْيُ مَعْكُوفًا (۲۸) وہ جانور جسے کعبہ لئے جارہے ہوں لیکن اسے راستے میں روک دیا گیا ہو۔ یہاں اس کے معنی روکنے کے ہیں۔ سورہ حج میں ہے کہ کعبہ کو سَوَاءٌ نِ الْعَاكِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ (۲۲) بنایا ہے۔ یعنی وہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے مشترکہ طور پر بنائے پناہ ہے اور کسی پر اس کے دروازے بند نہیں۔ نہ ہی کسی کے حقوق زیادہ ہیں۔ سورہ طہ میں عَاكِفِیْنَ کا لفظ (۲۱) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام پر مسلسل لگے رہنا۔ جمے رہنا۔

کعبہ کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے کہا کہ اے طَائِفِیْنَ اور عَاكِفِیْنَ کے لئے ہاکیزہ بنا دیں۔ (۲۵)۔ عَاكِفِیْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر ان کے معاملات کو درست حالت میں رکھے۔ ان کے الجھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی مشاطگی کرے اور اس طرح گیسوئے انسانیت کو سنوار دے۔ (تفصیل اس کی ط۔ و۔ ف کے عنوان میں دیکھئے)۔ یہ ہے منصب امت مسلمہ کا جس کے نظام کا مرکز کعبہ ہے۔ یعنی یہ امت اپنے آپ کو اپنے مرکز نظام خداوندی (کعبہ) سے متمسک رکھتی ہے، اور نوع انسانی کے معاملات کو سنوارتی ہے۔ اسی کو شَہْدَاءُ عَلَى النَّاسِ (۲۱) بھی کہا ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران۔ لیکن دوسروں کے اعمال کی نگران وہی جماعت ہو سکتی ہے جو خود قوانین خداوندی پر جم کر رہے اور اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھے۔

ع ل ق

اَلْعَلَقُ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھنا یا وابستہ کر دینا ہیں۔ اَلْعَلَقُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر کنویں کی چرخی لگی ہوتی ہے۔ یا چرخی مع اپنے ضروری سامان کے۔ اَلْعَلَقُ* خون (خواہ کسی قسم کا ہو)۔ یا تیز سرخ

یا گاڑا یا جما ہوا خون جو ابھی خشک نہ ہوا ہو بلکہ لوتھڑے کی قسم کا ہو۔ نیز جونک جو خون چوس لیتی ہے۔ نیز وہ مٹی جو ہاتھ سے چمٹ جائے۔
 اَلْمِعْلَاقُ*۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے۔ مثلاً ڈول کے دونوں کنارے جن میں رسیاں بندھی ہوتی ہیں انہیں اَلْمِعْلَاقَانِ کہتے ہیں۔ اَلْمُعَلَّقِیْنِ*۔ ایک قسم کی درخت پر چڑھنے والی بیل یا جھاڑی جس میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز اس میں الجھ جائے تو اس کا سلامت نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اَلْعِیْلَاقَةُ*۔ اَلْمُعْلَاقَةُ*۔ محبت کو کہتے ہیں جو دل کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اَلْمُعَلَّقَةُ*۔ وہ عورت جو شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے نہ شادی شدہ کی طرح ہو نہ مطلقہ کی طرح۔ ازہری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ اس کے ساتھ انصاف کرے، نہ اسے چھوڑے۔ اور اس طرح اس کی حالت شادی شدہ اور بے شوہر والی عورت کے درمیان ہو جائے اور وہ ادھر لٹکتی رہے۔ قرآن کریم میں ہے فَتَذَرُوهَا کَالْمُعَلَّقَةِ (۱۴۹)۔ تو تم اسے معلقہ کی طرح چھوڑ دو۔

سورة مومنون میں انسانی بچہ (جنین) کی جو مختلف حالتیں بتلائی گئی ہیں ان میں دوسری حالت عِلَقَةٌ* کی ہے (۲۳)۔ یعنی جونک کی طرح (Sole-Shaped)۔ سورة علق میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۹۱)۔ عَلَقٍ کے معنی اگر خون کے لوتھڑے کے لئے جائیں تو آیت میں انسان کی طبیعی خلقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اگر اس کا وسیع مفہوم لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو اگر (بغیر وحی کی راہ نمائی کے) علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی ہوس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ اپنے مفاد کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا اور خون پیتا رہتا ہے اور ہر جگہ شکار پھانسنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اَعْلَقَ الصَّائِدُ کے معنی ہیں شکاری کے جال میں شکار پھنس گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَلَقُ* عشق و محبت (جس میں کسی کو جی چاہتا ہے اور اس سے بندہ جاتا ہے یا، بقول تاج، جو دل میں جم جاتی ہے) کو بھی کہتے ہیں۔

ع ل م

عِلْمٌ* (عَلِمَ - يَعْلَمُ*)۔ کسی چیز کو کماحقہ جاننا۔ پہچاننا۔ حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا۔ محکم طور پر

*تاج و محیط و راغب **تاج۔

معلوم کرنا* - اس طرح ادراکِ حقیقت کرنے والے کو عَالِمٌ کہتے ہیں جس کی جمع عَالِمُونَ آتی ہے - اور عَلِیْمٌ کی جمع عَلَمَاءُ یعنی گہرا اور پختہ علم رکھنے والے - اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے عین جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے متمیز ہو سکے - (ابن فارس)

عربوں کے نزدیک عَلِیْمٌ کا درجہ معرفت اور شعور سے زیادہ بلند ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے عَلِیْمٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں - معرفت یا شعور کا نہیں - چنانچہ خدا کو عَالِمٌ یا عَلِیْمٌ کہہ سکتے ہیں ، عَارِفٌ (معرفت رکھنے والا) یا شَاعِرٌ (شعور رکھنے والا) نہیں کہہ سکتے - عَلِیْمٌ اور مَعْرِفَةٌ میں (انکے نزدیک) ایک فرق یہ بھی ہے کہ مَعْرِفَت کسی چیز کے آثار و قرائن میں غور و فکر کر کے اس کا ادراک کرنے کو کہتے ہیں لیکن عام کے لئے یہ ضروری نہیں - ثانیاً معرفت کا لفظ بیشتر اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز ادراک کے بعد دھیان سے نکل جائے اور پھر دوبارہ اس کا ادراک ہو، لیکن عَلِیْمٌ میں یہ صورت نہیں ہوتی** - (اس علم کی مثال جو تدبیر و تشکر سے حاصل نہیں ہوتا وحی ہے - (۲۴) -

قرآن کریم نے (۱) سَمْع ، بصر اور قلب کو حصول علم کے ذرائع قرار دیا ہے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ہے) - دوسرے مقام پر قَلْب کی جگہ فُؤَاد بھی کہا ہے (۲) *** - اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجائے ہیں - اور فُؤَاد کی نسبت سے اس میں احساسات بھی آجائے ہیں (دیکھئے عنوان ف - ا - د) - لیکن چونکہ علم اس وقت عَلِیْمٌ کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے اس لئے قرآن کریم نے وحی کو عَلِیْمٌ کہا ہے اور اس کی ضد کو اُھْوَاءُ (۳) - یعنی انسان کے خود ساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیوں جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ہے - اس لئے کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین اور حقائق و شواہد پر ہوتی ہے - جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا - وہ اپنے ہر دھوے کو دلیل و برہان کے زور پر پیش کرتا ہے (۴) - اور ان دعاوی سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براہین طلب کرتا ہے (۵) - اسے اپنے دعاوی کی محکمیت پر اتنا یقین ہے (اور یقین علم

* ناج و محیط - ** ناج - *** قلب اور فؤاد کے فرق کے لئے ف - ا - د کا عنوان دیکھئے -

سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعاوی سے انکار کرنے والوں کے متعلق علانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کر سکتے (۲۳/۱۱)۔ اسی لئے قرآن کریم کی دعوت، علی وجہ البصیرت دعوت ہے (۲۸/۱)۔ یعنی (Rational) طریق۔

اَلْعَلَمُ وَالْعِلْمُ۔ ایسی نشانی جس سے کوئی شے پہچانی جاسکے۔ دو کھیتوں کے درمیان جو ڈول بنا دی جائے، اسی طرح ریگستانوں یا دوسرے راستوں میں راہ کی پہچان کے لئے جو چیزیں کھڑی کر دی جاتی تھیں انہیں بھی عَلَمٌ یا عِلْمٌ کہتے تھے۔ بڑے اور لمبے پہاڑ کو بھی عِلْمٌ کہتے ہیں۔ اسکی جمع اَعْلَامٌ ہے (۲۵/۳۸)۔ اور جھنڈے کو بھی اسی لئے عِلْمٌ کہتے ہیں کہ اس سے ایک جماعت دوسری کو پہچانتی ہے۔ نیز وہ اثر یا نشان جس سے راستہ کا پتہ چلایا جاسکے مَعْلَمٌ کہلاتا ہے۔ اَعْلَمُ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا بالائی ہونٹ پھٹا ہو۔ قدیم عرب، جنگ میں گھوڑے پر رنگین اونٹ لٹکا دیتے تھے۔ اس عمل کے لئے اَعْلَمُ الْفَرَسِ کہتے تھے۔ اَعْلَمُ نَفْسِهِ۔ اپنے اوپر وہ نشان لگایا جو جنگ میں شریک ہونے والے لگاتے ہیں۔ ****

اسی سے عَالَمٌ ہے (جس کی جمع عَالَمِیْنَ ہے)۔ اسم آلہ کا ایک وزن فاعل بھی ہے جیسے خاتَمٌ۔ مَائِیْنَتُمْ بِہِم۔ قَاتِبٌ۔ مَائِیْنَتُمْ بِہِم۔ وغیرہ۔ عَالَمٌ بھی اسی طرح ہے جس کے معنی ہیں مَائِیْنَتُمْ بِہِم۔ یعنی وہ شے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے۔ چونکہ خدا کا علم، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے ماری کائنات عَالَمٌ کہلائی جانے لگی۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہر ایک بھی عَالَمٌ کہلائیگا۔ مثلاً عالم انسان۔ عالم ماء۔ عالم۔ نَارِ وغیرہ۔ اس کی جمع مذکر سالم نامانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہے۔ اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہوں تو انسانوں کو غالب رکھا جاتا ہے۔ اسی لئے نسل یا قوم کو بھی عَالَمٌ کہا گیا ہے۔ (اور قرن اور صدی کو بھی)۔ قرآن کریم نے عَالَمِیْنَ کو اکثر اقْوَامٌ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی کسی ایک زمانہ (Age) کے ہم عصر انسان۔ فَضَّلْتُمْکُمْ عَلٰی الْعَالَمِیْنَ۔ (۲۴/۲) یعنی بنی اسرائیل کو (اُس زمانے میں) ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی۔ نیز مختلف قسم کے لوگ یا دنیا بھر کے لوگ۔ (۱۵/۱)۔ اس جہت سے

رَبُّ الْعَالَمِينَ (۱) کے معنی، دور حاضر کی اصطلاح میں ”بین الاقوامی انسانیت کی نشو و نما دینے والا“ بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی خدا کی عالمگیر ربوبیت انسانیہ۔ اور تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا بھی جس میں انسان بھی شامل ہونگے۔

اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اگرچہ عَالَم کا لفظ کائنات کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اہل عرب ہر موجود شے مثلاً پتھر۔ مٹی کے لئے اسے نہیں بولتے بلکہ وہ اس لفظ کا اطلاق ہر ایسے جداگانہ مجموعہ پر کرتے ہیں جسکے افراد اگر عاقل نہ ہوں تو عاقل سے قریب تر ضرور ہوں۔ مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ۔ عَالَمُ الْحَيَوَانَاتِ یا عَالَمُ النَّبَاتَاتِ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن میں خدا کی صفت ربوبیت کا جلوہ نظر آتا ہے کیونکہ ان اشیاء میں صفت ربوبیت کو اپنانے کے لئے بنیادی صلاحیت موجود ہے۔ اور یہ صفت حیوان میں نمایاں ہے۔ مثلاً زندگی۔ غذا حاصل کرنا۔ سلسلہ تولید۔ وغیرہ۔

لہذا خدا کی رَبُّ الْعَالَمِينَ کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آتی چاہئے۔ محض ذہنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رہنی چاہئے۔ اسی سے حَقِّد کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے (دیکھئے عنوان ح۔ م۔ د)۔

قرآن کریم میں ہے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲)۔ اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا۔ یا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۳)۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۴)۔ اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵)۔ اُسے بولنا (اپنے آپ کو Express) کرنا سکھایا۔ ان مقامات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح سکھایا جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھ دی۔ اسے ان کی استعداد عطا کر دی۔ اسکی واضح مثال سورۃ مائدہ میں ملیگی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھائے ہو مِمَّا عَلَّمَكُمْ اللہ (۶)۔ اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری کتوں کو سداہنے کا طریقہ نہیں سکھاتا۔ اس نے انسان میں اسکی استعداد رکھ دی ہے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ہے۔

لہذا ایک علم تو وہ ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے پراہ راست ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ اور دوسرا علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں

میں رکھ دی گئی ہے ، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے ۔ قرآن کریم کے ان مقامات میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد ۔ یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے ۔ ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا ۔ اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتا ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی ، بشر کی ہوتی ہے ۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۱۳۸) ۔

سورۃ فاطر میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا ۔ کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے ۔ وَ مِنْ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَیضٌ وَ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَ غَرَّابٍ مُّسْوَدٌ ۔ اور پہاڑوں (میں دیکھو کہ کس طرح) سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں ۔ وَ مِنْ النَّاسِ وَ الدَّوَابِّ وَ اَلْاَنْعَامِ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھُ کَذٰلِکَ ۔ اور اسی طرح انسانوں میں ، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں ۔

ان مقامات میں دیکھئے ۔ قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ہے اِنَّمَا یَخْشٰی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَآءُ ۔۔۔ (۳۵-۴۸) ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت و قدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو ”علماء“ ہیں ۔ یعنی جو ان علوم کا علم رکھتے ہیں ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے ”علماء“ کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آجکل سائنسدان (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم علم الاشیاء کو بڑی بنیادی اہمیت دیتا ہے ۔ (تفصیل ان امور کی ”سلیم کے نام خطوط“ میں ملیگی) ۔

ع ل ن

عَلٰنَ اَلَا مَرٌ ۔ بات ظاہر ہو گئی اور پھیل گئی ۔ اَلْعِلَآنُ ۔ اَلَا عِلَآنُ ۔ کسی کام کو کھلم کھلا کرنا ۔ اَلْعِلَآنِیَّةُ ۔ ظاہر و آشکارا ۔ یہ سیرت کی ضد ہے ، یعنی پوشیدہ یا چھپ کر ۔ نیز راز ** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ

میرے کے مقابل میں آیا ہے (۲۴/۳)۔ اسے بالہ مقابلہ اَعْلَنَ - یعنی ہر ملا کہنا، کھول کر کہنا۔ (۴۱/۹)۔

ع ل و

عِلْدُو الشَّقِیْنِ ع۔ چیز کا بلند ترین حصہ۔ (سِفْلٌ کی ضد ہے)۔ اَلْعِلَاۃُ۔ شرف۔ بلندی۔ اَعْلَاۃُ۔ عالیٰ۔ یہ۔ اِسْتَعْلَاۃُ۔ کسی چیز کے اوپر چڑھ گیا۔ اِسْتَعْلٰی۔ بلند ہوا۔ غالب ہوا۔ اَعْلَاۃُ۔ اسے بلند کر دیا۔ تَعَالٰی۔ وہ بلند ہوا (۱۱/۱۶)۔ اَلْعِلَاۃُ وَۃُ۔ پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد رکھا جائے۔ نیز یہ زائد یا اوپر سے، کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مَتَاعِدُوۃ (۱۴/۱) جس چیز پر بھی وہ غالب آجائیں۔

عُلُوۃ (۱۴/۱) سرکشی۔ لیکن جب بھی لفظ خدا کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی عظمت اور بلندی کے ہونگے (۱۴/۱)۔ عَالِیِّنَ (۲۳/۱) سرکشی کرنے والے (اس کا واحد عَالٍ اَلْعَالِیِّ) ہے اور مؤنث عَالِیَّةٌ)۔ لَتَعْلَمَنَّ تم ضرور سرکشی اختیار کرو گے (۱۴/۱)۔ وَجَعَلْنٰا عَالِیْمَہَا سَافِلَہَا (۱۱/۸۲) ہم نے اس کے بالاتر حصہ کو نیچے کا حصہ بنایا۔ اَلْعُتَّالِ (۱۳/۱) بہت بلند۔ عالی مرتبت۔ اَلَاۃُ عَلٰی (۵۴/۱)۔ سب سے بلند۔ سب پر غالب۔ عِلَاۃ (۲۳/۱)۔ غالب ہوا (ایک دوسرے پر)۔

عِلٰیِّیُّوْنَ عِلٰیِّیِّیْنَ (۱۸/۱۹)۔ بلندبوں کے اوپر بلندیوں*۔ لیکن (۲۳/۱) میں عِلٰیِّیُّوْنَ کی تفسیر کِتٰبٌ مَرْقُوْمٌ سے کی گئی ہے۔ لہذا اس کے معنی اعمال نامہ کے ہونگے۔ لکھی ہوئی کتاب۔ لیکن ایسا اعمال نامہ جو انسان کو بلندبوں کی طرف لے جائے۔ اس کے برعکس سِجِّیْنٌ ایسا اعمال نامہ ہے جو انسانی نشوونما کو جکڑ کر رکھ دے۔ (۸۳/۹)۔

سورہ النمل میں ہے اَلَاۃُ تَعْلَمُوۃُ اَعْلٰی وَاَتَوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ (۲۴/۱)۔ اس میں تَعْلَمُوۃُ کے معنی ہیں سرکشی اختیار کرنا، اور مُسْلِمِیْنَ کے معنی مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔

تَعَالٰ۔ عربوں میں جب کوئی بلندی سے نیچے والوں کو آواز دیتا تو یہ لفظ کہتا تھا۔ لیکن کثرت استعمال کے بعد یہ امتیاز باقی نہ رہا اور عرب لانے والا اس لفظ کو استعمال کرنے لگا**۔ چنانچہ سورہ احزاب میں ہے فَتَعَالٰی (۳۳/۲۸) تم سب ہورتیں آؤ۔

واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی اور غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ظالم پر غلبہ یا کر مظلوم کی حمایت کرنا۔ یہ غلبہ مستحسن ہے اور جماعت مومنین کا شعار۔ دوسرا غلبہ یہ ہے کہ کمزوروں اور ناتوانوں پر غلبہ پا کر انہیں اپنے استبداد کا نشانہ بنانا۔ یہ غلبہ مذموم ہے اور قرعونیت کی علامت۔ اس قسم کے غلبہ کو ہم نے سرکشی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اپنی قوت کو قوانین خداوندی کے خلاف صرف کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۸) تم افسردہ خاطر مت ہو۔ اور مت گھبراؤ۔ (آخر الامر) تم ہی غالب ہو گے، اس لئے کہ تم قوانین خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس میں اسی غلبہ کی طرف اشارہ ہے جو طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر، دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مومن کبھی کافر سے مغلوب نہیں رہ سکتا۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۱۴۱) ”اور اللہ عز و جل کافروں کو مومنوں پر غلبہ کی راہ نہیں دیگا“۔ یہ عوسکتا ہے کہ کسی معرکہ میں جماعت مومنین کو ہنگامی طور پر شکست عوجائے (۱۳۹)۔ لیکن کفار کا مومنین پر غالب رہنا، ناممکن ہے۔ لہذا اگر اپنے آپ کو ”مومن“ کہنے والے مستقلاً کفار سے مغلوب ہیں (خواہ کفار کا غلبہ حکمران کا ہو یا معاشی و معاشرتی) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن کی (Definition) پر پورے نہیں اترتے۔ کفار سے مغلوب ہونا تو ایک طرف، مومن کی یہ کیفیت ہے کہ، اقبال کے الفاظ میں

مومن سے بالائے ہر بالاترے غیرت او بر تنابد ہمسرے
(علی - حرف ہے جو الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان ”علی“)

علی (حرف)

علیٰ - یہ حرف بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ہر۔ اوپر۔ خواہ حقیقتاً ہو۔ جیسے عَلَيَّ الْفَلَکُ تَحْمَلُونَّ

(۲۳) تم کشتیوں کے اوپر سوار کرائے جاتے ہو (سوار ہوئے ہو)۔

خواہ مجازاً۔ جیسے فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۲۵۳) ہم نے

ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(۲) قریب کے معنوں میں - اَوْ اَجِدْ عَلٰی النَّقَارِ هُدًى (۲/۲۱۰) یا میں اس آگ کے قریب کسی راہ نما کو دیکھوں (دیکھئے عنوان ۵ - د - ی)

(۳) باوجود کے مفہوم میں - وَ اتْلُ الْعَمَالَ عَلٰی حَبِيبِهِ (۱۰۰/۱) مال کی محبت کے باوجود اسے (دوسروں کو) دے۔

(۴) مِّنْ (سے) کے معنوں میں - لَ اِذَا اَصْكَنْتَ لَوْا عَلٰی النَّفْسِ (۸۳/۴) جب وہ لوگوں سے ماب کر لیتے ہیں۔

(۵) ”کی وجہ سے“ کے معنوں میں - لِيَتَّكِبَ سُرُوْا اللّٰهُ عَلٰی مَا هَدٰۤى اَكْتَمُ (۱۸۵/۲) تاکہ تم اللہ (کے نظام) کو بلند کرو، اس وجہ سے (یا اس بنیاد پر) کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے۔ (لیکن یہاں اس کے معنی ذریعے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تم ہدایت خداوندی (قرآن) کے ذریعے اللہ کے نظام کو بلند کرو۔ (دیکھئے نمبر ۱۳ -)۔ (نیز ”کے مطابق“ بھی۔ دیکھئے نمبر ۱۱)

(۶) رَفِیْ (میں) کے معنوں میں وَ دَخَلَ الثَّمَدِ بِسَنَةِ عَلٰی حِیْثُنْ غَفْلَتَہٗ مِّنْ اَهْلِیْہَا (۲/۱۰۸) وہ اسوقت شہر میں داخل ہوا جب اسکے رہنے والے بیخبر تھے۔ ان کی بے خبری کی حالت میں۔

(۷) ”کے ساتھ۔ کے متعلق“ کے معنوں میں - حَقِیْقُ عَلٰی اَنْ لَا اَقُوْلَ عَلٰی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقُّ (۲/۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اس میں عَلٰی اَنْ لَا اَقُوْلَ کا مطلب ہے یَاَنْ لَا اَقُوْلَ۔ یعنی یہ کہ میں کچھ نہ کہوں۔ (سوائے حق کے)۔

(۸) اِلٰی (تک) کے معنوں میں - وَ عَلٰی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ (۱۰۹/۱) اور درمیانی (سیدھی) راہ اللہ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے - هٰذَا صِرَاطٌ عَلٰی مُسْتَقِیْمٍ (۱۰۹/۱) یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

(۹) سامنے - روبرو - وَلِیَتَصْنَعْ عَلٰی عِیْنِیْ (۲/۲۰۹) تاکہ تیری تربیت میرے سامنے ہو۔

(۱۰) خلاف - لَا تَفْتَرُوْا عَلٰی اللّٰهِ کَذِبًا (۲/۲۲۱) تم اللہ کے خلاف جھوٹ تو نہ تراشو۔

(۱۱) کے مطابق - اَعْمَلُوْا عَلٰی مَّكَانَتِکُمْ (۱۰۳/۶) تم اپنی طاقت کے مطابق (یا اپنی جگہ پر) کام کرو۔

(۱۲) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے (یعنی اسکے کچھ معنی نہیں ہوتے)۔

(۱۳) بذریعہ - کے ذریعے - مثلاً سورہ آل عمران میں ہے رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَزَّوَجَلَّ رَبُّنَا (۱۳۳)۔ اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ کیا تھا، وہ ہمیں عطا کر۔
(۱۴) عَتَبْنَاهُ - اس کے خلاف - عربی زبان میں "ل" کسی کے فائدہ کے لئے آتا ہے اور اس کے برعکس "عَتَبْنَاهُ" آتا ہے - قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق (مفاد) اور ذمہ داریوں کے متعلق آیا ہے - وَلَكُنَّ مِثْلُ الْاِثْنَيْنِ عَتَبْنَاهُ (۴۲۸) - جس قدر ان کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق ہیں۔

(۱۵) عَتَبْنَاهُمْ بِبَالِيسْتَدْق - تم پر سچائی واجب ہے - تم ہمیشہ سچائی کے ساتھ رہو، اور اسے نہ چھوڑو۔ (یہ اسم فعل ہے)
قرآن کریم میں ہے عَتَبْنَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ (۱۰۵)۔ تم پر اپنی ذات (کی اصلاح) واجب ہے۔

عَبَا (حرف)

دیکھئے عَن اور مَن۔

ع م د

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی استقامت و استواری (سیدھا کھڑے ہو بانا) ہیں، خواہ وہ محسوس چیزوں میں ہو یا رائے اور ارادے میں۔ اَلْعَمُوْدُ - اس لکڑی (پلٹی) کو کہتے ہیں جو خیمہ کے وسط میں ہوتی ہے اور جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعْمِدَةٌ عَمَدٌ - عَمِدٌ آتی ہے۔ اَلْعَمَدُ - سنگ مرمر کے ستونوں کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳)۔ خدا نے فضائی کرّوں کو بغیر مرئی (Visible) اور محسوس ستونوں کے کھڑا کر رکھا ہے۔ ان کے ستون، وہ باہمی کشش و جذب ہے جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اس میں عَمَدٌ جمع ہے عَمُوْدٌ کی یا عِمَادٌ کی۔ سورۃ الہمزہ میں ہے فِيْ عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ (۱۴)۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔

الْعِمَادُ* - وہ سردار جس پر معاملات میں بھروسہ کیا جائے۔ رئیس لشکر۔ طورِ بیل الْعِمَادِ - لمبے ٹڑنگے آدمی کو کہتے ہیں۔ عِمَاد* کے معنی طول اور لمبائی بھی ہیں*۔ قرآن کریم میں قومِ عاد کے متعلق ہے اِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۱۹۹)۔ امن کے معنوں میں مختلف اقوال ہیں۔ الْعِمَادُ بلند عمارتوں کو کہتے ہیں*۔ اس کا واحد عِمَادَةٌ* ہے۔ اس سے اس کے معنی ہونگے وہ قوم جو بڑی بڑی بلند عمارتوں کی مالک تھی۔ عِمَاد* خیموں کو بھی کہتے ہیں۔ اس سے اس کے معنی ہونگے وہ لوگ جو خیموں میں رہنا کرتے تھے*۔ یا وہ لوگ جن کے قد لمبے تھے*۔ راغب نے کہا ہے کہ الْعِمَادُ اس چیز کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگائی جائے اور بھروسہ کیا جائے۔ لہذا ذَاتِ الْعِمَادِ کے معنی ہونگے ان چیزوں کے مالک جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا**۔ الْعِمَادَةُ* - جس پر اعتماد یا بھروسہ کیا جائے***۔ الْعَمَدُ* - الْعَمَدَةُ* - وہ کام جو مقصد و نیت سے کیا جائے۔ یہ خطا کے مقابلہ میں آیا ہے (۹۳۔۹۴ و ۳۳)۔ (قتلِ عمد اور قتلِ خطا کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ت۔ ل)۔

ع ۲۵

الْعِمَارَةُ* - خَرَابہ کی ضد ہے۔ خَرَابہ کے معنی ہیں ویران اور برباد کرنا۔ لہذا عِمَارَةُ* کے معنی ہیں آباد کرنا۔ الْعُمُرُ* - اس مدت کا نام ہے جس میں بدنِ حیات کے ساتھ آباد رہے**۔ عَمَّرَهُ اللهُ - خدا نے اس کی عمر دراز کی۔ اسے باقی رکھا*۔ ابنِ فارس کے نزدیک اس سادہ کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) بقاء اور درازی زمانہ اور (۲) اونچی اور بلند ہونے والی چیز، خواہ وہ آواز ہو یا اس کے سوا کسوٹی اور چیز۔ سورۃ بقرہ میں ہے لَوْ يَعْلَمُ الْآلِفُ سِتْرَهُ (۱۶۱)۔ ”کاش! اُسے ہزار سال تک جیتا رکھا جائے“۔ اَعْمَرَ الْاَرْضَ* - زمین کو آباد پایا۔ الْعِمَارَةُ* - جس سے جگہ کو آباد کیا جائے۔ الْعُمُرَةُ* - ملاقات۔ کسی آباد جگہ جانا۔ شرعاً حج کے علاوہ کعبہ کی زیارت اور طواف وغیرہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اَعْمَرَ (۱۵۸)۔ عمرہ کرنا تَعْمِيرُ الشَّوْبِ* - کپڑے کی بناوٹ کا عمدہ کرنا۔ اَلْعُمُرُ* - دین۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے لَتَعْمَرَ كَتَبَ لَنفْسِهِ لَتَفِي سَكْرَتِهِمْ يَتَعْمَهُونَ (۱۶۱) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ تیرا دین اس حقیقت پر شاہد ہے*۔ (اگرچہ عرب عام طور پر لَعْمَرَ كَتَبَ - تیری حیات و بقاء کی قسم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں)۔

قرآن کریم میں ہے مِمَّا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَتَعَمَّرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ (۹۰)۔ مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں۔ مسجد، خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ یعنی اس نظام کا جس میں اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کی جاتی ہے۔ لہذا جو لوگ ان قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کریں وہ ان مراکز کی آبادی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس مسجد کو جو امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی، جہنم کا ایندھن بتایا۔ (۱۰۹-۱۰۷)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ پرستی بھی شرک ہے (۳۲)۔

سورہ طور میں وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ (۵۲) آیا ہے۔ آباد کیا ہوا گھر۔ آباد رکھنے کی جگہ۔ وہ جگہ جو ہمیشہ آباد رہیگی۔ (یعنی خانہ کعبہ)۔ قرآن کریم میں آل عمران کا ذکر آیا ہے (۳۳)۔ کہتے ہیں کہ عمران حضرت موسیٰ کے والد کا نام تھا۔ اس لئے آل عمران سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اِسْرَآتُ عِمْرَانَ (۳۳)۔ آل عمران کی ایک عورت یا عمران کی بیوی۔ اِبْنَتُ عِمْرَانَ (۳۳)۔ آل عمران کی ایک لڑکی (حضرت مریم)۔ یا عمران کی بیٹی۔

ع م ق

الْعَمَقُ*۔ اَلْعَمَقُ*۔ اَلْعَمَقُ*۔ کنوئیں وغیرہ کی گہرائی۔ راغب نے کہا ہے دراصل عَمَقُ* نیچے کی طرف دوری (گہرائی) کو کہتے ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ جب عَمَقُ* راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دوری کے ہوتے ہیں اور جب کنوئیں کی صفت ہو، تو اس کے معنی گہرائی کے ہوتے ہیں*۔ (بحوالہ ابن فارس)۔

قرآن کریم میں ہے مِّنْ كُلِّ فُجٍّ عَمِيقٍ (۲۲)۔ اس کے معنی میں ہر دور دراز راستے سے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْعَمَقُ*۔ اَلْعَمَاقَةُ* کے معنی لمبا ہونا۔ بعید ہونا۔ اور پھیلا ہوا، ہونا، نیز گہرا ہونا ہیں**۔

ع م ل

عَمَلٌ* کے معنی کام کاج، ہنر مندی، مہارت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہیں۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ عمل کا لفظ فعل سے زیادہ خاص ہے

*تاج و راغب۔ **محیط۔

اس لئے کہ عمل ایک گونہ مشقت سے کسی کام کو کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی لئے عَمِلَ کا لفظ خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ فَعَمَلَ کا لفظ کیا جاتا ہے۔ (فَعَمَلَ اور عَمِلَ میں جو اور فرق ہیں ایسے ف۔ ع۔ ل کے عنوان میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ بریں) راعب نے کہا ہے کہ عَمَلَ* ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۂ سرزد ہو، اسکے برعکس فَعَمَلَ* کا لفظ حیوانات کی طرف اُس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب ان سے کوئی کام بلا قصد سرزد ہو۔ جتنی کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلَ* کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے*۔ صاحب محیط نے تسو بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عَمَلَ* در حقیقت عِیَاش کی مقلوب شکل ہے۔ لہذا عَمَلَ* کے لئے علم لاینفک شرط ہے**۔ (جیسا کہ ف۔ ع۔ ل کے عنوان میں کہا گیا ہے) عَمَلَ* کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (ہمیشہ کے لئے) کیا جاتا ہو۔ عَمَلَ*۔ کام کرنے والا۔ (جمع عَمَالِیْنُ اور عَمَالِیْنُ) وَالْعَمَالِیْنُ عَمَلَتْہَا (۱۰)۔ ٹیکس وصول کرنے والے۔

قرآن کریم اَعْمَالَ کے نتائج بتاتا ہے۔ یعنی ان کاموں کے نتائج جنہیں انسان قصد اور ارادے کے ساتھ کرے۔ مَن عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذٰکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَلَنُجْزِیَنَّهُمْ اَجْرًا کَثِیْرًا ۚ بَلٰۤی حَسْبَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۱)۔ جو کوئی صلاحیت بخش کام کرتا ہے، مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہے، تو ہم بالضرور انہیں خوشگوار زندگی عطا کریں گے اور بالضرور انہیں باحسن طریق ان کے ان کاموں کا اجر دینگے جنہیں وہ کرتے رہے۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی ایمان اور عمل ہے۔ یعنی قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کی صداقت پر یقین اور ان کے حصول اور بقا کے لئے مسلسل عمل، اس یقین کے ساتھ کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ یہ ہے اسلام۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان اعمال پر استقامت کے ساتھ قائم رہا جائے، کیونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) عمل کی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کام ہمیشہ کے لئے کیا جاتا ہو۔

ع م م

اَلْعَمَّ - باپ کا بھائی - چچا - (اسکی جمع اَعْمَام* - عَمَمُوْمَہ* - اور اَعْمَ آتی ہے)۔ اَلْعَمَّةُ* - باپ کی بہن یعنی بھوپھی - اسکی جمع عَمَمَات* ہے۔

*تلمج - **محیط -

راغب نے کہا ہے کہ اس کی اصل عَمُوْمٌ سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی طول، کثرت اور بلندی کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَمِيْمٌ - لمبے ہودے کو کہتے ہیں۔ اور لمبے کھجور کے درخت کو عَمَلَّةٌ کہتے ہیں۔ عَمُّ الشَّيْءِ عَمُوْمًا - شے عام ہو گئی۔ یعنی تمام افراد اس میں شامل ہو گئے۔ اَلْعَمَلَّةُ - عام لوگوں کو کہتے ہیں۔ العِمَامَةُ - ہر وہ چیز جسے سر پر لپیٹ لیا جائے۔*

قرآن کریم میں عَمَّ شَيْئَكُمْ (۳۴) باپ کی بہنوں (پھوپھیوں) سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔

ع م ۵

عَمَّہ کے معنی ہیں راستہ کھو کر، یا تعحیر میں، ادھر ادھر پھرنا یا نگاہ دوڑانا لیکن یہ نہ معلوم ہونا کہ صحیح رخ کونسا ہے۔ اَرْضٌ عَمَّهَاءٌ اُس سر زمین کو کہتے ہیں جس پر راستہ دکھانے والے نشانات نہ ہوں۔ اور ذَهَبَتْ اَبِلُّهُ الْعَمَّهِي اُسوقت کہتے ہیں جب کسی کے اونٹ اسطرح کھڑ جائیں کہ پتہ ہی نہ لگ سکے کہ وہ کدھر چلے گئے۔** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں راستہ کی طرف کم راہ نمائی ہونا اور حیرانگی۔ یعنی معاملہ پیش نظر کے متعلق انسان کی سمجھ میں نہ آنے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور اسکی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہو۔

اس اعتبار سے بصیرت کے اندھے پن کو عَمَّہ کہتے ہیں اور بصارت کے اندھے پن کو عَمٰی***۔ اگرچہ راغب اور زمخشری کے نزدیک عَمٰی کا لفظ بصارت و بصیرت دونوں کے اندھے پن کیلئے بولا جاسکتا ہے اور یہی درست ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَيْسَ عَلٰی الْاَعْمٰی حَرَجٌ (۲۴)۔ یہاں اَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے۔ اور سورہ بقرہ میں ہے صَمٌّ يَّكْتُمُ عَمٰی (۲۸)۔ یہاں عَمٰی سے مراد بصیرت کا اندھا ہے۔ عَمِيہ فلان - اُسوقت کہتے ہیں جب کسی شخص کو اپنی بات ثابت کرنے کے لئے دلیل نہ مل سکے اور وہ اسطرح حیران رہ جائے۔**

سورہ بقرہ میں فِی طُغْيَانٍ نَّهِيْمٍ يَّعْمَهُوْنَ (۲۵)۔ راستہ کھو کر حیران و سرگرداں پھرنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سورہ المؤمنون میں پہلے کہا کہ یہ لوگ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَا كِبُوْنَ (۲۳) ہیں۔ یعنی

سیدھے راستہ سے ہٹ جانے والے۔ اور اس کے بعد کہا "فِي طُغْيَا نِيهِمْ" (۲۳)۔ اس سے عَمَّہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی سیدھا راستہ کھو کر یا اس سے ہٹ کر صحیح راستہ نہ ملنے کی وجہ سے حیران و پریشان پھرنا۔

ع م ی

عَمِيَ - يَعْمَى - عَمَى کے معنی ہیں دونوں آنکھوں سے نابینا ہو جانا۔ اگر کوئی شخص ایک آنکھ سے اندھا ہو جائے تو اسے اَعْمَى نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ (جیسا کہ صاحب لطائف اللغات نے کہا ہے) بصیرت کے زائل ہونے کو عَمَّہ کہا جاتا ہے اور بصارت کے چلنے جانے کو عَمَى، لیکن اَلْعَمَى دل کی بصیرت کے زائل ہو جانے کو بھی کہتے ہیں (دیکھئے عنوان ع - م - ہ)۔ عَمِيَّة کے معنی ہیں گمراہ ہو جانا۔ باطل پر مصر ہو جانا۔ اَلْاَعْمَاء وہ افتادہ زمینیں جہاں آبادی کا نشان تک دکھائی نہ دے۔ اَلْاَعْمِيَان سیلاب اور آتش زدگی کی تباہی کو کہتے ہیں کیونکہ جب یہ (دونوں) آتے ہیں تو نہ نیک کو دیکھتے ہیں نہ بد کو۔ اندھا دھند آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اَلْعَمَامِي اس شخص کو کہتے ہیں جسے راستہ نہ مل سکے*۔

عَمِيَ عَلَيْهِ اَلْاَمْرُ کے معنی ہیں اس پر فلاں معاملہ غیر واضح اور مشتبہ ہو گیا**۔ اَلْعَمَامِيَّة گمراہی، بے راہ روی اور ہٹ دھرمی۔ نیز ظلمت شب کے آخری باقیماندہ حصے کو بھی کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔

صاحب لسان العرب کے نزدیک قَوْمٌ عَمَوْنَ اسوقت کہتے ہیں جب قوم تاریکی میں ہو اور حالات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکنے کے قابل نہ رہے***۔

قرآن کریم میں ہے وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی فَهُوَ الْاٰخِرَةُ اَعْمٰی وَ اٰخِلٌ سَبِيْلًا (۱۴)۔ جو شخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ہوگا اور بالکل راہ گم کردہ۔ قراء کا قول ہے کہ اس آیت میں اَعْمٰی کے معنی ہیں دنیاوی نعمتوں سے محروم، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم اس دنیا میں نعمتوں اور آسائشوں سے محروم ہے وہ مستقبل کی زندگی میں بھی نعمتوں سے محروم رہیگی۔ وہ شاہراہ حیان سے اسقدر بھٹکی ہوئی ہوگی کہ صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے گی***۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں وَأَضَلُّ سَبِيلًا کے ٹکڑے نے اَعْمٰی کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ جو شخص سیدھے راستے سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے، وہ بھوک پیاس خستگی اور واماندگی جیسی صداہا مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسے صحرائے حیات میں کوئی نشان براہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسکی تشریح خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهُ سَعِيْشَةً ضَنْكًا وَتَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمٰی (۲۴۰)۔ جو ہمارے قانون حیات سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ لہذا قانون خداوندی کے چھوڑ دینے سے دنیاوی زندگی میں محتاجی اور ذلت نصیب ہوتی ہے، اور جس کی دنیاوی زندگی یوں ذلیل ہو اسکی آخرت بھی ذلیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں صَمٌّ - بُكْمٌ کے ساتھ عُمٰی کا لفظ آیا ہے (۲۸) (نیز عُمٰیَانَا - ۲۵) جسکے معنی اندھے کے ہیں۔ عُمٰی اور عُمٰیَانَا عُمٰی کی جمع ہیں۔ سورہ طہ میں اَعْمٰی کے مقابلہ میں بَصِيْرٌ کا لفظ آیا ہے (۲۵)۔ اور سورہ انعام میں بتا دیا گیا ہے کہ جو وحی کی روشنی میں چلے وہ بَصِيْرٌ ہے اور جو اسکا اتباع نہ کرے وہ اَعْمٰی ہے (۲۵)۔ سورہ حم السجدہ میں العمی کے مقابلہ میں الھدی کا لفظ آیا ہے۔ (۲۶)۔ یہاں العمی کے معنی گمراہی (صحیح راستے سے بھٹک جانا) ہیں۔ (۲۶) میں ضلالت کو اندھا پن کہا گیا ہے۔ (۱۹) میں ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا وہ اَعْمٰی ہے۔ سورہ قصص میں ہے فَتَعْمِيْتُمْ عَلٰیئِهِمُ الْاَنْبَاءَ (۲۹) انہیں معاملات مشتبہ ہو گئے۔ یہی معنی (۲۸) میں فَتَعْمِيْتُمْ عَلٰیئِكُمْ کے ہیں۔ یعنی ایسے واضح دلائل تمہیں صاف صاف دکھائی نہیں دیتے۔ سورہ حج میں اس کیفیت کو ”دل کی آنکھوں کے اندھا ہو جانے“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تَعْمٰی الْقُلُوْبُ الثّٰی فِي الصُّدُوْرِ (۲۲)۔ یعنی حقائق کا آنکھوں سے اوجھل ہو جانا یا صاف صاف دکھائی نہ دینا۔

لہذا، قرآن کریم کی رو سے جس طرح انسان کے سر کی آنکھوں کے لئے سورج (یا چراغ) کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یعنی اگر روشنی نہ ہو تو آنکھیں اندھی (بیکار) ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عقل کی آنکھ کیلئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے۔ وہی عقل، بیٹا قرار دی جا سکتی ہے جو وحی کی روشنی میں زندگی کے منازل طے کرے۔ نیز جو قومیں حقائق کا صحیح اندازہ

نہیں کرتیں اور اس طرح اندھی بن جاتی ہیں وہ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے معروم رہ جاتی ہیں۔ اور جس قوم کا امروز تاریک اور بھیانک ہو اس کا فردا (مستقبل) بھی تاریک ہوتا ہے۔ یہ تو ضرور نہیں کہ جس قوم کو اس دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہو جائیں اس کا مستقبل (حیات آخرت) بھی درخشندہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مستقبل اسی قوم کا درخشندہ ہوگا جس کا امروز شاندار ہو۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذات و رسوائیوں میں گذر رہی ہو اور وہ آخرت میں جنت کی آسائشوں کی مالک بن جائے۔ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں اور شادایاں اور اس کے بعد کی زندگی کی درخشندہایاں اور تابناکیاں ہیں۔ یاد رکھئے۔ مومن کا مقام، آدم (آدمی) کے مقام سے اونچا ہے۔ اس لئے جو کچھ آدمی کو میسر ہو مومن کو وہ کچھ بھی میسر ہونا چاہئے اور اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ملائکہ، آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لہذا مقام آدم یہ ہے کہ کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں۔ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر لے۔ اور مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر کے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لائے۔ لہذا اگر کسی قوم کا اشیائے فطرت پر تصرف نہیں تو وہ قوم مقام آدم تک بھی نہیں پہنچ سکی، چہ جائیکہ اسے مقام مومن نصیب ہو۔ جس قوم کو اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب نہیں اسے مقام آدم حاصل نہیں۔ چہ جائیکہ مقام مومن۔ اس لئے ایسی قوم کی آخرت کی زندگی کس طرح روشن ہو سکتی ہے۔ لیکن جس قوم کو مقام آدم نصیب ہے لیکن مقام مومن نصیب نہیں تو اسکی اس دنیا کی زندگی پر آسائش ہوگی۔ آخرت کی زندگی اسکی بھی تاریک ہوگی۔ مومن کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی تابناک ہوگی۔

عَنْ (حرف)

عَنْ - یہ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً -

(۱) يَسْتَخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ (۱۳۱) - وہ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۲) اِيَكُ جِغْہ سے دوسری جِغْہ جانا۔ منتقل ہونا، ہٹ جانا جیسے عَنْ الصِّرَاطِ لِنَسَاكِيْبَتُوْنَ (۲۳۳) - وہ راستہ سے ایسکی طرف ہٹ جائے

والے ہیں۔ اور ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ - ابراہیمؑ سے خوف ہٹ گیا، چلا گیا اور دور ہو گیا (۱۱/۱)۔ سَافَرْتُ عَنْ الْبَلَدِ - میں نے شہر سے سفر کیا۔ وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا۔

(۳) ”ہدلے میں“ یا ”کی طرف سے“ کا مفہوم - يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲/۸) جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے بدلے میں کفایت نہیں کریگا۔ یا اس کی طرف سے جزا (معاوضہ) نہیں دے سکیگا۔

(۴) سبب ظاہر کرنے کے لئے (کی وجہ سے - کے سبب) - وَمَا تَجُنُّ بِتَارِكِيْ آلِهَتَيْنَا عَنْ قَوْلِكَ (۱۱/۵) - ہم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنے والے۔

(۵) اوپر یا بعد کے معنوں میں - لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۲/۱۶) - تم ایک حالت سے اوپر دوسری حالت میں جاؤ گے۔ یا تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پہنچو گے۔

(۶) مَعْنٍ (سے) کے معنوں میں - هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (۲۴/۴) اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے۔

(۷) ب - (سے) کے معنوں میں - مَا يَنْطِقُ عَنْ الطَّهْوَى (۵۳/۳) - وہ اپنے جذبات و خیالات سے بات نہیں کرتا۔ (”ساتھ“، ذریعہ“ یا ”کی مدد سے“ کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے رَمِيَتْ عَنْ الْقَوْمِ یعنی رَمِيَتْ بِالْقَوْمِ - میں نے کہاں کے ذریعہ تیر پھینکا)۔

(۸) فِي (میں) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

(۹) زائد بھی ہوتا ہے (یعنی کوئی معنی نہیں دیتا)

کتاب لغت میں ان کی مثالیں دی ہوئی ہیں۔

ع ن ب

الْعَيْنَبُ - (واحد، عَيْنَبَة) - انگور - بہ انگور کے پھل اور اس کی بیل کے لئے بھی بولا جاتا ہے* - اَعْنَابٌ (۲۶/۴) - عَيْنَب کی جمع ہے - الْعَيْنَبُ - (انگور کی) شراب* -

* تاج و واہب -

ع ن ت

الْعَنَتُوتُ* - وہ ٹیلہ جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں مشقت، توڑ پھوڑ اور تکلیف کا مفہوم ہے اور اس میں سہولت، آرام اور درستی کا مفہوم نہیں ہے۔ چنانچہ اس میں کمزوری اور شکستگی کے معنی بھی ہیں اور دشواری اور مشقت کے بھی*۔ عَنِتَّ الْعِظْمُ* - ہڈی کمزور ہو کر ٹوٹ گئی۔ عَنِتَّتْ يَدُهُ* - اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اور عَنِتَّتْہ کے معنی ہیں اس نے اسے مشکل میں ڈالا یا اس کے ذمہ ایسا کام لگا دیا جس کا کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوا*۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اِعْنَاتُ کے معنی ہیں کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کرنا*۔ صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ مَعَانِيَتٌ کے معنی تقریباً مَعَانِدَةٌ کے ہیں یعنی مسلسل عداوت و کشمکش کے، لیکن مَعَانِيَتٌ بائغ تر ہے کیونکہ اس میں خوف و ہلاکت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ عَنِتَّ فُلَانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں ہلاکت کا ڈر ہو**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مشقت اور دشواری وغیرہ کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے لَعَنِتُّهُمْ* (۱۱۶)۔ تم مشقت میں پڑ جائے یا ہلاک ہو جائے۔ دوسری جگہ ہے وَدَّشُوا مَاعَنِتُّهُمْ* (۱۱۷) وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت یا ہلاکت میں پڑ جاؤ۔ سورۃ نساء میں جنسی اختلاط کے احکام کے ضمن میں فرمایا۔ ذَٰلِكَ لِيَمَنَ خَشِيَ الْعَنَتَ* (۴)۔ یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ہلاکت میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ عَنِتَّ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنوں میں فساد، گناہ، ہلاکت، غلطی، لغزش، ظلم و زیادتی نیز سخت مشقت اور دشواری کا مقابلہ کرنا شامل ہیں*۔

ع ن د

عَنْدَ (نون پر تینوں حركاتوں کے ساتھ)۔ عُنُوْدًا۔ عِنْدًا۔ عَن۔ التَّطِيرِيشَ۔ وہ راستہ سے دور ہو گیا۔ ہٹ گیا۔ الگ ہو گیا۔ منحرف ہو گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں حد سے آگے بڑھ جانے اور صحیح راستہ کو چھوڑ دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عِنْدَتِ النَّاقَةُ*۔ اونٹنی باقی اونٹوں سے الگ ہٹ کر تنہا چرتی رہی۔ عِنْدَ الرَّجُلِ*۔ آدمی نے سرکشی کی اور

جان بوجھ کر حق کو رد کر دیا اور اس کی مخالفت کی۔ ایسا شخص عَنِيدٌ کہلائیگا۔ اَلْعَانِيْدُ - وہ اونٹ جو راستہ سے ہٹ جائے۔ اَلْمُعَانِيْدَةُ وَالْعِيَادَةُ - الگ ہو جانا۔ مسلسل مخالفت کرنا۔ عِنْدَ الرَّجُلِ عَنِ - اس نے سفر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، یا ان سے پیچھے رہ گیا۔ عَانِيْدَةُ الطَّارِئِ - وہ راستہ جو سیدھے راستے سے ایک طرف کوھٹا ہوا ہو۔ اَلْعِنْدُ - اُڑے آ جانا۔ حائل ہو جانا۔ سورۃ مدثر میں ہے اِنَّهٗ كَانَ لَا يَتِيْنَا عَنِيدًا (۹۶)۔ وہ ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا تھا۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔ وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (۱۵) ہر مستبد اور سرکش تباہ و برباد ہو گیا۔

عِنْدَ (ظرف)

عِنْدَ - ظرف ہے، بمعنی پاس۔ قریب۔ نزدیک۔ عِنْدَهُ عَلِيمٌ السَّاعَةِ (۸۵)۔ علم الساعت خدا کے پاس ہے۔ مینْ عِنْدَ اللّٰهِ (۸)۔ خدا کی طرف سے۔ اللہ کے پاس سے۔ قُلْ لَّوْ اَنْ عِنْدِي مَّا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهِ (۵۸) ان سے کہو کہ جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو وہ اگر میرے پاس ہوتا تو.....

ع ن ق

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑھنا اور پھیلنا بتائے ہیں، خواہ وہ اونچائی میں ہو یا زمین پر پھیلنا ہو۔ اَلْعُنُقُ (جمع اَعْنَاق) گردن*۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸۴)۔ ان کی گردنوں کے اوپر (یعنی سروں پر) مارو۔ نیز اس کے معنی جماعت کثیر ہیں۔ الْاَعْنَاقُ پیش پیش رہنے والے آدمی، نیز رؤسائے قوم کو بھی کہتے ہیں*۔ فَطَلَقَتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ (۲۱)۔ ان کے اکابرین قوم عاجز و درماندہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں۔ اکابرین کو ہمارے ہاں بھی ”گردن فراز“ کہتے ہیں۔

ع ن ک ب

اَلْعَنَكَبُوْتُ - مکڑی*۔ قرآن کریم نے مشرکین کے مسلک کو تار۔ عنکبوت سے تشبیہ دی ہے (۲۱) جو ذرا سے تنکے یا انگلی کے اشارے سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ مسلک، دلیل و برہان اور علم و بصیرت کے

بجائے توہم پرستی اور جہالت پر قائم ہوتا ہے، اس لئے علم و فکر کی ذرا سی جنبش اسے پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ شرک کا عملی مفہوم ہے کائنات میں ایک سے زیادہ ہستیوں کو صاحب اقتدار تسلیم کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہاں ایک سے زیادہ قوانین نافذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں قانون صرف ایک خدا کا رائج ہے۔ اس لئے انسانوں کی دنیا میں بھی صرف خدائے واحد کا قانون نافذ ہونا چاہئے۔ یہ توحید ہے اور نہایت محکم نظریہ حیات۔ اس کے خلاف ہر نظریہ زندگی، تار عنکبوت ہے۔

ع ن و

ابن قارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا نہایت توجہ اور شدید خواہش سے ارادہ کرنا۔ (۲) عاجزی۔ (۳) کسی چیز کا ظاہر ہونا اور نکلنا۔ عاجزی کے اعتبار سے اَلْعَنُوۡۤا۔ اَلْعَتَاۡۤءُ کے معنی ہیں قید ہو جانا۔ مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ اَلْعَنُوۡۤا۔ قہر اور زبردستی۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ عَنُوۡۤا کے معنی کسی چیز کو زبردستی لے لینے کے ہیں۔ لیکن ابن سیدہ نے اس کے معنی محبت کے بھی بتائے ہیں۔ اس صورت میں یہ لفظ اضداد میں سے ہو جاتا ہے جو قہر و جبر کے علاوہ تسلیم و اطاعت کے معنوں میں بھی آئے گا*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عَنَّا الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس نے اس شے کو ظاہر کر دیا**۔ عَنَّتِ اِلَآرَضُ بِالنَّبَاتِ تَعْنُو۔ زمین نے پودے نمودار کئے*۔ قرآن کریم میں ہے وَ عَنَّتِ التُّجُوۡۤہُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوۡۤمِ (۲۰/۱۱۹)۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی جھک جانے کے کئے ہیں اور بعض نے کھڑے ہو جانے اور کام کرنے کے*۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ نظام خداوندی کے قیام کے لئے بطیب خاطر کھڑے ہو جائیں گے اور قوانین السہیہ کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ سے کریں گے۔ اس میں قانون کا غلبہ و قوت، اور قانون ماننے والوں کی تسلیم و اطاعت، دونوں پہلو آجائے ہیں۔ بلکہ ”ظاہر ہو جانے“ کے اعتبار سے یہ بھی کہ لوگوں کی مضمحل صلاحیتیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے ابھر کر سامنے آجائیں گی۔

ع ۵۹

عہد الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا۔ اس کی پیہم نگہداشت کرنا۔ ان بنیادی معنوں کی رو سے عہد کا

استعمال اس پختہ وعدہ کے لئے بھی ہونے لگا جس کی نگہداشت ضروری ہو*۔
 جب اس لفظ کے بعد الہی آئے تو اس کے معنی حکم کرنے کے ہو جاتے ہیں**۔
 جیسے عہدِ نَا اِلٰہی لِیْ اٰہِیْمُ (۱۲۵)۔ ہم نے ابراہیم کو حکم دیا۔
 ابن فارس نے کہا ہے کہ الہی کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو
 اس بات کی ہدایت کرنا جس کی نگہداشت اس پر واجب کی جائے۔ راغب نے
 کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سے عہد و پیمان لیکر ایسے اس کے
 ایفاء کی تاکید کرنا۔ ذمہ داری اور امان کو بھی عہد کہتے ہیں**۔
 جیسے لَا یَسْتَالُ عٰہِدِی الْظَّالِمِیْنَ (۱۲۶)۔ جو ہمارے قانون سے
 سرکش ہو جائے اس کے بارے میں ہماری یہ ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔
 اسی طرح اَوْفُوا بِعٰہِدِیْ اَوْفِیْ بِعٰہِدِکُمْ (۱۲۷) کے معنی ہیں تم
 اپنے اس عہد کو پورا کرو جو تم نے میرے ساتھ استوار کر رکھا ہے ،
 اور میں ان ذمہ داریوں کو پورا کروں گا جو میں نے تمہاری بابت لے رکھی ہیں۔
 عہدِ وفاداری کو بھی کہتے ہیں**۔ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِہِمْ
 مِیْنَ عٰہِدٍ (۱۲۸)۔ ہم نے ان میں سے اکثر کو وفا شعار، یعنی اپنے عہد
 کا پابند، نہیں پایا۔ عہدہ کے معنی بھی ذمہ داری کے آتے ہیں**۔ والیوں
 اور حکام کے لئے جو شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں انہیں عہد کہتے ہیں۔
 نیز عہد کے معنی جان پہچان یا ملاقات کے بھی آتے ہیں۔ عہدِ الشَّیْءِ
 چیز کو پہچان لیا**۔

ع ۵ ن

الْعِیْہُنْ۔ رنگین اون۔ مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی اون۔ اَلْعِیْہُنَّ۔
 شاخ کا مڑ جانا اور ٹوٹ جانا یا بغیر جدا ہونے ٹوٹ جانا۔
 اَلْعِہَہِیْنْ۔ فقیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شکستہ حال ہوتا ہے۔ نیز
 اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اعضاء ڈھیلے ڈھالے ہوں***۔ ابن فارس
 نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت کے ہیں۔ چنانچہ
 قَضِیْبٌ عِہَہِیْنٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں خمیدگی اور
 شکستگی ہو۔

قرآن کریم میں ہے وَ تَكُونُ الْعِجْبَالُ الْعِیْہُنْ (۹۰)۔ پہاڑ
 رنگین (یا مختلف رنگوں والی) اون کی طرح ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ اَلْعِیْہُنْ
 الْعِیْہُنْ (۹۱) آیا ہے۔ دھنی ہونی رنگین اون۔ ٹکڑے ٹکڑے کی
 ہوئی مختلف رنگوں والی اون۔ ان کی خستگی اور شکستگی کی طرف اشارہ ہے۔

* محیط۔ ** تاج۔ *** تاج و راغب۔

ع و ج

هَوَجٌ - يَتَعَوَّجُ - ٹیڑھا ہونا - العِوَجُ - العِوَجُ فِي الْأَرْضِ - زمین کا ناہموار ہونا - عِجَاجٌ عَتْنُهُ - اس سے لوٹ گیا - پلٹ گیا، باز آیا * - مَا أَعْوَجُ بِكَتَلَامِهِ - میں اسکی بات کی طرف ملتفت نہیں ہوتا ہوں - اِنْعَاجٌ عَتَلَيْتِهِ - وہ اسکی طرف مڑ گیا ** - رَاغِبٌ نَ لَکْہَا ۛ کہ اَلْعَوَّجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے دیکھا جاسکے اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن اور ناہمواری کو جو عقل و بصیرت سے دیکھی جاسکے، جیسے معاشرہ کی ناہمواریاں اور نظام زندگی کا ٹیڑھا پن *** - ابْنُ فَارِسٍ نے کہا ۛ کہ اَلْعَوَّجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو سیدھی اور کھڑی چیز (مثلاً دیوار یا لکڑی وغیرہ) میں ہو - اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو بچھی ہوئی چیز یا کسی معاملہ میں ہو -

سورہ کہف میں قرآن کریم کے متعلق ۛ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱۸) یہ ایسا ضابطہ زندگی ۛ جس میں کہیں پیچ و خم نہیں - اس کے مقابلہ میں قَبِيحًا آیا ۛ (۱۸) - اس کے مخالفین کے متعلق کہا کہ یَبْغُؤْا نَهَارًا هِوَجًا (۲۵) - وہ چاہتے ہیں کہ اس کے راستہ میں ناہمواریاں اور خمیدگیاں پیدا ہو جائیں - لیکن جب وہ انقلاب آئیگا جسکی طرف قرآن کریم دھوت دیتا ۛ تو ان بڑے بڑے لوگوں کی خود اپنی خمیدگیاں اور ناہمواریاں صاف کر دی جائیں گی - ان کے بل نکل جائیں گے - (۲۰۵-۲۰۷) - یہ اسوقت اس داعی کے پیچھے پیچھے چلیں گے جس کی دعوت میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں (۲۰۸) - قرآن کریم جس صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ۛ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں - وہ بالکل صاف اور سیدھا راستہ ۛ - لیکن مفاد پرست گمراہ اس میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کرنا چاہتا ۛ -

ع و د

اَلْعَوْدُ - لوٹنا - بعض لوگوں نے کہا ۛ کہ اَلْعَوْدُ کسی کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ کرنا ہوتا ۛ - لیکن راغب اور زمخشری کی تحقیق ۛ کہ یہ لفظ ابتداء (پہلی مرتبہ) کسی کام کے کرنے پر بھی بولا جاتا ۛ * - چنانچہ صاحب محیط نے بھی اسکی تائید کی ۛ اور شہادت میں حضرت شعیبؑ کا یہ قول نقل کیا ۛ کہ انہوں نے مخالفین سے کہا کہ قَدْ اَفْتَرَيْنَا عَلٰی اللّٰهِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِیْلَتِنَا کُفْرًا (۲۸) -

”اگر ہم نے تمہارے مسلک کو اختیار کر لیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم نے خدا کے خلاف جھوٹا اتہام باندھا“۔ اسمیں عُدْنَا کے معنی ان کی ملت میں دوبارہ جانا نہیں، کیونکہ حضرت شعیبؑ ان کی ملت (مذہب) پر کبھی تھے ہی نہیں۔ اسلئے اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہارے مشرب کو کبھی قبول نہیں کریں گے*۔ لیکن اس آیت میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جواب جماعت (حضرت) شعیبؑ کیطرف سے ہے اور اس میں خود حضرت شعیبؑ شامل نہیں اگرچہ جواب انہی (حضرت شعیبؑ) کے الفاظ میں ہے۔ یعنی ان کا یہ جواب ان کی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر عُدْنَا کے معنی پلٹ کر واپس جانا ہونگے کیونکہ حضرت شعیبؑ کے ساتھی، پہلے ان مخالفین ہی کا مسلک رکھتے تھے۔

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عَاد کے معنی ویسے تو پلٹنے کے ہیں، لیکن بعد میں صَار کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی ”ہو گیا“۔ عام اس کے کہ وہ پہلے بھی ویسا تھا یا نہیں۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ ثُمَّ يَتَوَدُّوْنَ لِيَمَّا قَالُوْا (۵۸) پھر وہ اپنی کسی ہوئی بات کی طرف پلٹتے ہیں۔ عَائِدٌ۔ لوٹ جانے والا، اسکی جمع عَائِدُوْنَ ہے (۶۴)۔ اَعَادَ۔ يَعِيْدُ (۸۵)۔ لوٹانا۔ نیز اسکے معنی منزل مقصود تک پہنچانے کے بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ مَعَاد کے معنی ٹھکانا یا انجام** نیز آخری مقام کے بھی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے لَرَادُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸)۔ اسکے معنی (لوٹنے کی جگہ کے اعتبار سے) یہ کہئے جاتے ہیں کہ آپ (نبی اکرمؐ) پھر اسی مکہ میں داخل ہونگے جہاں سے کفار نے آپکو نکالا تھا۔ اسکے معنی وطن اور جائے پیدائش کے بھی لئے جاتے ہیں***۔ لیکن اگر اس میں مَعَاد کے معنی منزل مقصود کے لئے جائیں تو وطن یا جائے پیدائش کی بہ نسبت ”منزل مقصود“ زیادہ مناسب ہونگے، اس لئے کہ ایک نبی، وطن کی نسبتوں سے بلند ہوتا ہے، اور وہ فضا جو اس کے مشن کے لئے زیادہ مساعد ہو اس کا وطن بن جاتی ہے۔ لہذا آپ کا مکہ کیطرف لوٹنا اپنے وطن کی طرف مراجعت نہ تھی بلکہ آپ کے مشن کی تکمیل تھی۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ يَعِيْدُ سے مراد تکرار نہیں (یعنی بار بار لوٹانا نہیں) بلکہ ہر شے کو مختلف گردشیں دے کر (مختلف مراحل سے گزار کر)

اسکی ابتدا سے آخری نقطہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایسا کرنے والے کو رَبٌّ کہتے ہیں۔ اس ضمن میں (ر-ج-ع) کا عنوان بھی دیکھئے۔

الْعَائِدَةُ کے معنی احسان اور سلوک، مہربانی اور منفعت کے ہیں*۔ چنانچہ کہتے ہیں هَذَا الْاَمْرُ اَعْوَدُ عَائِدَتِكَ۔ یہ کام تمہارے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ نیز یہ کہه فُلَانٌ مَّائِيْبُدِيٌّ وَمَّائِيْعِيْدٌ۔ فلاں آدمی کے پاس کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں ہے۔ نہ وہ پہلی مرتبہ کوئی کام کر سکتا ہے نہ اسکی تکرار کر سکتا ہے*۔ اَلْمُعِيْدُ اسے کہتے ہیں جو اسکام کی طاقت رکھتے جسکا وہ عادی ہو چکا ہے۔ دراصل مُعِيْدٌ اس نراونٹ کو کہتے ہیں جو بار بار جفتی کھانے پر بھی تھکنے والا نہ ہو۔ نیز معاملات سے واقف اور تجربہ کار آدمی کو بھی کہتے ہیں*۔ اَعَادَ لِيْلَةً مَّرْرًا۔ اسکام کی طاقت رکھی**۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ يَبْدِيٌّ وَّيَعِيْدُ (۹۵/۱۳) میں تکرار اور اعادہ ہی مراد نہیں بلکہ پوری پوری قوت اور طاقت، تدبیر اور واقفیت سے آخری نقطہ (انجام) تک پہنچانا بھی مراد ہے۔ یہ ہے ہر شے کا مَعَادٌ۔ (مَبْدَأٌ اور مَعَادٌ کیلئے دیکھئے عنوان ب-د-ا)۔ اَلْعِيْدُ۔ وہ وقت جسمیں خوشی یا غم لوٹ کر آئے*۔ [الْعَوْدُ۔ ہر پتلی اور باریک لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز اس لکڑی کو بھی جس سے دھونی دی جائے]***۔

ع و ذ

عَائِدٌ۔ ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو۔ اسکی جمع عَوْدٌ ہے****۔ عَادَاتٌ یُوَلَّدُهَا کے معنی ہیں مادہ کا اپنے بچہ کے پاس کھڑے رہنا اور اسکی حفاظت کرتے رہنا جب تک وہ چھوٹا رہے*۔ اَلْمُعَوِّذُ اونٹوں کی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو مکانات کے آس پاس ہو (تاکہ اونٹ ہر وقت نگاہ میں رہیں)۔ ان معانی کے اعتبار سے تَعَوِّذٌ اور اِسْتِعَاذٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی پناہ لینا۔ اسکی حفاظت میں محفوظ ہو جانا، اور عَاذٌ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اسے لازم پکڑ لینا۔ مستقل طور پر اختیار کر لینا****۔

یوں تو نظام خداوندی قائم کرنے والی جماعت کو ہمیشہ اپنے نظام کی حفاظت کیلئے قوانین خداوندی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہونی ہے لیکن

* تاج۔ ** محیط۔ *** ابن فارس۔ **** تاج و محیط۔

اس نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں، جبکہ انکی اپنی قوت ہنوز کم اور مخالفین کی مخالفت شدید تر ہوتی ہے، انہیں ان قوانین کے ذریعے اپنی حفاظت و پرورش کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے ایک نوزائیدہ بچے کو شروع شروع میں اپنی ماں کی حفاظت و پرورش کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے)۔ یہ ہے وہ مرحلہ جس میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳)۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴) کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا۔ اس سے ذرا دور نہ ہٹنا۔ ذرا سے خطرے اور آہٹ کے وقت جھٹ سے اسکے آغوش میں آجانا اور اس طرح مخالفین کی سرکش قوتوں سے محفوظ ہو جانا۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآنی نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں تعوذ کی ضرورت خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام نظام کے بعد تعوذ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سے دور لے جانے والے میلانات و جذبات اور طاعوتی قوتوں سے ہنسا جوئی کی ضرورت تو زندگی کے ہر سانس میں رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نظام کے ابتدائی ایام میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی مرکز کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جب ایک طرف حقائق واضح ہو جائیں اور دوسری طرف نظام محکم ہو جائے، تو پھر چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ از خود ہوتا جاتا ہے۔

سورہ نحل میں ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (۹۸)۔ اس کے عام معنی یہ کہنے جاتے ہیں کہ جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو پہلے اعوذ پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کے اثرات اور مستبد قوتوں کا آلہ کار بننے سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اسکی تشریح اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی گئی کہ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمَلٰی رَبِّہِمۡمُ يَتَشَوَّكُمۡ وَنَ (۹۹)۔ شیطان (یا ان سرکش قوتوں) کا غلبہ ان لوگوں پر کبھی نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتے ہیں اور قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے حضرت موسیٰ نے فرعون کے استبداد سے حفاظت حاصل کی تھی جب کہا تھا کہ اِنِّیْ عِزَّتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَكَبِّرٍ (۲۴)۔ میں ہر متکبر (کے استبداد سے بچنے کے لئے) اپنے اور تمہارے نشوونما دینے والے کی حفاظت میں جاتا ہوں۔

یہ ہے تَعَوُّذٌ کا قرآنی مفہوم - یعنی خطرے کے وقت اپنے نظام سے اور زیادہ شدت سے متمسک ہو جانا اور قوانین خداوندی کی اور زیادہ پابندی سے اطاعت کرنا - اس کے برعکس ہمارے ہاں تَعَوُّذٌ سے مقصود صرف اتنا رہ گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ پڑھ لیا جائے ، یا قرآن کریم کی آیات کے تَعَوُّوْیْذ لکھ کر گلے میں ڈال لئے جائیں - (ذرا تَعَوُّوْیْذ کے مفہوم پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ؟) - یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت (پڑھنا) ضروری ہے (تاکہ اسے سمجھا جائے اور سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے) اور جس طرح ہر عبد مومن ہر کام کی ابتدا خدا کے تصور سے کرتا ہے اسی طرح ، قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز بھی غیر خدائی قوتوں سے حفاظت خداوندی (تَعَوُّوْذ) کے احساس سے کیا جائے (اور اس کے لئے اَعُوْذُ بِاَللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کے الفاظ کہ لئے جائیں تو یہ انسان کے جذبات کے اظہار کا طریق ہو جائیگا) - لیکن یہ سمجھ لینا کہ مقصود صرف ان الفاظ کا دہرا لینا ہے ، ٹھیک نہیں - الفاظ ، اظہار مقصد کا ذریعہ ہیں - مقصود بالذات نہیں - اَعُوْذ اور بِسْمِ اللّٰهِ درحقیقت قرآن کریم کی اس بنیادی تعلیم کا اعلان ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ فَتَمَنُّ يَثْكُفُّرٌ بِلَا طَغَاوْتٍ وَيُؤْمِنُ بِمَا لَلّٰهُ فَقَدَرٌ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲۵۷) - جو شخص ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرے اور صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرے ، تو اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا -

ع و ر

الْعَوْرُ - ایک آنکھ کی بینائی کا جائے رہنا - اَعْوَرٌ - کانا - نیز کوئے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ عربوں میں کانا اور کوا دونوں منحوس شمار کئے جاتے تھے - اسی سے کمزور ، بزدل اور گاؤدی آدمی کو بھی کہتے ہیں جس سے کبھی کوئی بھلائی کا کام نہ ہو سکتا ہو - نیز وہ راستہ بتانے والا جسے خود بھی راستہ اچھی طرح معلوم نہ ہو - اَلْاَعْوَرُ مِّنَ الْكُتُبِ - مٹی ہوئی کتاب - اَلْاَعْوَرُ مِّنَ الطَّرِيقِ - وہ راستہ جس پر کوئی نشان نہ ہو - اَلْعَوْرَةُ - ہر وہ چیز جو آنکھ کو تکلیف دے - اَلْعَوْرَةُ - ملک کی سرحد میں اس قسم کا خلل جہاں سے دشمنوں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہو - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ عَوْرَةُ الْقَوْمِ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں سے کسی قوم کو دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو -

چنانچہ سورۃ احزاب میں جوہے کہ اِنَّ بِسُوْرَتِنَا عَوْرَةً* (۳۳)۔ تو اس کے یہی معنی ہیں۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اَلْعَوْرَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے خالی ہونے کی وجہ سے اس کی نگہداشت ضروری ہو۔ اَعْوَرَ الشَّيْءُ*۔ کسی چیز کا اس طرح نمایاں ہو جانا کہ دوسرا اس پر حملہ کر سکے۔ ان معانی کے اعتبار سے اَلْعَوْرَةُ ہر اس شے کو کہتے ہیں جس میں کوئی ایسا خلل یا نقص ہو جس سے خوف کا امکان ہو۔ نیز ہر وہ شے جس سے شرم و حیا کی جائے۔ جو باعث عار ہو۔ عورت یا مرد کے مقام پر ستر کو بھی کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں عَوْرَاتِ النِّسَاءِ (۲۴) آیا ہے جس کے معنی ہیں عورتوں کی جنسیات (Sex) کے متعلق باتیں جنہیں عام طور پر پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے۔ عشا کی نماز کے بعد۔ اور دوپہر کے وقت جب تم کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتے ہو ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ (۲۸)۔ یہ تین ایسے اوقات ہیں جن میں تم کپڑے اتار کر بلا تکلف لیٹتے ہو۔ تمہارا پورا پورا ستر نہیں ہوتا۔ مطلب (Privacy) سے ہے۔

ع و ق

اَلْعَوْقُ*۔ روک دینا۔ لوٹا دینا۔ واپس کر دینا۔ نیز وہ آدمی جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ نیز وہ جو لوگوں کو بھلے کا۔وں سے روکے۔ عَاقَتْنِیْ عَنِ الْاَمْرِ الَّذِیْ اَرَدْتُ*۔ اس نے مجھے اس کام سے روک دیا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ اَلْمَعْوِیُّقُ*۔ روکنا۔ مَعْوِیْقُ*۔ روکنے والا*۔ قرآن کریم میں اَلْمَعْوِیْقَیْنِ (۳۸) آیا ہے۔ عَوَائِقُ الدُّهْرِ*۔ وہ حوادثِ زمانہ جو انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور انہیں دوسری مصروفیتوں سے روک دیں*۔ یَعْوُقُ*۔ قبیلہ کنسانہ کے بت کا نام تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قوم نوح کے بت کا نام تھا*۔ (۴۰)۔

ع و ل

اَلْعَوْلُ*۔ ہر وہ چیز جو انسان کو گرانبار کر دے۔ جس کے ہوجہ تلے وہ دب جائے**۔ عَالَ الشَّيْءُ*۔ فَلَانًا۔ فلاں پر وہ چیز غالب آگئی اور اس پر ہوجہ بن گئی جس کی وجہ سے وہ فکر مند ہو گیا۔ اَلْعِیَالُ*۔ وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو۔ جن کے ہوجہ کے نیچے وہ دبا ہوا ہو۔ اسی سے

اعمال الرّجل کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا اور یہ بھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہو گیا۔ عَمَالُ التَّمِيزَانِ کے معنی ہیں ترازو میں کان ہوئی (یعنی اس میں ہاسنگ کی ضرورت ہو گئی) اور اس کے ہلڑوں کا وزن برابر نہ رہا۔ یہاں سے اس کے معنی بے انصافی کرنے کے آئے ہیں۔ مَالٌ رَفِی الْحُكْمِ۔ اس نے فیصلہ کرنے میں ظلم کیا*۔

سورة نساء میں جہاں معاشرہ کی ہنگامی حالت میں اجتماعی مشکل کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اگر تم سمجھو کہ ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ اس کے بعد ہے ذَٰلِکَ اَدْنٰی اَلَا تَتَعَوُّظُوْا (۳۰)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ تم حق سے نہ ہٹ جاؤ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ تم کثیر العیال ہو کر بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ**۔ (نوٹ۔ ع۔ ی۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

ع و م

اَلْعَوْمُ۔ تیرنا۔ اَلسَّقْبُحُ ہانی کے اوپر تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی غوطہ نہ کھائے اور اَلْعَوْمُ اس تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی ہانی کے نیچے بھی چلا جائے۔ اَلْعَمَاسَةُ۔ چھوٹی سی کشتی کو کہتے ہیں جس پر دریا عبور کیا جائے۔ اَلْعَوَامُ۔ سبک رفتار گھوڑا**۔

قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کُلٌّ رَفِیٰ فَلَکَکَ یَسْتَبِیحُوْنَ (۳۶)۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے۔ اسی تیرنے کی جہت سے اَلْعَمَامُ کے معنی سال ہوئے۔ یعنی وہ مدت جس میں ”آفتاب“ تیر کر اپنا دورہ پورا کر لیتا ہے***۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَمَامُ اور اَلْسَّنَّةُ میں فرق یہ ہے کہ اَلْسَّنَّةُ کا لفظ اکثر اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں قحط سالی ہو اور اَلْعَمَامُ اس سال کے لئے جس میں فراخی اور فارغ البالی ہو**۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْسَّنَّةُ شمسی سال کے لئے بولا جاتا ہے اور اَلْعَمَامُ عربی مہینوں (قمری سال) کے لئے۔ اس لئے اَلْعَمَامُ، سَنَّةُ کے مقابلہ میں چھوٹا ہوتا ہے**۔

سورة عنکبوت میں حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَتَلَبِثَ فِیْہِیْمَ اَلْثَلَاثِ اَلْاَحْمَمِ سِیْنِ عَمَامًا (۲۹)۔ اس میں سَنَّةُ اور عَمَامُ دونوں آگئے ہیں۔

*تاج نیز کتاب الاشتقاق۔ **تاج۔ ***راغب۔

راغب کی توجیہ کے مطابق سَنَّةٌ سختیوں کا دور ہے اور عَمَامٌ خوشحالی کا زمانہ*۔ (اس کی مزید تشریح کے لئے عنوان س - ن - و (ہ) بھی دیکھئے)۔

ع و ن

عَوْنٌ کے معنی ہیں مدد نیز مددگار**۔ عَوَانٌ ادھیڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی جو جوانی اور کعبہ رسانی کے درمیان ہو*۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تَارِضٌ وَلَا يَكْبُرُ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ - وہ ساند (یا گائے) نہ بوڑھا ہے نہ نوجوان، بلکہ ان کے بین بین عَوَانٌ ہے۔ یعنی ادھیڑ عمر کا۔ (۶۸)۔ مُتَعَاوِنَةٌ - اُس عورت کو کہتے ہیں جو اگرچہ عمر میں زیادہ ہو لیکن اس کی جسمانی ساخت میں اعتدال ہو اور جسم ایسا بھرا ہوا ہو کہ نیچے کی ہڈیاں نظر نہ آئیں*۔ یعنی اس میں نہ بچپن کا الٹ پن ہو۔ نہ جوانی کی تیزی اور تلون۔ اور نہ ہی بڑھاپے کی کمزوریاں ہوں۔ بلکہ اس میں درمیانی عمر کی پختگی آچکی ہو یہ تو اسکی ذہنی حالت ہو، اور جسمانی ساخت میں اعتدال اور بھراؤ ہو۔

اِسْتَعَانَ (۱۰۰) کے معنی ہیں اپنی ذات کے لئے اعتدال کی خواہش کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا۔ اسی نہج سے اللہ کو اِسْتَعَانَ (۲۱۳) کہا گیا ہے۔ اَمَانَ (۱۸۰) کے معنی ہیں کسی کی مدد کرنا۔ اور تَعَاوَنَ (۲۰) کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

اِسْتَعَانَ کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے اِيشَاكَتٌ نَعْبُدُ وَ اِيشَاكَتٌ نَسْتَعِيْنُ (۱۰۰) کا مفہوم واضح ہو جائیگا۔ یعنی ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو قانون خداوندی کی متعین کردہ راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ان قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ (دیکھئے ع - ب - د) اور انہی کے ذریعے اپنی صلاحیتوں اور ذات میں اعتدال چاہتے ہیں۔ اس قسم کا اعتدال کہ اس میں پختگی اور حسن دونوں صحیح صحیح توازن و تناسب لئے ہوں۔ ان دونوں آرزوؤں سے ایسا دائرہ بن جاتا ہے جس میں ساری زندگی ایک نہج پر چلتی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنی مضمحل صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کرنا۔ اور ان صلاحیتوں کو قوانین خداوندی ہی کے مطابق صرف کرنا تاکہ ان سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو اور عالمگیر انسانیت صحیح اعتدال کی روش اختیار کر سکے۔ آپ نے اس کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس میں اطاعت اور اطاعت کے ساتھ استقامت

دونوں شرطیں آجاتی ہیں۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہہ وَاَسْتَغِيثُوا بِالْمَبْتَرِ وَالصَّلَاةِ (۲/۲۵)۔ صلوٰۃ اور استقامت کے ذریعے اپنی صلاحیتوں میں اعتدال اور پختگی طلب کرو۔ یہی طریق تمہارا معین و مددگار ہو سکتا ہے۔ اس سے خدا کی معاونت حاصل ہوتی ہے۔

نیز جہاں برّ و تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کی تاکید کی گئی ہے، وہاں تعاون سے بھی یہی مراد ہے۔ یعنی کسی شخص میں جن امور کی کمی وہ گئی ہو، اس کمی کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرنا تاکہ اس کا اعتدال برقرار ہو جائے اور اس کی خامی پختگی سے بدل جائے۔

ع ی ب

الْعَيْبُ - نقص۔ برائی۔ خرابی۔ عَابَ الشَّيْءُ - وہ شے عیب دار ہو گئی۔ عَيْبَتْهُ - مینے اسے عیب دار بنا دیا۔ یا مینے اس میں عیب نکالا*۔ سورہ کہف میں ہے فَتَارِدُتْ اَنْ اَعْيِبَهَا (۱۸/۲۹)۔ مینے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔

الْعَيْبَةُ مِنَ النَّجْلِ - آدمی کے راز کی جگہ۔ الْعِيَابُ - مینے اور قلوب۔ دھنیسے کی وہ لکڑی جسے تانت پھر مار کر وہ روئی دھنتا ہے*۔ (اس سے نکتہ چینی اور عیب جوئی کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔)

ع ی ر

الْعَيْرُ - گدھا۔ الْعَيْرُ - قافلہ۔ اونٹ جو غذائی سامان لاد کر لاتے ہیں۔ وہ جانور جن پر غذائی سامان لاد کر لایا جاتا ہے خواہ وہ اونٹ یا گدھے ہوں یا خچر*۔ سورہ یوسف میں ہے اَبْقَتْهَا الْعَيْرُ (۱۲/۱۶)۔ اے قافلہ والو!۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) کسی چیز کا ابھرا اور اوپر کو نکلا ہوا ہونا۔ اور (۲) آنا جانا۔ آمد و رفت۔ الْعَيْرُ ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں۔ مثلاً شانے کے وسط کی ہڈی۔ ہاؤں کے پشت پر ابھری ہوئی ہڈی۔ اسی سے بوجھ لادنے والے جانوروں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آمد و رفت کی جہت سے قافلہ کو۔

عیسیٰ (علیہ السلام)

عیسیٰ - جوہری کا خیال ہے کہ یہ عبراتی یا سربانی لفظ ہے۔ لیث کا خیال ہے کہ یہ ایشوع سے معدول ہے*۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عیسو کی

بگڑی ہوئی شکل ہو۔ راغب کا خیال ہے کہ اگر یہ لفظ عربی الاصل ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ آلعیسٰی سے ماخوذ ہو جس کے معنی ایسے سفید اونٹ ہیں جنکی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو**۔ لیکن تاج نے کہا ہے کہ جنکی سفیدی میں قدرے بھورا پن ملا ہوا ہو*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ حضرت مسیحؑ کے نام کے لئے آیا ہے (۳۴)۔ دوسرے مقام پر آپ کو آلعسٰی بنح عیسیٰ ابن مریم (۳۴) بھی کہا گیا ہے۔ آپ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں۔ جب قوم بنی اسرائیل کے انفرادی اور اجتماعی جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں بطور اتمام حجت، حضرت عیسیٰؑ کو مبعوث کیا۔ آپ نے انہیں اس آسمانی انقلاب کی طرف دعوت دی جو حضرت نوحؑ سے لیکر آخر تک تمام انبیائے کرام پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ یعنی سلوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کو مٹا کر معاشرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرنے کے لئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت (مفاد پرست اور غلط ہیں) یہودی پیشواؤں کے بھی خلاف جاتی تھی اور رومی سلطنت کے بھی خلاف۔ چنانچہ انہوں نے ملکر سازش کی اور چاہا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جرم بغاوت میں صلیب کی سزا دے دی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تدبیر کو ناکام کر دیا اور حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے ہی ہجرت کر کے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔

بجب یہودی اپنی اس تدبیر میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے دوسری چال چلی۔ ہال ایک مستند یہودی تھا۔ اس نے مذہب عیسوی اختیار کیا اور رفتہ رفتہ سینٹ کے درجے پر پہنچ گیا***۔ اس کے بعد اس نے بتدریج اس دین کے بجائے جو حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا تھا ایک نیا مذہب پیش کر دیا جس میں ابنیت مسیح۔ الوہیت مسیح۔ کفارہ کا عقیدہ۔ خانقاہیت کا مسلک، عیسائیت کے بنیادی عناصر قرار پا گئے۔ قرآن کریم نے آکر ایک طرف ان اتہامات اور الزامات کی تردید کی جو یہودی حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسری طرف ان تمام باطل عقائد کی تکذیب کی جنہیں سینٹ ہال (اور اس کے متبعین نے وضع کر کے) عیسائیت کا نقاب اڑھا رکھا تھا۔ تاریخی حقائق سے جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں**** یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق جو کچھ یہودی

* تاج۔ ** راغب۔ *** عیسائیت میں سینٹ مرنے کے بعد بنتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ سینٹ بنتا وہی ہے جو اپنی زندگی میں اس مقام تک پہنچ چکا ہو۔ **** حال ہی میں، بحر میت کے قریب غاروں سے جو قدیم دستاویزیں ملی ہیں وہ بھی اصلی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

اور عیسائی مسائلتے چلے آ رہے تھے (اور اب بھی مان رہے ہیں) وہ غلط ہے اور صحیح پوزیشن وہی ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے (تفصیل ان تمام امور کی میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں ملیگی)۔

ع ی ش

عَمَاشٌ - يَتَعَيَّشُ - عَيْشًا - مَعَاشًا - مَعْيِشَةً - اس نے زندگی گزار دی - اَلْعَيْشُ - زندگی - زندگی گزارنا - چونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی اسلئے آجکل اَلْعَيْشُ روٹی کو بھی کہتے ہیں - اَلْمَعْيِشَةُ - کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے - سامان زیست* - (جمع مَعَايِشُ) قرآن کریم میں اَرْضُ کے متعلق ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (۱۰ و ۱۱) اس میں تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا - لہذا ہمارے دور میں جن چیزوں کو وسائل پیداوار (Means of Production) کہتے ہیں وہ سب اَرْضُ کے اندر آ جاتی ہیں - (دیکھئے عنوان اَرْض) - اَلْمَعَاشُ - اسباب زندگی کے تلاش کرنے کا موقع* - وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (۱۱) - عَيْشَةً - زندگی - طرہٴ بود و ماند - فَتَوَوَّيْ عَيْشَةً رَّاضِيَةً (۱۱) - تو اس کا طریق زندگی قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہے - با ایسا ہے جس سے وہ خوش ہے - سورة طہ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامان زیست (روٹی - کپڑا - مکان وغیرہ) بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اس کے لئے اسے جگر پاش مشقتوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا (۱۸، ۱۹) - یہ انسان کی قدیمی زندگی تھی جس میں افراد کے باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوتا تھا - اس کے بعد اس نے تمدن و معاشرت کی زندگی شروع کر دی جس میں سامان زیست کے حصول کے لئے باہمی مقابلہ شروع ہو گیا اور انسان مشقتوں میں پڑ گیا - اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو ضابطہ قوانین خدا کی طرف سے ملے اس کا اتباع کرو - اس سے رزق کی فراوانی ہو جائیگی (۲۳) اس کے بعد ہے وَ مَن اَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَاِنَّ لَهُ مَعْيِشَةً ضَنْكًا (۲۴) - اور جو قوم ہمارے اس ضابطہ قوانین سے اعراض پر تیگی تو اس کی معشیت تنگ ہو جائیگی - وَ نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اَعْمٰی (۲۴) - اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے -

کے قدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے - اسے سامان زندگی کی

محتاجی ہوتی ہے۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ لہذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گذارنا اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر اطمینان دے لینا کہ ہماری ”روحانی ترقی“ ہو رہی ہے قرآن کریم کی رو سے کھلا ہوا فریب ہے۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط بلکہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہاں کی محتاجی اور زیوں حالی قرآن کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے مکمل نظام عطا کر دیا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے وہ تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں جن میں اس وقت پوری انسانی دنیا گرفتار ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔ نیز دیکھئے عنوان (ع - م - ی)۔

ع ی ل

الْعَيْلَةُ*۔ ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قاقہ اور حاجت کے ہیں۔ عَالٌ - يَعْثُلُ*۔ محتاج اور ضرورت مند ہو جانا۔ عَائِلٌ*۔ ضرورت مند۔ محتاج*۔ وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنِي (۱۳/۸)۔ خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو تجھے اتنا دیا کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا۔ الْعَيْلَةُ*۔ محتاجی۔ تنگ دستی (۹/۲۸)۔ الْعَالَةُ*۔ قاقہ۔ الْعَيْلُ (عَائِلٌ) کی جمع ہے۔ وہ لوگ جن کی کفالت کی جائے۔ جن کا خرچ اٹھا ہوا جائے*۔

ع ی ن

عَيْنٌ* کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ سو سے بھی اوپر۔ اس کے اصلی معنی آنکھ کے ہیں۔ باقی سب اس سے مستعار ہیں*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آنکھ۔ چشمہ۔ جاری پانی کیلئے اور مَعِينٌ*۔ سہز و شاداب (زمین) کے معنوں میں آیا ہے۔ مثلاً عَيْنًا (۶۰/۲) بمعنی چشمہ۔ عَيْنُ النَّاسِ (۲۹/۲) لوگوں کی آنکھوں کے سامنے۔ انکے رویرو۔ سورہ المومنون میں ہے ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٌ (۲۳/۵)۔ ہموار اور سربز و شاداب زمین۔ سورہ کہف میں ہے تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ (۱۸/۸) یعنی جھیل یا سمندر میں۔ کَا۟سٍ مِّنْ مَّعِينٍ (۳۵/۳) کے معنی ہیں جاری پانی سے لبریز پیالہ۔ [مَعِينٌ] کو اعلیٰ لغت عَرَبِیَّةٌ سے بھی بتاتے ہیں

اور مَعْنٰی سے بھی۔ اس لئے اسے م۔ ع۔ ن کے تحت بھی لکھ دیا گیا ہے۔
مَاعُونُ کے لئے دیکھئے عنوان م۔ ع۔ ن۔]

اَعْيُنُ کے معنی ہیں وہ مرد جس کی آنکھ جنگلی گائے کی آنکھ جیسی ہو*۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی اسکی جمع عَیْنُ ہے۔ یہ لفظ (۳۸) میں آیا ہے۔ نیز (۲۰) میں حُمُورِ عَیْنُ آیا ہے۔ (اسکے معنی کیلئے عنوان ح۔ و۔ ردیکھئے)۔ عَیْنُ*۔ اَعْيُنُ کی بھی جمع ہے جو مذکر کے لئے بولا جاتا ہے اور عَیْنَتَا کی بھی جو مؤنث کے لئے آتا ہے۔ اسی طرح حُمُورُ بھی مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔

ع ی ی

عَنِ الرَّجُلِ بَا لَمْزٍ۔ آدمی کسی کام کو نہ کر سکا اور اسکے کرنے سے عاجز رہا۔ عَنِیَّ عَنِّ حُجَّتِهِ۔ وہ اپنی دلیل و حجت پیش کرنے سے عاجز رہا یا اسے ہختگی سے پیش نہ کر سکا۔ اَعْيَا عَیْنُہُ الْاَلْمُرُ۔ وہ کام اسپر دشوار ہو گیا۔ اَعْيَا الْمَاشِیَ۔ چلنے والا تھک گیا*۔ اَلَا عَیْنَاءُ۔ کمزوری اور تکان جو چلنے سے پیدا ہو جائے**۔ سورہ احقاف میں ہے لَمْ یَعْنِ بِخَلْقِہِیْنِ (۱۱۸) اَللّٰہ (کائنات کی) تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا یا اسکے بنانے سے عاجز نہیں رہا۔ سورہ ق میں ہے اَفَعَعِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَلَا وَّلِ (۱۵)۔ کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے یا عاجز رہے (جو یہ لوگ خلق جدید کے متعلق شبہ میں ہیں)۔ اس میں ضمناً بائبل کے اس تصور کی بھی تردید کر دی گئی جس کی رو سے اس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ روز میں زمین اور آسمان پیدا کئے اور ساتویں دن تھک کر آرام کیا۔ (اسے یوم سبت کہا جاتا ہے جس میں یہودی کام کاج نہیں کرتے)۔ خدا تھکتا نہیں۔ نہ ہی اسے نیند یا اونگھ آتی ہے۔ (۲۵۵)۔

غ

غ ب ر

غَبَرَ الشَّقِيُّ * - کوئی چیز باقی رہ گئی - ٹھہر گئی - الْغَبِيرُ مِّنَ اللَّيْلِ - رات کا بقیہ - الْغَبَرُ وَالْغَبَارُ وَالْغَبَرَةُ - مٹی - گرد و غبار - الْغَبِيرُ - کینہ (جو دل میں باقی رہ جاتا ہے) * - دَاهِيَةُ الْغَبَرِ - باقی رہنے والی آفت جسکے ازالہ کی کوئی شکل نہ ہو سکے * - وہ مصیبت جو گذر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے ** - سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق ہے کَأَنْتَ مِّنَ الْغَابِرِينَ (۸۳) - وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی -

سورہ عبس میں ہے عَلَيْنِهَا غَبَرَةٌ * (۸۶) - چہروں پر گرد و غبار پڑا ہوگا - بمقابلہ مُسْفِرَةٌ - ضَاحِكَةٌ - مُسْتَبْشِرَةٌ * (۸۸-۸۹) - یعنی درخشندہ متبسم اور نوید آمیز چہروں کے مقابلہ میں افسردہ، غمناک اور حسرت آگیز چہرے -

غ ب ن

الْغَبْنُ - کسی مشترکہ معاملہ میں اپنے ساتھی کے مفاد یا حقوق میں پوشیدہ طور پر کمی کرتا - اگر یہ کمی مال میں ہو تو غَبْنٌ فَلَانٌ کہتے ہیں اور اگر یہ کمی رائے وغیرہ میں ہو تو غَبْنٌ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ غَبْنٌ کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور الْغَبْنُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے ** - چنانچہ الْمُغْبِنُ بغل اور کنج ران کو کہتے ہیں - غَبْنَتُهُ فِي الثَّبَنِ غَبْنًا - اس نے بیع میں اسے دھوکا دیا - یعنی اسے چیز کم یا خراب دیدی * - غَبْنٌ رَأْيُهُ - اسکی ذکاوت اور فطانت کم ہو گئی *** -

* تاج - ** راغب - *** محیط -

قرآن کریم نے قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴) کہا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن ظاہر ہو جائیگا کہ لوگوں نے جو معاملہ اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا [یعنی اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ کر اسکے بدلے میں جنت لے لی۔ (۱۱۱)] اس میں کس نے کس قدر کمی کی ہے۔ یا اس کے معنی ہوں وہ دن جب چیزیں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف ظاہر ہوں گی جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگا رہے تھے*۔

قرآن کریم نے ظہور نتائج کے وقت کے متعلق کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو جائیگا اور نظر آجائیگا کہ کسبابی کے معیار تک پہنچنے کے لئے ان میں کس قدر کمی رہ گئی ہے (۱۱۱)۔ اس لئے یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴) کے معنی ہونگے وہ وقت جب تمام لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں معلوم ہو جائیگا کہ کس میں کس قدر کمی رہ گئی ہے۔ اعمال کے وزن کی کمی درحقیقت ان صلاحیتوں کی کمی ہے جن کے پورا ہونے سے انسان زندگی کی اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ لہذا یَوْمُ التَّغَابُنِ۔ ظہور نتائج کا وقت ہے جب ایک دوسرے کی کمی نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی، خواہ وہ اس دنیا میں باطل کی قوتوں سے ٹکراؤ کا وقت ہو اور خواہ اس کے بعد کی زندگی میں انسانی صلاحیتوں کی جانچ کا وقت۔ اس زندگی میں تو قدم قدم پر تَغَابُنِ کا مرحلہ ہوتا ہے۔

تَغَابُنِ کے لفظی معنی ہیں باہم غبن کرنا۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق یا مال میں کمی کرنا۔ ایک دوسرے کی تغلیط کرنا۔ ایک دوسرے کو خفیہ طریق سے دھوکا دینا۔ قیامت کے دن (یعنی مرنے کے بعد ظہور نتائج کے وقت) مختلف افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے پر الزام دھرنے (ایک دوسرے کو کم عقل بتانے) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس اعتبار سے یَوْمُ التَّغَابُنِ کہا گیا ہو۔ البتہ وہاں ایک دوسرے کے حقوق میں کمی کرنے یا دھوکا دینے کا موقع نہیں ہوگا۔ اس لئے ان معانی کے اعتبار سے بھی سمجھا جائیگا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو جو دھوکے پہلے دئے تھے ان کے نتائج وہاں سامنے آجائیں گے۔

غ ث و

الْفُشَاءُ۔ جھاگ اور کوڑا کچرا۔ وہ کوڑا کرکٹ اور ہوسیدہ پتے وغیرہ جسے سیلاب بہا کر لائے۔ گندی گلی سڑی چیز کو بھی کہتے ہیں**۔

*راغب** تاج و محیط۔

اور خس و خاشاک کو بھی جو کسی کام کا نہ رہے۔ یہ ہر اس چیز کے لئے ضرب المثل ہے جو کس مورمی کے عالم میں ضائع اور فنا ہو جائے اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ قرآن کریم میں اس قوم کے متعلق جو سکافات عمل کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہو کہا گیا ہے فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً (۲۳)۔ ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا، اور اس طرح وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے، جیسا کہ سورہ السعد میں ہے کہ سیلاب آتا ہے تو خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے (۱۳)۔

یہ حالت تو اس قوم کی ہے جو یکسر تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسی قومیں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کی محکوم بن کر زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے سیلاب کے ساتھ بہنے والا خس و خاشاک کہ وہ بالکل بے دست و پا ہوتا ہے اور اسے جس طرف سیلاب کی موجیں لے جانا چاہیں مجبوراً چلا جاتا ہے۔

غ د ر

غَدَرٌ - کسی چیز میں خلل واقع کر دینا اور اسے چھوڑ دینا۔ اَغْدَرَهُ وَ غَدَاةً - اس نے اسے چھوڑ دیا۔ قرآن کریم میں ہے قُلْ لَمْ يَغْدُرْ مِيثَاقُهُمْ اَحَدًا (۱۹)۔ ہم نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ اَلْغَدَرُ - بڑا عہد شکن اور بے وفا۔

اَلْغَدَرُ - تَلَابُ یا ہانی کا وہ حصہ جسے سیلاب چھوڑ جائے۔ اَلْغَدَرُ - کسی کا ساتھ چھوڑ دینا۔ وفا کی ضد ہے۔ یعنی بے وفائی۔ چنانچہ غَدَرَتِ الشَّامَةُ کے معنی ہیں بیکری دوسری بکریوں سے پیچھے رہ گئی۔

غ د ق

اَلْغَدَقُ - بہت زیادہ۔ وافر۔ فراوان۔ ***۔ ہمہ گیر بارش۔ ****۔ اَغْدَقَ الْمَطَرُ بارش بہت برسی۔ غَدَقَتِ الارضُ زمین سرسبز ہو گئی۔ هُمْ رَفِيْ غَدَقِ مِيْنِ الْعَيْشِ - وہ لوگ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں وسعتِ رزق نصیب ہے۔ ****۔

* راغب - ** تاج و راغب - *** ابن فارس - **** راغب نیز ابن فارس - ***** تاج نیز کتاب الاشتقاق -

قرآن کریم میں ہے لَا سَقَمَ لَهُمْ مَاءٌ غَدَقًا (۹۶)۔ ہم انہیں رزق فراوان عطا کرتے۔ انہیں سرسبز و شاداب زندگی بسر کراتے۔

غ د و

الْغَدُوَّةُ - صبح سویرے - دن کا ابتدائی حصہ *** - غَدَا عَلَيَّهِ غَدُوًّا - اس کے پاس صبح سویرے گیا * - وَ اِذَا غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ (۱۳۰)۔ اَلْغَدُوُّ - کل (آنے والا - فردا) مستقبل کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مَا قَدَمْتَ لِغَدِي (۱۸۸) - "اس نے مستقبل کے لئے کیا کچھ آگے بھیجا ہے"۔ غَدَاً - دن کا کھانا، جو صبح جلدی کھایا جائے - (۱۸۸)۔

غَدَا - فعل ناقص کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے جس کے معنی صَارَ کے ہوتے ہیں **۔ سورۃ اعراف میں غَدُوًّا (غَدُوَّة کی جمع) کے مقابلہ میں اَصَالَ آیا ہے (۳۰۰)۔ اور سورۃ انعام میں غَدَاوۃ کے مقابلہ میں عَشِيًّا (۵۲)۔ یعنی صبح - شام (لفظ غَدَاوۃ کا واؤ نہیں پڑھا جاتا - نہ ہی اس پر کوئی حرکت ہوتی ہے - اس کا تلفظ غَدَاۃ ہوگا)۔ سورۃ سبا میں غَدُوًّا (مصدر) کے مقابل میں رَوَّاح آیا ہے (۳۳)۔ یعنی صبح کا جانا اور شام کا آنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔

غ رب

الْغَرْبُ - لغت عرب میں اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں لیکن ان میں سے - (۱) مغرب (اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے غَرْبِيَّ کہا جاتا ہے)۔ (۲) چلے جانا - (۳) علحدہ ہو جانا - زیادہ مشہور ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے کلمات کسی خاص قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں ہیں۔ غَرْبُ الشَّمْسِ - سورج کا غائب ہو جانا - غَرْبَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ - سورج غروب ہوا۔ مَغْرِبُ الشَّمْسِ نیز مَغْرِبَانِ الشَّمْسِ وَمَغْرِبَانِہَا آفتاب غروب ہو جانے کی جگہ یا وقت *۔ (قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ شرق کے مقابلہ میں آیا ہے اس کے لئے دیکھئے عنوان ش - ر - ق)۔

غَرْبَ فُلَانٍ غَرْبَةً وَ غَرْبًا - وہ شخص وطن سے دور چلا گیا *۔ اس سے غَرْبٌ - مسافر اور اجنبی کو کہتے ہیں اور غَرْبَةً - مسافری اور اجنبیت کو۔ اسی سے اردو میں غریب الوطن بولا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں جو

”غریب“ کے معنی مفلس لٹے جاتے ہیں یہ ہمارے ہاں کا اپنا استعمال ہے۔
عربی میں اس کے معنی مسافر اور اجنبی کے ہونگے۔

غُرَابٌ * کوئے کو کہتے ہیں (۳۱)۔ اس لئے کہ وہ دور دور تک
چلا جاتا ہے **۔ اور اس کی رنگت کی وجہ سے غیر بیض * سیاہ کو کہتے ہیں *۔
قرآن کریم میں ہے غُرَابِیْمٌ سُوْدٌ (۳۵)۔ بہت زیادہ سیاہ۔ کالے بچھنگ۔
سورۃ طہ میں طُلُوْعُ الشَّمْسِ کے مقابلہ میں غُرُوْبِہَا
آیا ہے (۲۳۰)۔

غ و ز

غَرَّہُ *۔ یَغْرِہُ *۔ اسے فریب دیا اور بے بنیاد امیدیں دلائیں *۔ چنانچہ
الْمَغْرُوْرُ * اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی عورت سے یہ سمجھ کر
شادی کر لے کہ وہ آزاد ہے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ تو لونڈی تھی *۔
اسی سے غَرُوْرٌ * عر اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان دھوکا
کھا جائے یا جو انسان کو فریب میں مبتلا کر دے۔ غَارَاتِ الشَّاقَّةِ * کے
معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہو گیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا
کہ اس کا دودھ کم ہو جائیگا۔ گویا اونٹنی نے دھوکا دیا **۔ لہذا اس مادہ
میں غلط امیدوں کے ساتھ فریب دینے یا فریب کھا جانے کا مفہوم ہوتا ہے۔
سورۃ آل عمران میں ہے وَ غَرَّہُمْ (۳۳)۔ ان کی افتراء پردازی نے انہیں
دھوکا دے دیا۔

سورۃ لقمن میں غَرُوْرٌ * (۳۱) کے معنی دھوکا دینے والا ہیں (ہر وہ
چیز جس سے انسان دھوکا کھا جائے)۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں غَرُوْرًا
(۱۶۴) کے معنی ہیں دھوکا۔ یا دھوکا دیتے ہوئے۔

سورۃ انفطار میں انسان کے متعلق ہے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ
(۸۲)۔ اس کے معنی ہیں تجھے اپنے ربِّ * کَرِیْمِ کے بارے میں کس بات
نے دھوکا دے رکھا ہے۔ مغالطے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن صاحب محیط نے
لکھا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِفُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں تو فلاں پر کس طرح
جری ہو گیا۔ اس کے خلاف تجھے یہ جرات کیسے ہو گئی *۔ لہذا اس آیت
(۸۲) کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تو نے جو خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے
خلاف اپنے قوانین خود بنا لئے تو تجھے کیسی بات نے اس قدر جرات دلادی؟

الْغُرَّةُ - کپڑے کی تہ کو کہتے ہیں - الْغُرَّةُ* - ہر چیز کا بہترین حصہ - سفیدی* - (قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے)۔

غ ر ف

الْغُرْفَةُ* - ایک مرتبہ (چٹو سے) پانی نکالنا - الْغُرْفَةُ* - چٹو میں پانی لینے کا انداز یا نوعیت و حالت - الْغُرْفَةُ* - (چٹو سے) جو کچھ نکالا جائے - (اسکی جمع الْغُرَفُ ہے) - اغْتَرَفَ الْمَاءَ بِيَدِهِ (۴۹) - اس نے اپنے ہاتھوں سے پانی نکالا - نَفَقَةُ غَارِ فَتَةٍ* - تیز رفتار اونٹنی - الْغُرَفُ* - ایسی ندی جس میں بکثرت پانی ہو - الْغُرْفَةُ* - (جمع غُرَفُ* وَغُرَفَاتُ*) اوپر کا کمرہ - بالا خانہ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے مختلف معانی کسی قاعدے اور قیاس کے تحت نہیں آئے۔

سورہ فرقان میں مومنین کے متعلق ہے اُولَئِكَ يَجْزُوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (۲۵) - انہیں ان کی استقامت کے بدلہ میں الْغُرْفَةُ دیا جائیگا - اس میں فراوانی اور بلندی سب کچھ آگیا - یعنی بلندیوں - روانیاں - فراوانیاں (نیز ۲۸؛ ۳۳؛ ۳۴) - مصاف زندگی میں آگے بڑھتے جانا اور ارتقائی منازل کا حسن و خوبی سے طے کرنا - آپ غور کیجئے کہ اس ایک جامع لفظ سے قرآن کریم نے کیا کچھ بیان کر دیا ہے - سامانِ زیست کی فراوانیاں - سرفرازیوں - زندگی کی جوئے رواں کا یہاں (دنیا) سے وہاں (آخرت) تک مسلسل آگے بڑھتے، اور سطح زندگی کا بلند ہوتے چلے جانا -

غ ر ق

غَرَقَ - يَغْرُقُ* - غَرَقًا - پانی میں تہ نشین ہو جانا - بعض نے کہا ہے کہ غَرَقَ* کے اصلی معنی ناک کے راستہ اتنا پانی بھر جانا ہیں جس سے دم گھٹ جائے اور اس طرح انسان مر جائے - لیکن (جیسا کہ ابن فارس نے کہا ہے) اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں اس کے آخری حصہ اور انتہا تک پہنچ جانے کے ہیں - مثلاً الْغُرْفَةُ* اُس زمین کو کہتے ہیں جو انتہائی سیراب ہو - اَغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقَوْسِ کے معنی ہیں کمان کھینچنے والے نے کمان کو اس کی آخری حد تک کھینچا - اَغْرَأَقُ* کہتے ہیں کمان کو پوری طاقت سے آخری حمد تک کھینچ دینا - وَ النَّازِعَاتِ غَرَقًا (۶۹) - میں غَرَقًا دراصل اَغْرَأَقًا کی جگہ استعمال ہوا ہے** - یعنی آخری حد تک کھینچتے ہوئے -

أَغْرَقَهُ اُسے ڈبو دیا * - سورة یونس میں فرعون کے متعلق ہے اِذَا
 أَدْرَاكَهُ الْغَرَقُ (۱۰) ”جب اسے غرقابی نے آلیا“ - یہاں غَرَقُ
 کے معنی ہانی میں ڈوبنے کے ہیں - ڈبونے کے لئے سورة اعراف میں ہے
 فَاغْرَقْنَاهُمْ (۱۳۶) - سو ہم نے انہیں غرق کر دیا - ڈبوئے ہوئے کو
 مَغْرَقٌ کہتے - اس کی جمع مَغْرَقُونَ اور مَغْرَقِينَ ہے (۴۳۳)۔

غ ر م

الْمَغْرُمُ - گراں بار عورت - الْمَغْرَامُ - دائمی شر - سختی اور مصیبت -
 وہ شدید مصیبت جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا
 مشکل ہو جائے - الْمَغْرَمُ - تاوان - جرمانہ - بیگار کی چٹی جس کا ادا کرنا
 ضروری ہو - مَفْت کا جرمانہ - ایسی مصیبت جس سے چھٹکارا نہ ہو - الْمَغْرِمُ -
 مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لئے آتا ہے - مقروض تو اس لئے کہ وہ قرض
 کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے - اور قرض خواہ اس لئے کہ الْمَغْرِمُ ،
 اسیرِ محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے ** - قرضخواہ
 کو اسی طرح مقروض کے پیچھے پیچھے پھرتا پڑتا ہے - ابن فارس نے کہا
 ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ساتھ ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کے ہیں -
 قرآن کریم میں الْمَغَارِمِیْنِ (۹۰) آبا ہے - اس کے معنی مقروض کے
 بھی ہو سکتے ہیں اور مصیبت زدہ کے بھی ، نیز وہ جس پر تاوان پڑ گیا ہو یا
 ویسے ہی کوئی نقصان ہو گیا ہو - کیونکہ غَرِمَ فِي التَّجَارَةِ کے معنی
 ہوئے ہیں تجارت میں نقصان ہوا - اسی سورة میں ذرا آگے چل کر مَغْرَمًا
 (۹۸) - آیا ہے جس کے معنی مفت کا تاوان یا جرمانہ ہیں - سورة واقعہ میں
 هَ اِنَّا لَمَغْرَمُونَ (۹۶) - ہم پر مفت میں تاوان پڑ گیا - سورة فرقان میں
 عَذَابُ جَهَنَّمَ کے متعلق ہے اِنَّ عَذَابَآبِهَآ كَانَ غَرَامًا (۲۵) - اس کا عذاب
 ایسا ہے جو ہر وقت پیچھے لگا رہے گا - جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگا -

غ ر و

غِرَاءٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری چیز کے
 ساتھ چمٹا دیا جائے (مثلاً لٹی - سریش وغیرہ) *** - اسی سے اِغْرَاءٌ کے معنی
 ہیں کسی کو کسی کے پیچھے لگا دینا - اِغْرَى السُّكَّابُ بِمَا لَصِقَتْ -
 کتے کو شکار کے پیچھے لگا دیا * - لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ یا پیچھے

لگا دینے کے آتے ہیں۔ سورۃ سائدہ میں ہے فَمَا غَرَّيْنَا بِيُنْهَهُمُ الْعَدَاوَةُ (۱۳)۔ ہم نے ان کے درمیان عداوت کو لازم کر دیا، پیوست کر دیا۔ اَغْرَاهُ بِہم۔ اسے کسی چیز کا دلدادہ و شیفہ بنانا، اس پر ابھارنا اور اکسانا، شوق دلانا**۔ اسے کسی کے پیچھے لگا دینا، لہکا دینا*۔ یہ ان تمام معانی کے لئے آئے گا۔ سورۃ احزاب میں ہے لَنُغْزِرَنَّكَ بِہِم (۳۳)۔ ہم تجھے ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔ انہیں سزا دینے کے لئے تجھے ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

غزل

غَزَلٌ۔ رونی وغیرہ کا ثنا۔ غَزَلٌ کا تا عوا سوت***۔ قرآن کریم میں ہے نَقَضْتُمْ غَزْلَهَا (۹۶)۔ جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کے ہل کھول دئے، اسے ادھیڑ دیا۔ اَلْغَزَلُ۔ عورتوں سے دلہستگی کی باتیں کرنا۔ اَلْغَزَالُ۔ ہرنوٹا (یا عرنوٹی یعنی ہرنی کا بچہ) جبکہ وہ حرکت کرنے اور چلنے پھرنے لگے۔ اَلْغَزَالَةُ۔ آفتاب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کرنوں کو (سوت کی طرح) روئے زمین پر بکھیرتا ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ بیوں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۹۶)۔ دیکھنا! کہیں تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جو نہایت محنت و مشقت سے سوت کا تھی ہے اور اس کے بعد اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔ غور کیجئے، (وحی کے مقابلہ میں) عقل کے تجرباتی طریق کا نقشہ کس حسن و خوبی سے کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ عقل ایک نظریہ کو لیتی ہے۔ ساری دنیا میں ڈنکا بچ جاتا ہے کہ اس نظریہ میں انسانیت کی مشکلوں کا حل پا لیا گیا ہے۔ وہ اس پر تجربہ کرتی ہے۔ اس میں بے انتہا توانائی صرف ہوتی ہے۔ وقت لگتا ہے۔ کتنے انسان قربانی دیتے ہیں۔ کتنے مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس پر یہی عقل اپنے کئے کرائے کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیتی ہے اور ایک اور نظریہ پر عمل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ (Trial and Error) کے اسی تجرباتی طریق سے وہ ہزاروں برس میں جا کر کہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ انسانی ترقی کی ساری تاریخ اسی ”ادھیڑ بن“ کی صبر آزما داستان ہے۔ اس کے برعکس وحی براہ راست

حقیقت کو سامنے لے آتی ہے اور انسان کو ان تمام جانکاه مراحل سے بچالیتی ہے جن میں سے اسے عقل کے تجرباتی طریق کے ذریعے گذرنا ناگزیر تھا۔ وحی اور عقل میں یہی فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

ہر دو امیر کارواں ، ہر دو بہ منزلے رواں
عقل بہ حیلہ می برد۔ عشق برد کشاں کشاں

غ ز و

غَزَاہُ*۔ غَزَوْا*۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کا قصد کیا۔ اسے طلب کیا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ یعنی قصد اور طلب۔ غَزَوْیْ* کَدَا۔ میرا مقصد اس طرح کا ہے*۔ مَغْزَی السَّکَلَامِ۔ بات کا مقصد اور مطلب*۔ اسکے بعد اس سے مراد دشمن کے خلاف جنگ کے قصد کے ہو گئے۔ غَزَا الْعَدُوَّ۔ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلا*۔

آپ نے دیکھا کہ غَزَوْا* میں مقصد و ارادہ کے ساتھ جنگ کا مفہوم شامل ہے۔ جماعت مومنین کا قصد اور ارادہ: قوانین خداوندی کے تابع ہونا ہے اس لئے ان کے غزوات دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہو گئے، نہ کہ کمزوروں کو ستانے اور لوٹنے کی خاطر۔

سورة آل عمران میں ہے اَوْ کَانُوا غَزَّی (۳۵)۔ یا وہ جنگ میں شامل ہوں۔ جنگ کر رہے ہوں۔

غ س ق

الْغَسَقُ*۔ ابتدائے شب کی تاریکی*۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی سخت تاریکی کے ہیں**۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی تاریکی بتائے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے اَلْیُ غَسَقَ اللَّیْلُ (۱۶)۔ یعنی (شروع) رات کی تاریکی تک۔ الْغَسَاقُ*۔ چاند جبکہ وہ گہن لگ کر سیاہ ہو جائے۔ تاریک رات*۔ قرآن کریم میں ہے مِیْنُ شَبْرِ غَمَاقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۳)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں۔ جیسے طَارِقُ* رات کے وقت آنے والے کو کہتے ہیں**۔ نِزْ غَمَاقٍ* کے معنی ٹھنڈے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ رات

کو غَسَاقٌ * اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ دن سے نسبتاً ٹھنڈی ہوتی ہے *۔
 غَسَاقٌ * نہایت ٹھنڈی چیز۔ جس کی ٹھنڈ جلا دے۔ چنانچہ سورہ النَّبَا میں
 جہنم کے متعلق ہے کہ اس میں حَمِيمًا وَّغَسَاقًا (۳۸/۳۸) ہوگا۔ اس میں
 غَسَاقٌ کے معنی شدید ٹھنڈے کے ہیں۔ جسکی ٹھنڈ سن کر کے رکھدے۔
 یعنی جہنم میں شدت کی گرمی اور شدت کی ٹھنڈ ہے۔ یہ دونوں نشوونما
 کے لئے ہلاکت کا موجب ہوتی ہیں۔ کھیتی کو جس طرح گرمی جھلسا دیتی ہے
 اسی طرح اسے ہالا بھی مار دیتا ہے۔ نشوونما کے لئے ضروری سامان،
 اور اس کے استعمال میں تناسب، دونوں لازمی ہوتے ہیں۔ پانی سے کھیتی
 پروان چڑھتی ہے لیکن یہی پانی جب زیادہ دیدیا جائے تو وہ گل سڑ
 جاتی ہے۔ ہوا سے درخت لہلہاتے ہیں لیکن جب یہی ہوا جھکڑ بن جائے
 تو وہ جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ پودوں کی نشوونما کے لئے حرارت ناگزیر ہے
 لیکن یہی حرارت جب تیز ہو جائے تو انہیں جھلسا دیتی ہے۔ لہذا جہنم،
 سامان نشوونما سے محرومی ہی کا نام نہیں۔ سامان کی فراوانی کے ساتھ اگر
 صحیح صحیح توازن و تناسب نہ ہو تو اس کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے، بلکہ
 اس سے بھی بدتر۔ ہم سامان سے محروم ہیں، مغرب والے اعتدال سے محروم۔
 یہاں فالج ہے، وہاں سرسام۔ جہنم بہر حال دونوں جگہ ہے۔ سامان زیست
 کی فراوانی اور اس کی تقسیم اور استعمال میں صحیح صحیح تناسب، یہ دونوں
 خدا کے نظام ربوبیت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ دنیا جنت بنتی ہے۔
 جنتِ اُخروی میں بھی یہی کیفیت ہوگی۔

غ س ل

غَسَلَ - دھونا، پانی بہا کر کسی چیز کو میل کچیل سے پاک کرنا *۔
 فَاغْمِلُوا وَّجُودُكُمْ (۹) اپنے چہروں کو دھوؤ۔ اغْتَسَلَ - غسل
 کرنا *۔ (۳۳/۳۳)۔ مَغْتَسَلَ *۔ وہ جگہ جہاں نہایا جائے یا وہ پانی جس سے
 نہایا جائے **۔ (۳۸/۳۸)۔

سورہ الحاقہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے وَلَا طَعَامٌ * إِلَّا مِینٌ *
 غِصْلِینَ (۳۱/۳۱)۔ اس کے عام معنی کٹے جاتے ہیں، دھوون یا غسالہ۔ یا
 وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ہو۔ لیکن قماموس میں ہے کہ اس کے معنی
 ہیں انتہائی گرم ***۔ (اس کے مفہوم کے لئے غ - س - ق کا عنوان
 بھی دیکھئے)

غ ش ی (و)

غَشِيَّی کے معنی کسی چیز کو (پوری طرح سے) ڈھانپ لینا یا اس پر (بالکلیہ) چھا جانا ہیں۔ غِشَاوَةٌ* اس پردے کو کہتے ہیں جو کسی کو ڈھانپ دے اور اس پر چھا جائے (۲)۔ غَشَاوَةٌ* اس جیہلی کو کہتے ہیں جو دل پر بطور غلاف چڑھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جو تلواریں کے نیام پر مڑھ دیا جاتا ہے۔ غَشِيَّی عَدِيْمٌ۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی بیہوش ہو جائے کیونکہ اسوقت اس کے ہوش و حواس بالکل مستور ہو جاتے ہیں۔ غَشِيَّی قُلَانًا کے معنی ہیں وہ شخص فلاں آدمی کے پاس آیا۔ اور غَشِيَّیہَا اور تَغَشَّیہَا کے معنی عورت سے مجامعت کرنے کے آتے ہیں کیونکہ اس حالت میں مرد اسے ڈھانپ لیتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے تَغَشَّیہَا (۱۸۹)۔ سورۃ نوح میں ہے وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابًا بِهٖمْ* (۲۹) انہوں نے اپنے دلوں کو ڈھانپ لیا۔ انہیں غلافوں میں بند کر لیا۔

قرآن کریم میں غِشَاوَةٌ* (۲) کے معنی پردہ ہیں۔ اور غَشِيَّی کے معنی ڈھانپ لینا (۲۸)۔ سورۃ اعراف میں مِیْمَاتٌ* (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے (۶۶) جس کے معنی اوڑھنے کے ہونگے۔ اَلْغَشَاوَةُ* (۸۸) ہر طرف سے چھا جانے والی مصیبت۔ یعنی اعمال کے ان نتائج کا ظہور جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں [جسے وَاللّٰهُ مُحِیْطٌ بِالْكَافِرِینَ کہا گیا ہے۔ (۶۹) یعنی خدا کا قوانون مکافات کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یا اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْمُكْفِرِیْنَ* (۶۷)۔ جہنم کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔]

غ ص ب

غَصَبَتْہُ۔ یَغْصِبُہُ۔ غَصَبًا۔ کسی سے کوئی چیز ظلماً و قہراً چھین لینا۔ اصل میں غَصَبَ الْمَجِیْد کے معنی ہوتے ہیں کھال پر سے بالوں کو یا اون کو نوچ نوچ کر اتارنا**۔ (اسی لئے اس میں نوچنے اور کھسوٹنے کا پہلو ہوتا ہے)۔ غَصَبَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ۔ مرد نے اس عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا***۔

سورۃ کہف میں ہے۔ یَا خُذْ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا (۱۹)۔ وہ (بادشاہ) ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام

حکومت میں ہوتا ہی یہ ہے کہ طاقتور، کمزوروں کے وسائل رزق کو زبردستی چھین لیتے ہیں۔ خدا کا نظام اس لئے آتا ہے کہ کمزوروں پر کسی قسم کا ظلم اور استبداد نہ ہوئے پائے اور غصب و سلب (Exploitation) کا دور دورہ ختم ہو جائے۔

غ ص ص

الْغُصَّةُ* - کھانے کی چیز کا حلق میں پھنس کر رہ جانا۔ (پیسے کی چیز کے اٹک جانے کو شَرَقُ* کہتے ہیں اور ہڈی وغیرہ کے اٹک جانے کو شَجَا۔ لیکن بیشتر یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا*)۔ غصہ کی وجہ سے بھی گلے کے بند ہو جانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے**۔ اَغْصَتْ فُلَانٌ عَلَيْنَا اِلَّا رُضًا۔ فلاں آدمی نے ہم پر زمین کو تنگ کر دیا۔ فَغْصَتْ بِنَا۔ چنانچہ زمین ہم پر تنگ ہو گئی*۔ اَلْغُصَّةُ*۔ غم اور فکر کو بھی کہتے ہیں**۔

قرآن حکیم میں جہنم کے متعلق ہے وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۱۳۳)۔ حلق میں اٹک جانے والا کھانا۔ اس دنیا میں بے عزتی کی روٹی جسے انسان نہ نگل سکے نہ اُکل سکے۔ ناجائز کمائی جس سے شرف انسانیت کا گلا گھٹ جائے، اور اخروی زندگی میں انسان آگے بڑھنے کے قابل نہ رہے۔ غور کیجئے! وہی رزق جو انسانی نشوونما کا موجب ہوتا ہے، جب گلے میں اٹک جائے تو انسان کی مسوت کا باعث بن جاتا ہے۔ انسانی ذات کیلئے رزق حلال اور اکل حرام میں یہی فرق ہے۔

غ ض ب

غَضَبٌ* کے معنی شیر ہیں۔ نیز سرخ یا سر گہرے سرخ رنگ کی چیز*۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی شدت و قوت بتائے ہیں۔ غَضَبٌ* رِضَا کی ضد ہے۔ بعض نے اس کی تعریف ”انتقاماً دل میں خون کا جوش مارنا“ کی ہے۔ اللہ کے غضب سے مراد نافرمانی پر اس کی گرفت اور سزا ہے*۔ كُنَايَةً غَضَبَاتِ الْفَرَسِ عَلَى اللِّجَامِ کے معنی ہیں گھوڑے نے غصے میں آکر راہنی لگام جبائی۔ اسی طرح آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی غَضَبٌ* کا اطلاق ہوتا ہے۔ آنکھ کے بالائی پپوے پر نکلنے والا پیدائشی دانہ غَضْبَةٌ* کہلاتا ہے۔ نیز ایک جلدی بیماری جس میں سارا بدن سرخ

ہو جاتا ہے غیضاب* کہلاتی ہے۔ مَغْضُوب* اسے کہتے ہیں جسے چیچک نکل آئے یا مذکورہ بالا بیماری ہو جائے۔ غَضَاب* اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کھال موٹی اور سخت ہو۔ غَضًا بی* اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تند مزاج اور تلخ کام ہو اور مخالفین کے ساتھ سخت*۔ اَلْغَضَبَةُ* سخت چٹان کو کہتے ہیں اور اَلْغَضُوب* بڑے سانپ کو (ابن فارس)۔

قرآن کریم نے غَضَب* کو نِعْمَت* کے مقابل میں لا کر (۱۰۱) واضح کر دیا ہے کہ خدا کے غضب (یعنی اس کے قانون سے سرکشی اور انکار) کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یعنی نِعْمَت کے ہر پہلو کی ضد۔ سورۃ بقرہ میں ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے بعد غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۰۱) کہہ کر بتا دیا کہ ”اللہ کے غضب“ کا نتیجہ ذلت اور محتاجی ہوتا ہے۔ دوسری جگہ اسے عَذَابٌ مُّہِیْنٌ* (۱۰۲)۔ یعنی رسوا کن عذاب، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ اعراف میں قوم عاد پر ”اللہ کے غضب“ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ وَ قَطَعْنَا دَآئِرَۃَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِآیٰتِنَا (۱۰۲-۱۰۱) یعنی ہم نے اس قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی۔

اس سے واضح ہے کہ ”خدا کے غضب“ کا نتیجہ انفرادی اور اجتماعی تباہی اور بربادی ہے۔ اس لئے کہ اس سے خدا کے قانونِ مکافات کی بے پناہ قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جب خدا کی طرف غَضَب* کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے۔ خدا، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے۔ اس لئے ”خدا کے غضب“ سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی کے فطری نتائج ہیں، جس طرح ”خدا کی خوشنودی“ کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں۔

سورۃ اعراف میں غَضِبْنَاۤ اَیَاۤہُ (۱۰۵)۔ یعنی غصہ میں بھرا ہوا۔ ہَرَجُوش۔ اور سورۃ انبیاء میں مَغْضٰیْبًاۤ اَیَاۤہُ (۸۷)۔ یعنی ناراض ہو کر۔ لیکن یہ دونوں لفظ خدا کے متعلق نہیں۔ پہلا حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اور دوسرا حضرت یونسؑ کے متعلق۔

غ ض غ

الغَضُّ کے معنی ہیں کمی کرنا ، خواہ آنکھوں سے دیکھنے میں ہو ، خواہ آواز میں یا کسی برتن کی چیز میں * - غَضَّ مِیْنَهُ یَغْضُّ - اس نے اس میں سے کم کر دیا - غَضَّ الْغَضْنَ - اس نے شاخ کو توڑ دیا - لیکن یہ اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ اچھی طرح سے نہ ٹوٹے - لہذا اس کے بنیادی معنوں میں جھکانا اور کم کرنا ہیں - اَلْغَضِیُّضُ سِنِ الطَّیْرِ فِی - وہ نگاہ جس میں ہلکیں جھکی رہیں - اَلْغَضُّ - ایسی ترو تازہ چیز جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو - اَلْغَضِیُّضُ الطَّیْرِ فِی - آنکھوں کا بند ہو جانا ** - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنا اور کم کرنا لکھے ہیں ، نیز تازگی و طراوت -

قرآن کریم میں یہ مادہ اَبْصَارُ کے لئے (۲۴) میں آیا ہے جہاں اس کے معنی نگاہوں کو نیچا رکھنے ، یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں *** - اور صَوْتُ کے لئے (۳۹) میں - یعنی آواز کا ہست رکھنا - دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے - جھکانا ، کم کرنا ، سمیٹ کر رکھنا ، بے باک نہ ہونے دینا ، نگاہوں کو بھی اور آواز کو بھی - یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں هورتوں اور مردوں کا انداز - نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بیباک اور آوارہ ہونگی ، نہ بات -ت کرنے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی -

غ ط ش

غَطَطَشَ - بَغَطِیْشَ - تاریک ہوا - اَغْطَشَ بَغَطِیْشَ - تاریک کیا - لَمِیْلَ غَطِیْشَ - اندھیری رات - فَلَآةٌ غَطِیْشَاءُ - ایسا صحرا جس میں راستہ نہ ملتا ہو - اَلْغَطَطَشُ فِی الْعَیْنِ - آنکھ کا چندھیا پن - ایسے چندھ آدمی کو اَغْطَشَ کہتے ہیں **** -

قرآن کریم میں ہے اَغْطَشَ لَیْلَہَا (۶۸) - اس کی رات کو اس نے تاریک کر دیا -

غ ط و (ی)

اَلْغِیْطَاءُ - وہ چیز جس کے ذریعے دوسری چیز کو ڈھانپ دیا جائے - ڈھکنا - راغب نے کہا ہے کہ غِیْطَاءُ - طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کو

*راغب - **تاج - ***محیط - ****تاج و راغب -

کہتے ہیں جو بطور ڈھکنے کے کام میں لائی جائے اور غیشتاء*، لباس کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈال دیا جائے۔ مصباح میں ہے کہ غیطاء* پردے کو کہتے ہیں۔ الثَّغِيْطَايَةُ*۔ وہ اندرونی لباس (مثلاً بنیان وغیرہ) جس سے عورتیں اپنے جسم کو ڈھانپ کر ان کے اوپر دوسرے کپڑے پہنتی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ جو چیز بلند ہو اور کسی دوسری چیز سے لمبائی میں اوپر آجائے تو اس کے لئے غَطَا عَلَيَّہ کہتے ہیں۔ اسی سے غَطَطَتِ الشَّجَرَةُ* کے معنی ہیں درخت کی شاخیں لمبی ہو گئیں اور زمین پر پھیل گئیں۔ غَطَى الْقَيْلُ*۔ رات تاریک ہو گئی*۔ قرآن کریم میں لفظ غیطاء، پردے (جہالت) کے لئے آیا ہے۔ کَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاةٍ عَنْ ذِكْرِي* (۱۸/۱)۔ ان کی آنکھیں میرے قوانین کی طرف سے پردے (تاریکی) میں تھیں۔ یعنی اس کی طرف سے ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ عَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ* (۲/۲)۔ ”ان کی آنکھوں پر پردہ ہے“

غ ف ر

غَفَّر*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینا ہے جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے**۔ لہذا اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ غَفَّر*۔ چھپانا، پردہ ڈالنا۔ غَفَّرَ الثَّمَنَاعَ فِي الثَّوْرَعَاءِ*۔ سامان کو کسی برتن میں ڈال کر چھپا دینا*** (اور اس طرح اسکی حفاظت کر دینا)۔ الْمِغْفَرُ وَالْغِفَارَةُ*۔ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی جو خود کے نیچے پہنی جاتی ہے اور جو گردن اور مونڈھوں کو ڈھانپ لیتی ہے تاکہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہے۔ الْغِفَارَةُ*۔ ایک ہٹی سی ہوتی ہے جسے عورتیں اسلئے سر پر باندھ لیتی ہیں کہ ان کی اوڑھنی تیل سے محفوظ رہے۔ اس کے اوپر الْغِيَمَارُ* (چادر) اوڑھتی ہیں۔ الْجَمَّاعُ الْغَفِيرُ*۔ وہ خنود جو سارے سر کو اپنے اندر لے لے اور اس طرح اسکی حفاظت کر دے***۔ الْغَفَرُ*۔ وَالْغَفْرَانُ*۔ ایک ہی معنی میں آتے ہیں (ابن فارس)

اس سے مَغْفِرَةٌ* کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی حفاظت۔ جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب

*تاج و راغب و محیط۔ **محیط۔ ***تاج۔

ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہو جائے، اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانون خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دُہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک تو اسکی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے اور دوسرے اسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان نتائج کے استحکام کے لئے بھی حفاظتی پہلو کا ساتھ ساتھ رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے مرض کے علاج کے لئے پہلے حفاظتی تدابیر (Preventives) اور اس کے بعد اصلاحی تدابیر (Curatives) اختیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تندرست انسان کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحت کو خراب کرنے والے مضر عناصر سے محفوظ رہے اور اسے ایسی غذا ملتی رہے جس سے اسکی نشوونما ہونی چلی جائے۔ لہذا۔

(۱) اگر غلط روش پر چلنے والی قوم کسی مقام پر پہنچ کر اپنے اصلاح حال کی فکر کر کے قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے (جسے تَوْبَةُ کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان ت۔ و۔ ب) تو اس سے اس کے اندر ایسی توانائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جس سے وہ اپنی سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ اسکی مَغْفِرَةٌ ہے۔ اور

(۲) قانون خداوندی کے مطابق چلنے والی قوم ان تخریبی قوتوں کی مذموم کوششوں سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی و بربادی کی تدابیر کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کی مَغْفِرَةٌ ہے۔ اور

(۳) قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی ذات کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے رہنا جس سے انسان تخریبی عناصر کے مضر اثرات سے محفوظ رہے، اور اجتماعی طور پر ملت اور اس کے نظام کے استحکام کے لئے سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہنا، اِسْتِغْفَارُ (مَغْفِرَت طلب کرنا) ہے۔ چنانچہ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلَا اِسْتِغْفَارُ کے معنی ہیں قبول اور عمل سے کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی خواہش کرنا۔ حفاظت چاہنا۔ اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں سے تجاوز کر کے اس سزا سے اسکو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو*۔ اور (تاج العروس میں ہے کہ) غَفَرَ اَلَا مَرَّ يَغْفِرُ تَبَهُ کے معنی ہیں اس نے اس معاملہ کو اسطرح درست کر دیا جسطرح اسے درست کرنا چاہئے تھا**۔

* محیط۔ ** تاج۔

ہمارے ہاں مَغْفِرَة کے معنی لئے جاتے ہیں ”خدا کا بندے کے گناہوں کو بخش دینا“ (اللہ مغفرت کرے۔ ”یا“ خدا بخشے۔“ ہم روز بولتے ہیں)۔ ”بخشش“ کا تصور قرآن کریم کے بیش کردہ قانون مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غلط عمل مضر نتائج پیدا کرتے ہیں اور صحیح عمل خوشگوار نتائج۔ غلط اعمال کے مضر نتائج کا ”بخش دینا“ بے معنی سی بات ہے۔ ”بخشش“ کا یہ تصور ملوکیت کی فضا کا پیدا کردہ ہے جس میں بادشاہ خوش ہو کر مجرموں کے گناہ بخش دیا کرتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے ”جنت“ انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ کسی سے ”بخشش“ کے طور پر نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہہ حسنِ عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ہے مَغْفِرَة کا قرآنی مفہوم۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس پر ہر بیماری فوراً حملہ کر دیتی ہے۔ اس میں قوتِ مدافعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جراثیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ان جراثیم کا مقابلہ کر سکے۔ اس قسم کی طاقت کا اپنے اندر پیدا کر لینا اِسْتِغْفَار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز تسبیح کے دانوں پر اِسْتِغْفِرُ اللہ - اَسْتَغْفِرُ اللہ کے الفاظ دہرانے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے جس سے انسانی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہو جائے۔ خدا غَفُور ہے۔ یعنی اس کے قانون پر عمل پیرا ہونے سے اس قسم کی قوتِ مدافعت اور سامانِ حفاظت مل جاتا ہے۔ اور مومنین کا شیوہ اِسْتِغْفَار ہے۔ یعنی اس قسم کی قوت اور حفاظت کا طلب کرتے رہنا۔ اس کے لئے جدوجہد کرتے رہنا۔ لہذا قرآن کریم میں مَغْفِرَة (۲۲۱) اور غَفُورَان (۲۸۵) کے معنی ہونگے حفاظت اور پناہ۔ غَافِر (۱۵۵) غَفُور (۱۵۴) اور غَفَّار (۲۸۴) کے معنی ہونگے حفاظت دینے والا۔ محفوظ رکھنے والا، اس فرق کے ساتھ کہ غَافِر اسم فاعل ہے اور غَفُور وَغَفَّار اسم مبالغہ۔ اِسْتِغْفَار (۱۱۴) کے معنی ہونگے حفاظت طلب کرنا۔

جیسا کہ (ع۔ ف۔ و) کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، غَفُور کے معنی ہیں سزا کے بعد اس کے اثرات کو مٹا دینا۔ لیکن مَغْفِرَة کے معنی ہیں شروع ہی سے ان اثرات سے محفوظ رکھنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَغْفِرَة - عَذَاب کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵۵، ۱۴۸)۔ سورہ بقرہ میں مَغْفِرَة بمقابلہ فُتْر آیا ہے (۲۶۸)۔ یعنی احتیاج و افلاس سے محفوظ رکھنا

غ ف ل

غَفَلْتَهُ تَغْفِيلاً - اس کو ڈھانپ دیا - چھپا دیا - اس پر پردہ ڈال دیا * - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - أَغْفَلْتَهُ - اس کو غافل کیا - قرآن کریم میں ہے لَقَدْ كُنْتُ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَتَكَشَّفْتُنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (۲۲) - تم اس سے ”غافل“ تھے سو ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا - غَفْلَةٌ * - کسی چیز کو چھوڑ دینا اور اس کو بھول جانا - راغب نے کہا ہے کہ غفلت اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت - احتیاط و تحفظ کی بناء پر ہوتا ہے * - دراصل اس کا مطلب کسی چیز کے متعلق (یا کسی کی طرف سے) لاپرواہ (Un-mindful) ہو جانا ہے - چنانچہ اَلْغَفُولُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو بچہ چاہے اس کا دودھ پی جائے اور جو آدمی چاہے اس کا دودھ دو کر لے جائے اور وہ اس کا کچھ خیال نہ کرے * - اَلْغَفُولُ وہ شخص جس سے نہ بھلائی کی امید ہو نہ شر کا اندیشہ - وہ تیز جس پر کوئی نشان نہ ہو (جوئے میں ایسے تیر کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا - یعنی نہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا تھا نہ نقصان) - وہ راستہ جس پر نشان راہ نہ ہوں - وہ زمین جس پر کوئی آبادی نہ ہو - وہ مویشی جس پر شناخت کا نشان نہ ہو - وہ شخص جس کا حسب نہ ہو - وہ شعر جس کا کہنے والا معلوم نہ ہو * - ان معانی سے اس لفظ کا اصل مفہوم سامنے آجاتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی بھول کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے ہیں ، اور کبھی کبھی یہ عمداً چھوڑ دینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے -

لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ بے خبری اور ناواقفیت کے لئے بھی آیا ہے جس میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں - مثلاً سورہ یوسف میں ہے کہ ہم تجھے وحی کے ذریعے داستان یوسف بتاتے ہیں وَلَٰنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَافِلِينَ (۱۲) - اگرچہ تو اس سے پہلے اس سے باخبر نہ تھا - اسی طرح قرآن کریم میں اکثر مقامات پر ہے - وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲) - اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں - سورہ نور میں اَلْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ (۲۴) ان باعصمت خواتین کے متعلق آیا ہے جو بد کرداری کی باتوں سے واقف تک نہ ہوں - غَافِلٌ * - غَفْلٌ سے اسم فاعل ہے -

سورۃ انبیاء میں کفار کے متعلق ہے کہ وہ کہیں گے - قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا - (۲۱) - ہم اس سے لاپرواہ رہے - یعنی جس بات کو

ہمیں ہر وقت دعیان میں رکھنا چاہئے تھا اسے ہم نے دھیان میں نہ رکھا۔
لغت میں غَفْلَةً کے معنی یہ بھی ہیں۔

غ ل ب

غَلَبَہ کے اصل معنی ہونے ہیں کسی کی گردن کے موئے حصے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لینا *۔ چنانچہ غَلَبَہ - يَغْلِبُ کے معنی ہیں وہ - موٹی، چھوٹی، اور ایک طرف کو جھکی ہوئی گردن والا - نَسَاقَہ غَلَبَاءُ - موٹی گردن والی اونٹنی کو کہتے ہیں **۔ اس سے غَلَبَہ کے معنی قہرو بالا دستی، کسی پر مستولی اور قابض ہو جانے یا کسی کو شکست دیدینے کے آئے ہیں۔ یہ غَلَبَہ کا مصدر ہے۔ سورہ کہف میں ہے۔
الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ (۱۸)۔ وہ لوگ جنہوں نے انکے معاملہ پر غلبہ پا لیا۔ سورہ روم میں ہے مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ (۳۰)۔ انہیں مغلوب ہوجانے کے بعد۔ يَغْلِبُوا (۲۰)۔ جس پر دوسرا غالب آجائے۔

الْغَلَبَاءُ - (اسکی جمع غَلَبٌ ہے) گھنا باغیچہ **۔ وَحَدَائِقِ غَلَبًا (۸) گھنے باغات۔

غ ل ظ

الْغِلَظَةُ (غین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ اگرچہ کسرہ زیادہ مشہور ہے) موٹاپا - سختی - شدت۔ اَغْلَظَ الثَّوْبُ - اس نے کپڑے کو موٹا پایا *۔ غَلِظَ کے معنی سخت، موٹے کے علاوہ گاڑھا بھی ہیں۔ یعنی ایسی چیز جس کے منتشر اجزاء سمٹ کر کم جگہ میں جمع ہو جائیں اور اس طرح ان کی قوت بڑھ جائے۔ اَلْغِلَظُ - سخت اور ناہموار زمین کو کہتے ہیں (یعنی جو پتھریلی تو نہ ہو لیکن اس کے باوجود سخت ہو)۔ یہاں سے اس کے معنی سختی اور درستی کے ہو گئے *۔ قرآن کریم میں ہے کہ جماعت مومنین کو ایسا طاقتور ہونا چاہئے کہ مخالفین ان میں سختی محسوس کریں۔ وَلَيَجِدُوا فِيكُمْ غِلَظَةً (۳۳)۔ لیکن ان کے مزاج میں سختی اور ہد خلقی نہیں ہونی چاہئے۔ انہیں غَلِظَ الثَّوْبُ نہیں ہونا چاہئے (۱۵۸)۔ مخالفین کے مقابلہ میں بہت مضبوط، محکم اور سخت ہونا چاہئے اور ان کی شدت سے روک تھام کرنی چاہئے۔ وَاعْلَظْ عَلَيْهِمْ (۳۳)۔ اسی طرح جیسے خدا کے قوانین مکافات اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں غِلَظٌ شِدَادٌ واقع ہوئے ہیں (۲۱)۔

اسْتَغْلَطَ - کسی چیز کا موٹا اور سخت اور مضبوط ہو جانا (جو بالعموم کسی چیز کے کمال پر پہنچنے سے ہوتا ہے) دراصل یہ فعل گیہوں وغیرہ کے خوشوں میں دانوں کے سوتے ہو کر سخت ہو جانے پر بولا جاتا ہے *۔
 قرآن کریم میں اسلام کے شجر طیب کے متعلق ہے - فَاسْتَغْلَطَ (۲۹) -
 وہ مضبوط، سخت اور موٹا ہو گیا -

غ ل ف

الْغِلَافُ * - محافظ - وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر چھائی ہوئی ہو۔
 مثلاً انڈے کا چھلکا - کلی کے اوپر کا سبز خول - (جمع) غُلْفٌ * و غُلْفٌ *۔
 سَيْفٌ * اَغْلَفَ * - تلوار جو غلاف میں ہو - اَلْغُلْفُ * - کثرت سے سرسبزی *۔
 قرآن کریم نے یہودیوں کا قول نقل کیا ہے - قَاتِلُوا قَتَلُوا بَنَّا غُلْفٌ * (۸۸) - یہ اَغْلَفَ کی جمع ہے - یعنی غلافوں میں بند ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اس لئے ہم پر قرآن کریم کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا - اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے بھرے ہوئے برتن (اور مخزن) ہیں اس لئے ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں - ہم تمہارے علوم سے بے نیاز ہیں ** - مطلب دونوں کا ایک ہی ہے کہ ہم اس نئی دعوت کو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے - ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں - یعنی بجائے اس کے کہ کسی دھوت یا نظریہ کے رد و قبول کا فیصلہ فکر و بصیرت اور غور و تدبیر کے بعد کیا جائے اس کے متعلق بلا دیکھے بھالے کہہ دینا کہ ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں - ظاہر ہے کہ ایسا طرز عمل علم و بصیرت کی بارگاہ میں کبھی قابل ستائش قرار نہیں پاسکتا - اور قرآن کریم ہے ہی سرتاپا علم و بصیرت -

غ ل ق

اَغْلَقَ الْبَابَ يَغْلِقُهُ * - اس نے دروازہ بند کیا - بَابٌ غُلْقٌ * - بند دروازہ *** - سورہ یوسف میں عزیز کی بیوی کے متعلق ہے - وَغَلَقَتِ الْبُؤَابَ (۲۳) - راغب نے کہا ہے کہ غَلَقَ اسوقت بولا جائیگا جب بہت سے دروازوں کو بند کیا گیا ہو - یا ایک ہی دروازہ کو بار بار بند کیا ہو - یا دروازہ کو بڑی مضبوطی سے بند کر دیا ہو *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں پھنس جانا یا اٹک جانا ہیں -

غ ل ل

غُلَّالٌ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا درمیانی خلاؤں میں چلے جانا۔ چنانچہ غُلَّالٌ اس ہانی کو کہتے ہیں جس کے درمیان سے بہہ رہا ہو۔ اَلْغُلَّالُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس طرح قیدی کے اعضاء اس کے بیچ میں آجاتے ہیں۔ اس کی جمع اَغْلَالٌ آتی ہے *۔ (۱۵۷)۔ غُلٌّ۔ اسے غُلٌّ کے ذریعہ قید کر دیا *۔ مَغْلُوطٌ۔ بندھا ہوا، مقید (۱۵۸)۔ اَلْغِلُّ۔ دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں **۔ (۱۵۹)۔ نیز دھوکا اور فریب (جو چھپا کر کیا جاتا ہے)۔ یعنی اس میں چھپانے کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں لَا يَدْهَبُ كِتَابٌ مِّنَّا غُلَّالٌ۔ ہماری بات لوگوں سے مخفی نہیں رہنی چاہئے **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا درمیان سے گزرنا اور کسی چیز کا ہم جانا ہیں۔ غُلٌّ بَغْلٌ کے معنی ہیں کینہ رکھنا اور غُلٌّ بَغْلٌ کے معنی ہیں خیانت کرنا *۔

سورہ آل عمران میں ہے وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (۱۶۰)۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کہئے جاتے ہیں کہ کسی نبی کے شاہان شان نہیں کہ وہ (مال غنیمت میں) خیانت کرے۔ لیکن صاحب الضرائع بعض مفسرین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس سے مراد غنیمت میں خیانت کرنا نہیں بلکہ وحی میں سے کچھ مخفی رکھنا ہیں۔ یہاں مفسرین نے غُلُّوا لَ کے معنی کِتْمَانٌ (چھپانے) کے کہئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام تبلیغ رسالت ہے۔ جو وحی اس کی طرف بھیجی جاتی ہے وہ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اب اگر اس میں کوئی بات ایسی ہے جو کسی کے معتقدات یا مفاد کے خلاف جاتی ہے تو اس میں رسول کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یہ کر ہی نہیں سکتا کہ وحی کا کچھ حصہ چھپا کر رکھ لے اور کچھ حصہ ظاہر کر دے۔ وہ وحی کو بہ تمام و کمال ظاہر کر دے گا۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا (۱۶۱)۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے يَضَعُ عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ وَاَلَا غُلَّالٌ الشَّيْءُ كَأَنْتَ عَلَيْهِمْ (۱۶۲)۔ وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ہوئی چلی آرہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ یعنی وہ نوع انسان کو، جسم اور قلب و دماغ

کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر کے انہیں فقط قوانین خداوندی کی اطاعت پر لے آئیگا اور اس طرح انہیں صحیح آزادی عطا کر دیگا۔ کسقدر بلند تھا مقصد بعثتِ نبویؐ کا اور کسقدر کامیاب اور حسین تھا وہ طریق جس سے حضورؐ نے اس بلند مقصد کو پورا کیا۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہوں نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو (جنہیں قرآنی نظام نے اس حسن و خوبی سے توڑ کر رکھ دیا تھا) مڑگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور ان اغلال و سلاسل کو انتہائی تعظیم کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اُس ابتداء کی یہ انتہاء کسقدر عبرت ناک اور تاسف انگیز ہے!

غل م

الْغُلَامَةُ - جنسی خواہش کی شدت کو کہتے ہیں۔ قَدْ غُلِمَ الشَّرَجُ - اسوقت کہتے ہیں جب آدمی جنسی خواہش سے مغلوب ہو جائے۔ اَغْلَمَ الْبَحْرُ کے معنی ہیں دریا ہرجوش ہو گیا اور موجیں مارنے لگا۔ اِغْتَلَمَ الشَّرَابُ - شراب تند و تیز ہو گئی۔ اس اعتبار سے الْغُلَامُ اس لڑکے کو کہتے ہیں جسکی مسیں بھیگ چکی ہوں۔ لیکن صاحب تاج العروس کے نزدیک پیدائش سے لیکر جوان ہونے تک بچے کو غُلَامٌ ہی کہتے ہیں۔ نیز کبھی (بڑے بوڑھے اپنے بیٹوں کو خواہ وہ ادھیڑ عمر کے ہی کیوں نہ ہوں غُلَامٌ کہہ دیتے ہیں۔ صاحب فقہ اللغة نے بھی کہا ہے کہ اگرچہ جنین سے لیکر بالغ ہونے تک بچے کے لئے مختلف الفاظ آتے ہیں لیکن یہ ہیئت مجموعی اسے غُلَامٌ ہی کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ محض بیٹے کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ مثلاً (۳۹)۔ اور نوجوان کے معنوں میں بھی (۱۸)۔ غُلَامَانِ کا لفظ خدمت گار لڑکوں کے لئے آیا ہے۔ (۵۲)۔ یعنی وَلِدَانِ مِثْلَتَهُ وَنَ (۵۶)۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے مراد اہل جنت کے بیٹے ہی ہوں۔ کیونکہ جنت میں آباء و ازواج و ذرّیّات بھی تو ساتھ ہونگے بشرطیکہ وہ بھی صالح ہوں (۳۳)۔ (جنت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ن۔)

غل و (ی)

غُلُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھ جانے اور تجاوز کرنے کے ہیں۔ اگر یہ حد سے تجاوز اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غُلَاءٌ کہتے ہیں۔ اور

* تاج - ** محیط - *** راغب -

قدر و منزلت میں ہو تو غُلُوْا۔ اور تیر میں ہو (یعنی وہ اپنی مقررہ حد سے آگے نکل جائے) تو غُلُوْا۔ اَلْمِغْلٰیٰ۔ اس تیر کو کہتے ہیں جسے کمان کے ذریعہ ہاتھ کو خوب تھان کر انتہائی حد سے آگے جانے کے لئے پھینکا جائے۔ اَلْغُلُوَّةُ۔ اُس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک تیر پھینکا جا سکے۔ اَلْغُلَّةِیَّانِ۔ ہانڈی کے ابال اور جوش کھانے کو کہتے ہیں۔*** سورہ دخان میں ہے یَغْمِلِیْ فِی السُّبْطُوْنِ کَعَمَلِی الثَّحْمِیْمِ (۴۰:۳۶) ”وہ پیٹ میں کھولیکا ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند“ (واضح رہے کہ یہ یائی ہے۔ واوی نہیں۔ بعض علمائے لغت کی طرح ہم نے بھی اسے واوی کے تحت ہی لکھ دیا ہے۔)

اِغْتٰلٰی البَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا اور اونچا ہو کر چلا حتیٰ کہ وہ رفتار کے حسن کی حد سے گزر گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا کہ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِرْیٰنِکُمْ (۱:۱)۔ تو اس کا کیا مطلب ہے؟ دین سکھاتا یہ ہے کہ انسان اپنی مختلف قوتوں میں کس طرح صحیح توازن و تناسب پیدا کرے اور اس طرح اپنے معاشرہ کو بھی متوازن و متناسب رکھے۔ اسی کو حُسْنُ کہتے ہیں۔ کیونکہ حسن نام ہی صحیح تناسب کا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ س۔ ن)۔ توازن، افراط اور تفریط دونوں سے بگڑ جاتا ہے۔ لہذا دین میں غلو سے اس کا مقصد فسوت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَذَرُوْا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِہِمْ (۱۸۰)۔ جو لوگ خدا کی صفات میں کسی ایک طرف کو جھک جاتے (یا نکل جاتے) ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خدا لَا تَمْتَاعُ الثُّحُسْنٰی کا مالک ہے۔ اس کی تمام صفات میں انتہائی درجہ کا توازن اور حسن ہے۔ اس لئے ان میں نہ افراط جائز ہے نہ تفریط۔ غُلُوْا خواہ عقائد میں ہو خواہ عمل میں، حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔ دوسری جگہ آیات خداوندی میں الحاد (ایک طرف نکل جانے) سے روکا گیا ہے (۱:۲)۔ ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا، ہر بات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا، اور ہر عمل میں حسن پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا، یہ ہے اعتدال کی راہ۔ یہ چیز صرف وحی کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

غ ۲۰

اَلْغَمْرَةُ۔ اس کے بنیادی معنی اس چیز کے ہوتے ہیں جو کسی چیز پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس چھپانے

میں قدرے سختی اور شدت کا پہلو ہونا ضروری ہے۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب سفر میں ہانی کم رہ جاتا اور اسے رفقاء سفر میں ماپ ماپ کر تقسیم کرنا پڑتا تو ایک پیالے میں چھوٹا سا پتھر رکھ دیتے اور اس میں ہانی ڈالتے۔ جتنے ہانی سے پتھر ڈوب جاتا اسے ایک حصہ قرار دیتے۔ اس ہانی کو غَمْرَةٌ کہتے تھے۔ اور اس پیالہ کو اَلْغَمْرُ۔ اس سے کثیر ہانی کو بھی غَمْرُ کہتے لگے، اس لئے کہ وہ اپنے اندر جانے والے کو چھپا لیتا ہے اور اس پر چھا جاتا ہے۔ اسی سے مَوْتُ اَلْغَمْرِ۔ ڈوب کر مرنے کو کہتے ہیں۔ غَمْرَاتٌ۔ شدائد اور سختیاں۔ ناگواریاں۔ غَمْرَةُ النَّفْسِ۔ کسی چیز کی شدت اور اس کا هجوم۔ قرآن کریم میں غَمْرَاتُ اَلْمَوْتِ آیا ہے (۶۶)۔ سورہ مومنوں میں ہے۔ فَذَرُوهُمْ فِیْ غَمْرِ تِیْمِمْ حَتّٰی حِیْیْنَ (۵۳)۔ جن چیزوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے ہیں (جن مفاد پرستیوں میں یہ منہمک ہیں) انہیں مردست انہی میں چھوڑ دو۔ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ راعب نے کہا ہے کہ یہاں غَمْرَةٌ کے معنی جہالت کے ہیں جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔

غ م ز

غَمْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا آنکھ سے اشارہ کرنا۔ اور غَمَزَ الْكَتَبُش کے معنی ہوتے ہیں اس نے سینڈھے کو ہاتھ سے دبا کر دیکھا کہ اس میں جربی ہے یا نہیں۔ صاحب محیط نے غَمَزَ کے معنی چبھونے، دبانے اور بھیچنے کے لکھے ہیں۔ اَلتَّغَامِزُ کے معنی ہیں باہم کسی کے کمزور پہلوؤں کی طرف آنکھوں یا ہاتھوں سے اشارہ کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں دوسری چیز سے ٹھوکے مارنا۔ اس کے بعد استعارہ کسی کی عیب جوئی کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرَّوْا بِہِیْمٍ یَّتَغَامِزُوْنَ (۸۳)۔ جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ چشمکیں کرتے۔

غ م ض

اَلتَّغَامِضُ۔ بہت نشیبی زمین۔ اَلْغَمَضُ النَّظَرُ۔ اس نے ہاریک بینی اور تعمق نظر سے کام لیا، گہری نظر ڈالی۔ جب کوئی شخص عمدہ اور

ٹھیک رائے دے تو اس کے لئے کہتے ہیں قَدْ أَغْمَضَ النَّظَرَ - ابن فارس نے اس کے معنی نشیب اور اندر کو گھس جانا بتائے ہیں - اَلْغُمُضُ - نیند کا جھونکا - بقول ابن فارس ، اتنی مقدار جس میں آنکھیں بند کر لی جائیں - غَمَضَ عَيْنَهُ وَأَغْمَضَ بِهَا : اس نے اپنی آنکھ بند کی - اسی بناء پر اِغْمَاضُ کے معنی ڈھیل دینا ، نرمی برتنا ، تغافل و تساهل اور چشم پوشی کے ہو گئے - اور اَلتَّغْمِيزُ عَنِ الْإِسَاءَةِ - کسی کے برا کرنے پر چشم پوشی کر لینا - اِغْمَاضُ فِي الْبَيْعِ یعنی خرید و فروخت میں کسی عیب دار یا ردی چیز کو خریدتے وقت یہ مطالبہ کرنا کہ اسکی قیمت کم کر دی جائے کیونکہ اس میں فلاں نقص ہے * - (۲/۱۶۷) میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے - یعنی اتفاق فی سبیل اللہ میں ایسی ردی چیزیں نہ دو کہ جنہیں تم خود بھی لینا پسند نہ کرو اور اگر کہیں لینی بھی ہوڑ جائیں تو ان کے نقص کی وجہ سے ان کی قیمت گھٹا کر دو -

غ م م

غَمَّ الشَّيْءُ غَمًّا - اسے ڈھانپ لیا - چھپا لیا - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - غَمَّ السَّيْلُ - چاند بادل کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جاسکا - اَلْغَمَامَةُ - بدلی یا سفید بدلی کو کہتے ہیں - اسکی جمع غَمَامٌ ہے - (۲/۵۷) - اَغْمَقَتِ السَّمَاءُ - آسمان ابر آلود ہو گیا - اَلْغَمَامَةُ - اس جھینکے کو کہتے ہیں جو اونٹ وغیرہ کے منہ پر چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ کھا نہ سکے - نیز اس کپڑے کو جس سے اونٹنی کی آنکھیں باندھ دی جاتی ہیں - اس سے اَلْغُمُضُ اس مصیبت کو کہتے ہیں جس سے انسان نکل نہ سکے ، نیز وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہ نظر آئے - اور اَلْغَمَشُ - غبار اور تاریکی کو - نیز جنگ کی شدت جو قوم پر چھا جائے - لہذا اَلْغَمُّ کے معنی میں حزن و کرب (جو چار سو سے کسی پر چھا جائے) - سورہ آل عمران میں یہ لفظ اَمْنَةً کے مقابلہ میں آیا ہے (۳/۱۵۳) - اَلْغَمَّةُ - تحیر و التباس کو کہتے ہیں ، نیز تاریکی و تنگی کو * - سورہ یونس میں ہے لَا يَكُنْ أَمْرٌ كُمْ عَلَيْهِ غَمَّةٌ (۱۰/۱) - تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ اور حیران کن نہ رہے -

غ ن م

اَلْغَنَمُ - بکریاں - (اس کا واحد شاة ہے جو اس مادہ سے نہیں آتا) - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کا اطلاق بھیڑوں اور بکریوں دونوں پر * تاج و راغب - ** تاج و محیط -

ہوتا ہے **۔ (۲۸) - الْغَنِيمُ - الْغَنِيمَةُ - الْغَنِيمُ - مال غنیمت جو جنگ میں ہاتھ آئے *۔ چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ہی سب سے بڑی دولت تھی اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ہاتھ آتے تھے۔ اس اعتبار سے اس مال کو غَنِيمَةُ کہنے لگے۔ غَنِيمٌ - کسی چیز کو بطور مال غنیمت پا لینا۔ کسی چیز کو بغیر بدل و مشقت کے حاصل کر لینا *۔ اَنْتَمَا غَنِيمَتُمُ (۸۱) الْغَنِيمُ - جمع مَغَانِمُ - مال غنیمت (۲۳)۔

(مال غنیمت کے سلسلہ میں عنوانات (ف - ی - ا) اور (ن - ف - ل) بھی دیکھئے)

غ ن ی

الْغِنَى - حاجات سے بے نیازی - تونگری - آسودگی - یہ فقر (محتاجی) کی ضد ہے ، احتیاج نہ ہو ، غَنِيٌّ کہلاتا ہے - نیز آسودہ ، خوش حال ، تونگر بھی - (۲۳) و (۶) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کافی ہونا ہیں - الْغَنَانِيَّةُ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زبانوں و آرائش سے مستغنی ہو *۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (۲۶) - خدا کو بندوں کی اطاعت کی ضرورت نہیں - ان کی اطاعت خود انکی اپنی ذات کے نفع کے لئے ہے - خدا کو کائنات میں کسی چیز کی احتیاج نہیں - اَغْنَى - مستغنی کر دینا (۲۸) - اَغْنَى عَنْهُ غَنَاءَ فَلَانٍ - اسکی جگہ لی ، قائم مقامی کی ، اسکے جیسا کام دیا - اَغْنَى عَنْهُ كَذَا - اس کے لئے فلان چیز کافی ہونی ، اس نے اسے فائدہ پہنچایا - مَا اَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ (۱۱) - اسکے مال نے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچایا - اس کے کسی کام نہ آیا - لَا يَغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (۱۲) - جو تیرے کسی کام نہیں آسکتا - اِنَّ الظّٰلِمَ لَا يَغْنِيْ مِنْ الْحَقِّ شَيْئًا (۳۳) - یقیناً حق کے مقابلہ میں باطل کوئی کام نہیں دے سکتا - باطل ، حق سے قطعاً بے نیاز نہیں کر سکتا - سورہ عبس میں ہے لِيَكُلَّ امْرِئٌ مِّنْهُمْ يَوْمَ يُبْعَثُ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ (۲۵) - اسدن ہر شخص اپنے اپنے دھندے میں اسقدر مشغول ہوگا کہ وہ کام اس کی ساری توجہات جذب کر لینے کے لئے کافی ہوگا - یا دوسروں سے بے نیاز کر دیگا - اَلْمَغْنِيْ (اسم فاعل) وہ جو کفایت کرے - کام آئے - فائدہ پہنچائے - اسکی جمع مَغْنُوْنٌ ہے - سورہ ابراہیم میں ہے کہ عذاب کو دیکھ کر متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے فَهَلْ اَنْتُمْ مَّغْنُوْنٌ عَنِ الْعَذَابِ اللّٰهِ مِنَ شَيْئٍ (۲۱) - ”کیا تم خدا کے عذاب کے

مقابلہ میں ہمارے کسی کام آسکتے ہو یا کفایت کرسکتے ہو؟۔ لیکن
 اَغْنٰی عَنْہُ کذا کے معنی اس سے کسی چیز کو ہٹا دیا، دور کرسدیا بھی
 ہیں۔** اس لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ”کیا تم
 ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ بھی دور کرسکتے ہو؟“۔ (نیز ۲۰۰)۔
 اِسْتَغْنٰی۔ بے نیاز ہو جانا (۱۵۰؛ ۱۶۱)۔ غِنٰی بِالْمَكَانِ وَفِیْہِ۔ اس
 نے اس جگہ طویل مدت تک اقامت کی۔ کَانَ لِلّٰہِ یَعْنُوْا فِیْہَا (۱۶۸؛
 ۱۶۹)۔ گویا وہ ان مکانات میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ اس سادہ کے بنیادی
 معنوں کی رعایت سے اس جگہ معنی صرف طویل مدت تک اقامت کرنا ہی نہیں
 بلکہ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنا بھی ہیں۔ اَلْغِنَاءُ۔ کفایت۔
 پوری صلاحیت و استعداد کے ساتھ کسی کی جگہ لے لینا اور اس کا سہا کام
 دینا۔ اَلْغِنَاءُ۔ گانا۔

غ و ث

اَلْغَوْثُ وَالْغِیَاثُ۔ مدد۔ اِسْتَغْثٰی فُلَانٌ فَاَغْثٰیہُ۔
 فلان نے مجھے مدد کے لئے پکارا تو میں نے اسکی مدد کی۔ اَلَاِِسْتِغَاثَۃُ۔ طلب
 غوث۔ مدد طلب کرنا۔ اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (۹)۔ جب تم اپنے
 رب کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ سورہ کہف میں ہے وَاِنْ یَسْتَغِیْثُوْا
 یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُهْلِ (۲۹)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْث سے بھی
 ہوسکتا ہے (مدد مانگنا) اور غِیْث سے بھی (پانی مانگنا)۔ اسی طرح
 یُغَاثُوْا میں بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔***۔ [دیکھئے عنوان
 غ۔ ی۔ ث]

غ و ر

اَلْغَوْرُ۔ ہر چیز کی گہرائی۔ عمق۔ بُعِدَ۔ رَجُلٌ بِعِیْدٍ اَلْغَوْرِ۔
 گہرا آدمی جو بڑا علم و تجربہ رکھتا ہو۔ اَلْغَوْرُ۔ اَلْغِیَارُ۔ کسی چیز
 کے اندر گھس جانا۔ پانی کا زمین کے اندر اتر جانا۔***۔ قرآن کریم میں ہے
 اِنْ اَصْبَحَ سَاوُکُمْ غَوْرًا (۱۰۱)۔ اگر تمہارا پانی زمین کے بہت
 نیچے اتر جائے (اور اوپر ہی نہ آئے تو تم کیا کرلو)۔ اَلْغَارُ۔ غار۔ (۱۰۲)۔
 اَلْمَغَارَۃُ۔ غار۔ اس کی جمع مَغَارَاتُ ہے۔ (۱۰۳)۔ ”اندر تک گھس
 جائے“ کے اعتبار سے اَغَارَ تیز رفتار ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور فَرَسٌ
 مِغْوَارٌ نہایت تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔ اَلْمَغَارَۃُ۔ حملہ آور
 * تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔ **** تاج و کتاب الاشتقاق۔

سواروں کا دستہ - نیز حملہ - أَغَارَ عَتَى الثَّقَوْمَ - قوم پر حملہ کیا* -
قرآن کریم میں ہے فَالْمَغِيرَاتِ صَبَحًا (نہ۱) - حملہ کرنے اور دشمن
کی صفوں کے اندر جا گھسنے والے گھوڑے - ابن قارس نے لکھا ہے کہ اس
سادہ کے بنیادی معنی (۱) گہرائی اور (۲) کسی کے سال کو جبراً اور قہراً
لینے کے لئے اقدام کرنا ہیں -

غ و ص

الْغَوَّاصُ - الْغَمَّاصُ - ہانی کے نیچے اترنا - غوطہ لگانا - الْغَمَّاصُ
غوطہ لگانے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں - الْغَوَّاصُ - غوطہ خور** - قرآن
کریم میں حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں ہے وَ مِنْ الشَّيْطَانِ مَنْ
يَتَغَوَّصُونَ لَهُ (۲۸) - وہ سرکش اقوام کے لوگ جنہیں (حضرت) سلیمانؑ
نے اپنا فرمانبردار بنا لیا تھا اور وہ اس کے لئے غوطہ خوری کرتے تھے - انہی
کو دوسری جگہ غَوَّاصُ کہا گیا ہے (۳۸) - اسکے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں
کہ وہ بڑی بڑی مہموں میں درانہ گھس جاتے تھے -

جو شخص کسی گہرے اور پیچیدہ معاملہ کی تہ تک پہنچ جائے اور اسے
حل کر لے یا نیچے کی جگہ سے کوئی چیز نکال لائے ، اسے بھی غَمَّاصُ
کہتے ہیں*** - اصل میں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں نشیب کی طرف تیزی سے
جانا*** - اس سے یہ لفظ ، ہر چیز کے اندر داخل ہونے کے لئے بولا جانے لگا -

غ و ط

الْغَوَّاطُ - الْغَمَّاطُ - نشیبی ، اور وسیع زمین - چونکہ اہل عرب
قضاے حاجت کے لئے نشیبی زمین تلاش کرتے تھے تاکہ اوٹ میں ہو کر
رفع حاجت کر لیں ، اسی لئے بیت الخلا کو بھی غَمَّاطُ کہتے لگے - نیز ایسی
نشیبی زمین ہی میں وہ فضلہ پھینکتے تھے اس لئے انسانی فضلہ کو بھی
غَمَّاطُ کہنے لگے* - (۳۴) - میں جاء أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَمَّاطِ سے
مراد ہے جائے ضرور سے فارغ ہو کر آنا -

غَطَّ - يَغْطُو - داخل ہو جانا - اندر چلے جانا ، دھنس جانا ،
الْغَوَّاطُ - کھودنا***** - يَغْطُو غَوَّاطَةً - گہرا کنواں* -

* تاج - ** تاج و محیط - *** راعب - **** ابن فارس - ***** محیط -

غ و ل

غَالٌ - اس کے بنیادی معنی دھوکے سے پکڑنے یا کسی کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کرنے کے ہیں۔ اَلْغَوْلُ - میدان یا ریگستان کی وسعت یا دوری کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سے گزرنے والا اس طرح ہلاک ہو جاتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ (ابن فارس)۔ اس بناء پر اَلْغَوْلُ - ہلاکت - مصیبت و آفت کو بھی کہتے ہیں۔ غَالَتْهُ غَوْلٌ - ہلاکت نے اسے برباد کر دیا۔ غَالَ الشَّيْءُ - اس نے اس چیز کو تباہ کر دیا۔ اَلْغَوْلُ - درد مر - مستی - ہر وہ شے جس سے عقل جاتی رہے۔ اَلْغَوَائِلُ - مصائب - تباہیاں۔ غَوْلٌ - عرب بھوت، چڑیل کو کہا کرتے تھے۔ نیز سائپ کو*۔

قرآن کریم میں ”جنت کی شراب“ کے متعلق ہے لَا فِيهَا غَوْلٌ (۳۷)۔ اس میں نہ مستی ہوگی نہ سرگرائی۔

غ و ی

غَوَّيْ غَيًّا - بھٹک جانا - دھوکا کھا جانا**۔ بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کے اعتبار سے غَيٌّ کا لفظ رُشْد کے مقابلہ میں آیا ہے۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲۵۶) ”صحیح اور غلط راستے نکھر کر الگ الگ ہو گئے“۔ اور دھوکہ کھا جانے کے معنوں میں مَاضِلٌ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَّيْ (۵۳)۔ ”تمہارا رفیق نہ تو تلاش حقیقت میں سرگرداں ہے اور نہ ہی اس نے دھوکا کھایا ہے“۔ نیز تباہ اور برباد ہو جانا**۔ جیسے وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَّيْ (۱۲۱)۔ راغب اور لسان العرب میں اس کے معنی فَسَدَ عَيْشُهُ لکھے ہیں***۔ یعنی معیشت کا تنگ ہو جانا۔ زندگی خراب ہو جانا۔ روزی کا درہم برہم ہو جانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) صحیح سمت کی طرف راہ نمائی نہ ہونا۔ کسی معاملہ کا تاریک ہونا۔ اور (۲) کسی چیز میں فساد ہونا۔ سورۃ مریم میں جوہ فسَوَفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹)۔ تو اس میں راغب کے نزدیک غَيًّا کے معنی عذاب یا تباہی کے ہیں**۔ یعنی اتباع شہوات اور اضااعت

* تاج و محیط و راغب - ** تاج و راغب - *** بحوالہ غریب القرآن۔ مرزا ابوالفضل - لیکن تاج میں فَسَدَ عَيْشُهُ کی بجائے فَسَدَ جَوْفُهُ ہے یعنی اسکا پیٹ خراب ہو گیا۔

صلوة کا خمیازہ - غَوَّیَ - غلط رو* - (۲۸/۲۸) - تباہ و برباد ہو جانے والا -
 غَاوٍ (جمع غَاوٍ وُؤُنَ) بھٹک جانے والے* - (۲۹/۲۹) - آغْوَى - گمراہ کرنا
 (۲۸/۲۸) - لیکن (۱۱/۱۱) میں جو ہے یُرْبِدُ أَنْ یُغْوِیَکُمْ - تو صاحب
 تاج العروس اور راغب دونوں کے نزدیک اس کے معنی اعمال کے نتیجہ میں
 تباہ و برباد کر دینے کے ہیں* - أَلْغَوَى - بد ہضمی - پیاس* - أَلْغَاوِیَ -
 ٹڈی دل* -

سورة شعراء میں ہے وَالشَّعْرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (۲۲/۲۲)۔ اس
 کے عام معنی تو یہی ہیں کہ شاعروں کے پیچھے لگنے والے فریب خوردہ
 ہیں - اس لئے کہ (جیسا کہ عنوان ش - ع - ر میں بتایا جا چکا ہے) شاعری اس
 ذہنیت کا نام ہے جس میں حقائق کی بجائے صرف جذبات سے کام لیا جاتا ہے
 اور زندگی کا کدوئی غیر متبدل نصب العین سامنے نہیں رکھا جاتا - اس لئے
 ایسے لوگوں کے پیچھے لگنے والے (جو ان جذبات پرستیوں کو حقائق سمجھ
 لیتے ہیں) فریب خوردہ ہوتے ہیں - لیکن پیاس کی جہت سے اس کے معنی یہ
 بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی ، کیونکہ پیاس کی
 تسکین صرف مثبت حقائق سے ہو سکتی ہے - مشتعل جذبات سے نہیں - اسی
 لئے خود شاعروں کو بھی یَغْوِیَہُمُ الْغَاوُونَ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے (۲۲/۲۲) -
 یعنی پیاسے اونٹ کی طرح سخت پریشانی میں مبتلا اور سارے سارے پھرے
 والے (دیکھئے عنوان ہ - ی - م) - یا اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاعروں
 کو بھی اپنے مدح سراؤں سے دھوکا لگ جاتا ہے - وہ سمجھتے ہیں کہ یہ
 فی الواقعہ ہمارے متبعین ہیں حالانکہ وہ محض ٹڈی دل کی طرح ہوتے ہیں -
 دیکھنے میں لا کھوں ، لیکن بالکل بغیر کسی نصب العین کے - ان سب
 کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے - ”بد ہضمی“ کے اعتبار سے دیکھا
 جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ شعراء کا اتباع کرنے والوں کی حالت یہ
 ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا جزو نہیں بنتا
 بلکہ یونہی بلا نتیجہ ضائع ہو جاتا ہے - چند الفاظ جو ذہن کو وقتی لذت دیکر
 موجب تباہی بن جاتے ہیں -

الْغَيَايَةِ - غبار آلودگی اور تاریکی جو چھا جائے - الْغَايَةِ جھنڈے
 کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر سایہ کرتا ہے - پھر کسی چیز کی انتہا
 کو بھی غَايَةِ کہتے لگ گئے کیونکہ جھنڈا فوج کا آخری سپہا اور ان

کی ہستی کا آخری نشان ہوتا ہے۔ (ابن فارس)۔ [واضح رہے کہ غایبہ غ - ی - ی سے ہے لیکن اسے اسی باب میں لکھ دیا گیا ہے]۔ غَسَوَى الْفَصِيلُ "وَأَسْوَى غَسَوَاتِ" "وَأَسْوَى" کے معنی ہیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بد ہضمی ہو گئی اور اس کا پیٹ بگڑ گیا *۔ اس سے بھی غَوَاتِ کی تباہی کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کا شکار مُشْرِفِیْن ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس غَمَوَى الْجَدَى کے معنی ہیں بکری کے بچے کو دودھ سے روک دیا گیا حتیٰ کہ وہ لاغر اور مرنے کے قریب ہو گیا *۔ اس سے بھی مکافاتِ عمل کی وجہ سے تباہی اور بربادی کا تصور سامنے آ جاتا ہے (نیز دیکھئے عنوان ع - ذ - ب)۔

قرآن کریم میں اس مادہ کے الفاظ جس جس مقام پر آئے ہیں، ان میں ایک چیز بقدر مشترک ملیگی۔ یعنی اس میں، قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے، انسان اپنے مفاد، خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور حق کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف جھک جاتا ہے۔ صحیح راستے سے ہٹک جاتا ہے۔ دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس میں یہ تمام باتیں آ جاتی ہیں۔

غ ی ب

ہر وہ چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہو، غَیْبٌ کہلاتی ہے۔ اگر وہ چیز تصور میں موجود ہے لیکن نگاہوں سے پوشیدہ ہے تو پھر بھی غَیْبٌ ہی کہلائیگی۔ غَیْبٌ نشیبی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ غَابَةُ ایسی نشیبی زمین جس سے پہلے اونچی زمین آجائے اور اس لئے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ غَابَةُ گہنے جنگل کو بھی کہتے ہیں جس میں درختوں کی وجہ سے زمین نظر نہیں آتی۔ گڑھے اور کنوئیں کی ترائی اور گہرائی، نیز ہر چیز جو کسی کو چھپا لے، اسی لئے غَیْبَةُ کہلاتی ہے (۱۲)۔ غَیْبَاتُ الشَّجَرِ۔ درختوں کی ان جڑوں کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر پھیلی ہوئی ہوں اور نظر نہ آئیں **۔

قرآن کریم نے غَیْبٌ کے مقابلہ میں شَہَادَةُ کا لفظ لا کسر (۵۹) اس کے معنی واضح کر دئے ہیں۔ یعنی غَائِبٌ وہ ہے جو مشاہدہ میں نہ آیا ہو۔ جو مشہود نہ ہو۔

فَرَسٌ شَائِبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑ میں اپنی کچھ قوت چھپا کر (Reserve) رکھ لے۔ اور فَرَسٌ شَہِیدٌ وہ جو ساری قوت کو نمایاں طور پر سامنے لے آئے ***۔

غَیْب* کے لئے ضروری ہے کہ وہ کہیں موجود ضرور ہو لیکن آنکھوں سے اوجھل ہو۔ جب غَیْب* آنکھوں کے سامنے آجائیگا تو مَشْهُود* ہو جائیگا۔ اگر اس کا کہیں وجود ہی نہیں تو پھر اسے غَیْب* نہیں کہا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ غَیْبَتہ* کسی کی عدم موجودگی میں اس کے کسی ایسے برے وصف کے ذکر کرنے کو کہتے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اسے ناگوار گزرے۔ اگر وہ بات اس میں برے سے موجود ہی نہ ہو تو اسے غَیْبَت نہی بلکہ تَهْمَت کہا جائیگا*۔ غِیْب کے لئے فعل اِغْتَابَ آتا ہے (۳۹)۔

قرآن کریم نے اللہ کے لئے عَالِمُ الْغَیْبِ کہا ہے (۲۲)۔ اس لئے ایمان بالغیب (۴) کے معنی ”اُن دیکھے خدا پر ایمان“ ہی نہیں۔ اس سے ایک تو مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جو مرتب تو اسی وقت شروع ہو جاتے ہیں جب وہ عمل سرزد ہو لیکن مشہود ہو کر سامنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اسی طرح نظام خداوندی کے خوشگوار نتائج اس کے اندر تو ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک اس نظام کو متشکل نہ کیا جائے وہ مشہود ہو کر سامنے نہیں آتے۔ مومنین کی جماعت اس نظام کے اُن دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھتی ہے اور اس یقین کے ماتحت اس نظام کے قیام کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دے جاتی ہے۔ اگر انہیں اس نظام کے اُن دیکھے نتائج پر ایمان نہ ہو تو وہ اس کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ لہذا اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کے اُن دیکھے نتائج پر ایمان اولین شرط ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲)۔ ایک کسان، سردی، گرمی، دن رات، مسلسل محنت کرتا ہے، صرف اس لئے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بیج جسے اس نے بویا ہے ابک دن ثمر بار ہو کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس کھیتی کے لئے ایک دن بھی محنت نہ کرے۔ جو جماعت نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے پہلے پہل اٹھتی ہے اس کے سامنے اس نظام کے نتائج موجود نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس وقت سامنے آئے والے ہوتے ہیں جب وہ نظام متشکل ہو جائے۔ وہ اس نظام کی تشکیل کے لئے صرف اسی بناء پر قربانیاں دے جاتے ہیں کہ انہیں اس کی ہمار آوری پر یقین محکم ہوتا ہے۔ اسی کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے، اَلْغَیْب سے مراد وہ تمام اشیاء یا حقائق ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں خود ذات خداوندی بھی آجاتی ہے۔

سورہ ہود میں ہے وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۱)۔ اس سے مراد ہیں کائنات کی تمام وہ چیزیں اور قوتیں جو ہنوز انسان کی نگاہوں

سے پوشیدہ ہیں لیکن مستقبل میں سامنے آجائے والی ہیں۔ انہی کو مَفَاتِیحُ الْغَيْبِ (۱۹) اور غَائِبَاتُ (۲۵) کہا گیا ہے۔ زمانہ مستقبل کے لئے یہ لفظ (۱۹) میں آیا ہے اور گذشتہ زمانہ کی ان باتوں کے لئے جو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آئی تھیں (۳۳) میں، جہاں کہا ہے کہ ذَالِکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ۔ سورہ یوسف میں ہے۔ لَمْ أَخْبَتْهُ بِأَلْغَيْبِ (۱۲)۔ مینے پیچھے اسکی خیانت نہیں کی۔ غَيَابَتُ (۱۲)۔ کنویں کی گہرائی۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں۔ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبُ اِلَّا اللّٰهُ... (۲۵)۔ ”ان سے کہو کہ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو“۔ حتیٰ کہ رسولوں کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا اعلان ہوتا ہے کہ لَا اَعْلَمُ الْغَيْبُ (۱۱)۔ ”میں غیب نہیں جانتا“۔ البتہ اللہ تعالیٰ انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے ذَالِکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ (۳۳)۔ ”یہ غیب کی ان باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی تمام تر قرآن کریم کے اندر آگئی اور اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے اب کسی شخص کو غیب کا علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کا دعویٰ قیاس آرائیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کریم نے رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۲۸) کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی یونہی اندھیرے میں تیر چلانا۔ انگلیں دوڑانا۔ قیاس آرائیاں کرنا، جن میں سے کبھی اتفاقاً کوئی ٹھیک بھی نکل آتی ہے۔ البتہ تحقیقات کے ذریعے فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب تک وہ قوتیں دریافت نہیں ہونگی ”غیب“ سے متعلق ہونگی۔ جب دریافت ہو کر، محسوس طور پر سامنے آجائیں گی، مشہود ہو جائیں گی۔ لیکن بعض ”غیب“ ایسے ہیں جنہیں محسوسات کے دائرے میں لانا انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ مثلاً ذات خداوندی یا مرنے کے بعد کی زندگی کی کنہ و حقیقت۔ وغیرہ۔

[نیز دیکھئے عنوان ش - ۵ - د]

غ ی ث

الْغَيْثُ۔ بارش۔ وہ بارش جو دور دور تک ہو اور جو بڑی منفعت بخش ہو۔ وہ گھاس جو اس بارش سے پیدا ہو۔ غَاثُ اللّٰهُ الْبِلَادَ۔ خدا نے

شہروں پر پانی برسایا۔ فَرَسٌ ذُو غَبِيثٍ۔ گھوڑا جو اپنی رفتار کو یکے بعد دیگرے نکالتا رہے اور اسکی رفتار کی تیزی بڑھتی جائے۔ بِئِثَرٌ ذَاتُ غَبِيثٍ۔ وہ کنواں جس کے اندر چشمہ ہو*۔

قرآن کریم میں ہے وَبَنِيَّالْغَبِيثِ (۳۹)۔ خدا بارش برساتا ہے۔ سورہ کہف میں ہے وَإِنْ يَسْتَكْفِرُوا (۱۸)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوُثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے اور غَبِيثٌ (پانی مانگنا) سے بھی۔ اسی لئے ہم نے اسے عنوان (غ۔ و۔ ث) میں بھی لکھ دیا ہے۔

غ ی ر

غَيَّرَ۔ عام طور پر سوا، بجز اور علاوہ کے معنوں میں آتا ہے*۔ مَالَكُم مِّنَ اللَّهِ غَيْرُهُ (۵۹)۔ تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی اور اللہ نہیں۔ غَيَّرَ۔ بدل دینا۔ تبدیل کر دینا*۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ (۱۳)۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا (جب تک)۔ تَغْيِيرٌ۔ بدل جانا*۔ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ (۲۵)۔ جس کا مزہ نہیں بدلا جاتا۔

قرآن کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن اس میں ایک باریک پہلو ہے۔ عرب اونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ انہی پر اپنا مال وغیرہ لادنے تھے۔ اونٹ پر کجاوہ باندھا ہو یا سال لدا ہو، چلتے چلتے وہ ضرور ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان چیزوں کو یا ان کی رسیوں کو مرمت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ چلتے چلتے اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے کہ کونسی رسی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ کونسا کجاوہ اپنی حالت پر نہیں رہا۔ جہاں ضرورت سمجھتے فوراً اونٹ کو بٹھاتے اور اس کا کجاوہ یا بوجھ درست کر دیتے۔ اسے وہ کہتے غَيَّرَ عَنْهُ غَيْرُهُ۔ اس نے اونٹ پر سے کجاوہ اتارا اور اسے درست کر (کے پھر باندھا) دیا**۔ يٰۤاَتْرَكَ الْقَوْمَ يُغَيِّرُونَ۔ اس نے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کجاووں (سامان سفر) کی دیکھ بھال کر رہے تھے تما کہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کر کے چلیں**۔

* تاج و محیط۔ ** تاج۔

قوموں کی زندگی میں بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم اپنے سفر زندگی میں اپنے ساز و سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ کے ساتھ اس کی مناسب مرمت اور (Adjustment) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جو اس سے غافل ہو جاتی ہے ”اس کے اونٹ کا بوجھ“ راستے میں گر پڑتا ہے۔

ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) دو چیزوں کے درمیان اختلاف۔ اور (۲) اصلاح اور منفعت۔ چنانچہ غَارَ هُمْ اللَّهُ بِالْغَيْثِ کے معنی ہیں خدا نے بارش سے ان کی حالت کو درست کر دیا۔ اور الْغَيْرَةُ اس رسد یا سامان خوراک کو کہتے ہیں جس سے اہل و عیال کی حالت سدھاری جائے۔ اس بنا پر ان اللَّهُ لَا يَغْتَيِّرُ۔۔۔۔ میں تبدیلی بغرض اصلاح ہوگی۔ غَارَ - يَغَارُ (عَلَيْهِ) کے معنی ہیں غیرت کھانا۔ غَيْرَةُ اسی سے اسم ہے۔ یعنی جو چیز اپنی ہو اس میں جب کوئی دوسرا دخیل ہو تو اس کے خلاف اپنی حفاظت کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اسے غَيْرَةُ کہتے ہیں۔

غ ی ض

غَاظٌ - يَغِيظُ* - غَيِظًا - کسی چیز کا کم یا ناقص ہو جانا، نیز کسی چیز کو کم کر دینا (لازم و متعدی)۔ غَاظَ الْمَاءُ - پانی جذب ہو گیا یا خشک ہو گیا۔ الْغَيْظُ* - وہ نا تمام حمل جو ماقط ہو جائے*۔ ابن فارس نے اس کے معنی کسی چیز میں کمی ہونا اور اس کا تہ نشین ہو جانا بتائے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے مَا تَغِيظُ الْاَلَارْحَامُ وَمَا تَزِدَادُ* (۱۳۱)۔ رحم جس جنین کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے بلکہ نا مکمل گسرا دیتے ہیں۔ یا جنہیں وہ بڑھاتے ہیں۔ اس سے وہ جنین مراد لئے جا سکتے ہیں جو معینہ مدت (نوماہ) سے کم میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ جنین جو معینہ مدت (نوماہ) سے زیادہ مدت لیتے ہیں۔ نیز شکم مادر میں ایک بچہ یا اس سے زائد بچوں کا وجود بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ راغب نے مَا تَغِيظُ الْاَلَارْحَامُ کے معنی کئے ہیں، وہ جسے رحم بگاڑ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ سورہ ہود میں طوفانِ حضرت نوح* کے ضمن میں ہے وَغِيظَ الْمَمَاءُ* (۱۱۱)۔ پانی کم ہو گیا۔ یا خشک ہو گیا۔

غ ی ظ

اَلْغَيْظُ - غضب کو کہتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ غَيْظُ شدید ترین غضب کو کہتے ہیں یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے ** - بعض نے کہا ہے کہ ابتدائی غضب یا جوش غضب کو غَيْظُ کہا جاتا ہے - دوسروں کا خیال ہے کہ غَيْظُ چھپا ہوا غصہ ہوتا ہے اور غَضَبُ ظاہر - یا یہ کہ غَضَبُ صاحب قدرت آدمی کے غصے کو کہتے ہیں اور غَيْظُ عاجز آدمی کے غصے کو * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اُس کرب اور بیچنی کے ہوتے ہیں جو کسی کو دوسرے کی طرف سے پہنچے - غَاظَهُ - اسے غصے میں لایا - برہم کیا - (۲۲/۱۵) - غَائِظُ - وہ جو کسی کو غصے میں لائے - اسکی جمع غَائِظُونَ ہے (۲۶/۵۵) - اَلتَّغْيِظُ - اظہار غیظ جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے ** - یعنی جوش و خروش - (۲۵/۱۲) -

ف

ف (حرف)

ف۔ یہ حسب ذیل مفہوم پیدا کرتا ہے :-

(۱) ترتیب کے لئے۔ یعنی یہ ہوا۔ پھر یہ ہوا۔ پھر یہ ہوا۔ جیسے
 ثُمَّ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ الْعُلٰیٰیۃَ عِلَاقَۃً فَاَخْلَقْنَا الْعِلَاقَۃَ مُضْغَۃً فَاَخْلَقْنَا
 الْمُضْغَۃَ عِظْمًا فَكَسٰوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا (۲۳)۔ پھر ہم نطفہ کو
 لوتھڑا بنائے ہیں، پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے (میں) ہڈیاں
 پیدا کرتے ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ کلیہ نہیں کہ ف۔
 ہر حال میں ترتیب کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات ترتیب نہیں بھی ہائی جاتی۔
 مثلاً سورہ اعراف میں ہے وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اٰهْلٰكْنٰهَا فَاَجَآءَهَا
 بِآسٰنَا بَیِّنَاتٍ اَوْ هُمْ قٰتِلُوْنَ (۲۰)۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم
 نے انہیں ہلاک کر دیا سو ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آیا، یا اس وقت
 جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے۔ اس میں ترتیب نہیں ہے۔

(۲) تعقیب کے لئے۔ یعنی ایک واقعہ کے بعد جتنی مدت میں دوسرا واقعہ
 ہونا ہو وہ اس مدت میں واقع ہو جائے تو اس کا بھی۔ ف۔ سے اظہار کرتے ہیں۔
 مثلاً۔ تَزَوَّجَ فَوُلْدَکَہُ۔ اس نے شادی کی۔ پھر مدت صحیح کے بعد
 اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اگر وہ مدت کم و بیش ہو تو پھر۔ ف۔ نہیں لایا
 جائے گا۔

سورہ مریم میں ہے۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ
 مِّنْ اٰہْلِہَا مَکٰنًا شَرِّیًّا۔ فَاتَّخَذَتْ مِّنْ دُوْنِہِمُ حِجَابًا
 فَارْسَلْنَا لَیْہَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِیًّا (۱۸-۱۹)۔
 فَحَمَلَتْہُ فَانْتَبَذَتْ بِہِ مَکٰنًا قَصِیًّا۔ فَاجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی
 جِذْعِ النَّخْلِہِ (۲۳-۲۴) فَتَدَاہَا مِنْ تَحْتِہَا اِلَّا
 تَعْنٰی (۲۵-۲۶)۔ ”اور قرآن کریم میں قصہ مریم کو

بیان کر۔ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر جانب مشرق ایک جگہ چلی گئی۔ پس اس نے ان سے پردہ کر لیا۔ سوہم نے اپنی ”روح“ کو اس کی طرف بھیجا۔ تو وہ اسے ایک صحیح سالم انسان کی شکل میں متحمل ہو کر دکھائی دیا۔ . . . پھر مریم کو اس (بچہ) کا حمل ہوا۔ سو وہ اسکے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی۔ پھر درد زہ ایسے کھجور کے درخت کی طرف لیے آیا پھر اسے نچلی سمت سے ایک آواز آئی کہ غم نہ کر۔ . . ، ان آیات سے مطلب یہ نہیں کہ یہ تمام واقعات ، یکے بعد دیگرے ، مسلسل ، ایک ہی وقت میں ہوئے چلے گئے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کے لئے جسقدر مدت درکار ہوتی ہے ، ٹھیک اس مدت کے بعد دوسرا واقعہ ہوا۔

(۳) ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے لئے سبب بن جانا۔ مثلاً میں نے اسے توپڑ مارا تو اسے غصہ آگیا۔ قرآن کریم میں ہے۔ فَتَوَكَّزَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ (۲۵)۔ پس موسیٰ نے اسے مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یعنی اس کی موت حضرت موسیٰ کی مار سے واقع ہوئی۔

(۴) واو عاطفہ (اور) کے معنوں میں۔ فَتَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَآخَرَجَهُمَا مِيعَاتِ كَانَتَا فِيهِمَا (۲۶) پس شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا اور اس طرح انہیں وہاں سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ (اگرچہ فَآخَرَجَ میں ف ، سبب کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔)

(۵) جب یہ ان (اگر) کے بعد آئے تو اس کے معنی۔ تو۔ کے ہوتے ہیں۔ جیسے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي (۳۰) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ یا مثلاً (اِنْ) کے بغیر ہی۔ تو۔ کے معنوں میں۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ (۳۴) اور جو کچھ وہ عمل خیر کریں گے تو اس کی ناکداری نہیں کی جائے گی (اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا)۔

(۶) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے۔ بَلِ اللّٰهُ فَاعْبُدْ (۳۶) بلکہ اللہ ہی کی محکومی اختیار کرو۔

(۷) بعض اوقات یہ قسم کی تاکید کے لئے آ جاتا ہے۔ مثلاً قَالَ فَبِعِزَّتِكَ (۳۸) اس نے کہا تیرے غلبہ و اقتدار کی قسم۔ (یہاں ف کو زائد بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ محض بات کے تسلسل کے لئے آیا ہے)۔

ف ا د

فَأَدَّ الْخُبْرَ يَفْقَادَهُ - روٹی کو بھوبھل میں سینکا - فَأَدَّ اللَّحْمَ بِالنَّارِ - گوشت کو آگ میں بھون لینا - الْخُبْرُ الْمَفْتُودُ - بھوبھل میں پکائی ہوئی روٹی - الْفَقْدُ - آگ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بخار - شدت اور حرارت کے ہیں -

قرآن کریم میں دل کے لئے قَلْبٌ* اور فُؤَادٌ* (جمع أَفئِدَةٌ*) آیا ہے (۱۱۱) - اگرچہ ان دونوں کے استعمال میں کوئی خاص خط امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا، لیکن (جیسا کہ راغب نے لکھا ہے) دل کو فُؤَادٌ* اس وقت کہینگی جب اس میں بھڑکنے کے معنی پائے جائیں** - تاج نے لکھا ہے کہ فاد کے اصلی معنی ہلنا اور ہلانا ہیں - اس سے فؤاد دل کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بہت ہلتا اور دھڑکتا رہتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسانی جذبات کی طرف اشارہ ہوگا تو فُؤَادٌ* آئے گا اور جب انسانی فکر کے متعلق بات ہوگی تو قَلْبٌ* - چنانچہ فَأَدَّ زَيْدٌ آ کے معنی ہیں زید کے دل پر چوٹ لگائی - فَأَدَّ الْخَوْفُ فُلَانًا - فلاں آدمی کو خوف نے ہزدل بنا دیا* - ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے -

لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) - قَلْبٌ* اور فُؤَادٌ* کی یہ تقسیم عمومی ہے - ورنہ ان دونوں کا استعمال دل کے معنوں میں ہوتا ہے - قرآن حکریم میں سیاق و سباق کے رو سے دیکھنا چاہئے کہ کس مقام پر عقل و فکر مراد ہے اور کس مقام پر جذبات - اسی فرق کی رو سے قَلْبٌ* اور فُؤَادٌ* کے معنی کرنے چاہئیں - ہمارے ہاں کے لفظ ”دل“ کے مقابلہ میں انگریزی کا لفظ (Mind) زیادہ جامع ہے -

سورة بنی اسرائیل میں ہے لَا تَقْنُفُوا السَّمْعَ لَكُمْ بِهِمْ عِلْمٌ - إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۴۶) ”جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو - یاد رکھو - سماعت - بصارت - اور فؤاد ان میں سے ہر ایک کی بابت پوچھا جائے گا“ - اس میں سمع اور بصر، حواس (Sense Perceptions) کے ذرائع ہیں اور فؤاد سے مراد (Mind) ہے یا جذبات - (Mind) اس لئے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات ہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے - اور ”جذبات“ اس لئے کہ اگر

ان اطلاعات کو جذبات متاثر کر دیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایمان کے لئے حواس اور فؤاد دونوں کی ضرورت بتائی ہے۔ یعنی ان حقائق کو عقل و فکر سے پرکھا جائے اور دل کے جھکاؤ سے قبول کیا جائے (۱۱۱-۱۱۲)۔

سورۃ ہود میں ہے کہ انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ مَا تَشْكُرُ بِهٖمْ فُؤَادُكَ (۱۱۱)۔ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب بچے کو دریا میں بہا دیا تو اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّیْ مُوْسٰی فَرِحًا (۱۱۲)۔ تو اس کا دل صبر و ضبط سے خالی ہو گیا۔ اس کے بعد ہے لَوْ لَا اَنْ رَبَّنَا عَلٰی قَلْبِیْہِمْ رَبَّنَا (۱۱۳)۔ اگر ہم اس کے قلب کو مضبوط نہ کر دیتے تو وہ اپنی بیچینی کا اظہار کر دیتی۔ (اس کے ساتھ ق۔ ل۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے)

ف ا و

اَلْغٰیۃ۔ جماعت۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے کی طرف تعاون و تناصر کے لئے رجوع کریں۔ نیز اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو فوج کے پیچھے ٹھہری ہوئی ہوتی ہے تاکہ شکست کے وقت اس کی طرف پناہ لی جاسکے*۔ (۱۱۶)۔ اَلْغٰیۃ۔ کھل جانا*۔

ف ت ا

مَافَتًا۔ مَافَتِیْ۔ مَا اَفْتَا بِمَعْمَلٍ کَمَدًا۔ وہ (اس کام کو) برابر کرتا رہا۔ اسے ہمیشہ کرتا رہا۔ فَتِیْ عِیْنِ الْاَمْرِ۔ وہ اس بات سے رک گیا۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ فَتِیْ سے پہلے ہمیشہ نفی آتی ہے**۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے۔ تَا لَیْ تَفْتَوُا تَذْکُرُ یُوسُفَ (۱۱۷)۔ تو وہاں تَفْتَوُ سے پہلے لَا محذوف ہے۔ یعنی یہ اصل میں لَا تَفْتَوُ ہے۔ اہل عرب اس سے عام طور پر حرف نفی محذوف کر دیتے ہیں**۔ آیت کے معنی ہیں ”تم یوسف کی یاد سے کبھی باز نہیں آؤ گے۔ اسے کبھی نہیں بھلاؤ گے۔ ہمیشہ یاد کرتے رہو گے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تسلسل کے ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا۔

ف ت ح

فَتَّحَ - يَفْتَحُ فَتْحًا - کھول دیا۔ فَتَحَ - کھولنے میں شدت کے لئے آتا ہے۔ اِنْفَتَحَ - کھل گیا*۔

الْفَتْحُ* - زمین کے بالائی حصہ پر بہتا ہوا پانی۔ مدد۔ نُصِرْتُ - دوجھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دینا۔ (یعنی بات کھول دینا کہ کون جیتا ہے)۔ فَتَحَ الْحَاكِمُ بَيْنَهُمْ* - حاکم نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ اَلْاِسْتِفْتَاَحُ* - کھلوانا چاہنا۔ فیصلہ یا غلبہ طلب کرنا۔ مدد طلب کرنا۔ (۲/۸۹)۔ اَلْمِفْتَاحُ* - خزانہ۔ اَلْفَتْحَا ح* - حاکم۔ پڑا فیصلہ کرنے والا، مشکل اور پُر پیچ معاملات کو کھولنے والا اور حقائق کو ظاہر کرنے والا۔ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ (۳۶/۳۶)۔ اَلْفَتْحُ* - رزق جسے خدا کسی کے لئے کھول دے*۔

سورة بقرہ میں ہے۔ يَحْمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ* (۲/۲۶)۔ وہ باتیں جنہیں اللہ نے تم پر واضح کیا ہے۔ جن کے دروازے تم پر کھول دئے ہیں۔

سورة اعراف میں ہے۔ رَبَّنَا اِنْتَحَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا (۷/۸۹)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان آخری فیصلہ کن بات لے آ۔ سورة ابراہیم میں ہے وَاسْتَفْتَحُوا (۱۴/۱۴)۔ انہوں نے آخری فیصلہ کن بات طلب کر لی۔ سورة سجدہ میں اسی کو یَوْمَ الْفَتْحِ (۳۲/۳۲) کہا گیا ہے۔ یعنی فیصلہ کن انقلاب کی گھڑی۔ سورة قصص میں فارون کے خزانوں کے لئے مَفَاتِحُ* کا لفظ آیا ہے (۲۸/۲۸)۔ سورة نور میں ہے اَوْ مَتَّكِلَتُمْ مَفَاتِحَهُ (۲۴/۲۴) جن کے مال و اسباب کے تم نگہدار ہو۔ یا جن پر تمہارا کنٹرول ہو۔ (۳۵/۳۵) میں یہ مادہ اِسْتَاكَّتْ (روکنے) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

سورة الفتح میں ہے۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (۲۸/۲۸)۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے تیرے لئے زندگی کی راہیں کھول دی ہیں۔ یا علوم و معارف کے دروازے (وحی کے ذریعے) کھول دئے ہیں**۔ یا ایک واضح، فیصلہ کن انقلاب عطا کر دیا ہے۔ بہر حال، قوانین خداوندی کی رو سے مشکلات کا رفع ہو جانا، رکاوٹوں کا دور ہو جانا، زندگی کی راہیں کھل جانا، حقائق کا منکشف ہو جانا، ایک فیصلہ کن انقلاب برپا ہو جانا اور اس طرح حق و باطل کا نکھر کر الگ الگ ہو جانا، فَتَحَ* ہے۔

ف ت ر

فَتَرَّ - يَفْتَرُ - فَتَرًا - تیزی کے بعد ساکن ، سختی کے بعد نرم ، ہو جانا - کسی چیز کا دھیمہ پڑ جانا - اسکی شدت میں کمی آ جانا - فَتَرَّ الْمَاءُ - پانی کی گرمی کم ہو گئی - الْفَتَايِرُ - نیم گرم پانی کمو کہتے ہیں - فَتَرَّ جِسْمُهُ - اسکے جسم کے جوڑ بند ڈھیلے پڑ گئے - طَرَفُ فَتَايِرٍ - کمزور نگاہ - (یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے - جیسے چشم نیم باز) - أَفْتَرَّ الشَّرَابُ - شراب خوار کے نشہ کی مستی ختم ہو گئی ، اور وہ کمزور ہونے لگا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں کمزوری آ جانا -

سورہ انبیاء میں کائنات قوتوں (ملائکہ) کے متعلق ہے - يَسْبِغُونَ الْقَيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتَرُونَ (۲۱) - وہ ہمیشہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں نہایت تیزی سے سرگرم عمل رہتی ہیں اور ان میں کبھی مستی نہیں آتی - فَتَشْرُ الْعَذَابَ - عذاب کو کم کیا یا اسکے زور کو ہلکا کیا - (۲۳/۴۵) -

نبی اکرمؐ کی بعثت کے متعلق ہے کہ آپ علیٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرَّسُلِ (۱۹) تشریف لائے - یعنی اس زمانہ میں جبکہ گذشتہ انبیاء بنی اسرائیل کی رسالت کا اثر دھیمہ پڑ چکا تھا - رسول اللہؐ سے پہلے آسمانی تعلیم میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے ایک نئے نبی کی ضرورت ہوتی تھی ، کیونکہ علاوہ دیگر وجوہ و عناصر) اس فَتْرَةٍ کے زمانہ میں سابقہ نبی کا پیغام بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہتا تھا - لیکن رسول اللہؐ کے بعد اس دعوت میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی - اسلئے کہ حضورؐ کا پیغام قیامت تک اپنی اصلی شکل میں موجود رہیگا - لہذا اس میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے اس پیغام (قرآن کریم) کو ابھار کر سامنے لانے کی ضرورت ہوگی ، اور یہ کام وارثین کتاب (امت محمدیہ) کے کرنے کا ہوگا - اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیا جائے جسے نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے مطابق قائم کیا تھا -

ف ت ق

فَتَقَّهَ - يَفْتِقُ - (يَفْتِقُ) - اس نے اسکو پہاڑ دیا * -

فَتَنَّقِ الثَّوْبَ - کپڑے کو ادھیڑ دیا اور اسکے ٹکڑوں کو الگ الگ کر دیا۔ *۔ اَلْفَتَقُ - دو ملی ہوئی چیزوں کو الگ کر دینا۔ ***۔ کسی چیز میں کھلا پن اور کشادگی پیدا ہو جانا (ابن فارس)۔ قرآن کریم میں ارض و سماء کے متعلق ہے۔ کَانَتَارَ نَفًّا فَفَتَقْنَاهُمَا (۱۲)۔ پہلے یہ تمام کائنات ایک ہی ہیولی تھی۔ بعد میں اس سے مختلف کٹرے پیدا ہو گئے (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر۔ ت۔ ق)۔

ف ت ل

فَتَّلَ - يَفْتِلُ - (رسی وغیرہ کو) بٹا - بل دے۔ ****۔ ابن فارس نے یہی اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں۔ اَلْفَتِيلُ - وہ ہار یک سی سفید چیز جو کھجور کی گٹھلی کے شکف میں ہوتی ہے۔ عرب اس سے قلیل اور حقیر شے کی مثال دیا کرتے ہیں۔ *۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا يَظْلِمُونَ فَتِيلًا (۱۳)۔ ان کی ذات کی نشوونما میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (۱۴)

ف ت ن

فَتَنٌ کے بنیادی معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹا الگ ہو جائے۔ چنانچہ وَرَقٌ فَتَيْنٌ جلائی تپائی ہوئی چاندی کو کہتے ہیں۔ اور دِرْهَمٌ مَفْتُونٌ وہ دینار جو آگ میں تپا یا گیا ہو۔ *۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آئے ہیں۔ چنانچہ اَلْفَتَانَةُ - کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر انکی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ **۔ یہیں سے فِتْنَةٌ کے معنی تاؤ دیکر ہر کھنے اور آزمائش کرنے کے آئے ہیں۔ *

نیز اس کے معنی جلانے کے بھی آئے ہیں۔ فَتَنَ الشَّارَ الْغَرِيفَ - آگ نے روٹی جلا دی۔ اس سے فِتْنَةٌ کے معنی عذاب، مصیبت اور جنگ کے بھی آئے ہیں۔ نیز گمراہ کر دینے کے۔ *

فَتْنَةٌ - اَفْتَنَهُ کے معنی ہیں اسے پسند کر لیا۔ اسکو پسند آگیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّقَوْمٍ الظَّالِمِينَ (۱۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان لوگوں کو ہم پر غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ اس فریب میں مبتلا رہینگے کہ یہ ہم سے بہتر ہیں اس لئے اہل کفر کو

* تاج - ** محیط - *** راغب - **** تاج و ابن فارس -

اور زیادہ پسند کرنے لگ جائیں گے *۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اس قوم کا تختہ مشق مت بنا۔

قرآن کریم میں یہ مادہ جنگ کے معنوں میں (۹۱) آیا ہے۔ اور جنگ کے مصائب و مشکلات کے معنوں میں یَفْتَنُونَ (۱۳۶) میں۔ صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راستے پر لگا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۳۴) میں آیا ہے۔ نیز فِتْنَةٌ (۳۹) میں اس کے معنی گمراہی کے ہیں۔ یہی معنی اس مادہ کے (۹۹) اور (۳۶) میں ہونگے جہاں اس سے مراد صحیح راستے سے ہٹا دینا ہیں۔ خَبِيرٌ کے مقابلہ میں فِتْنَةٌ (۲۴) میں آیا ہے۔ سورۃ طہ میں حضرت موسیٰ کے متعلق ہے وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا (۲۰) ہم نے تجھے کئی کٹھالیوں میں سے گزار کر تیری تربیت کی اور اس طرح تجھے مقام نبوت کے شایان شان بنایا۔ یعنی فِتْنَةٌ کے معنی ہیں ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے اور انسان پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی کس حد تک ربوبیت ہوئی ہے۔ جہانتک انسانی معاشرہ کا تعلق ہے اس کا قوانین خداوندی کے مطابق نہ رہنا، فِتْنَةٌ ہے۔ نیز فتنہ انگیزی (۲۳)؛ (۸۹)۔ یہ ہیئت مجموعی، یہ لفظ قرآن کریم میں ان رکاوٹوں کے لئے آیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل کی جاتی ہیں۔

ایذا، مصیبت اور تکلیف کے معنوں میں (۲۴) میں۔ عذاب (سزا) کے معنوں میں (۳۳) میں۔ دھوکا اور فریب کے معنوں میں (۲۴) میں۔ نیز الْمَفْتَنُونَ (۱۸) میں بمعنی فریب خوردہ و گمراہ۔ سزا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۵۳) میں آیا ہے اور (۲۳) میں لفظ فِتْنَةٌ معذرت اور حجت کے معنوں میں آیا ہے۔

ف ت ی

الْفَتَاءُ - جوانی - شباب - الْفَتَى - نوجوان - اس کے بعد یہ لفظ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا، خواہ وہ کسی عمر کا ہو۔ یعنی فَتًى - غلام، اور فَتَاةٌ لونڈی **۔

فتی - بمعنی نوجوان لڑکا (۲۱) میں آیا ہے۔ اس کا تثنیہ فَتَيَانِ ہے (۱۲) - فِتْيَةٌ جمع ہے (۱۸) - نیز فِتْيَانِ بھی جمع آتی ہے - (۱۲) - فَتَاةٌ کی جمع فَتَيَاتٌ آتی ہے - (۲۵) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں - (۱) تازگی اور نیا ہونا - شباب اور نوجوانی کا مفہوم اسی سے ہے - اور (۲) فیصلہ یا حکم کو واضح کر دینا -

* تاج - ** تاج و محیط -

آفتنی - کسی بات کا حکم بیان کر دینا - فتویٰ دیدینا - کسی سوال کا جواب دیدینا - کہتے ہیں کہ اسکی اصل فتیٰ یعنی نوجوان ہے * جو قوت و تازگی رکھتا ہے - گویا فتویٰ دینے کے لئے علمی قوت و تازگی کی ضرورت ہے ، یا پھر یہ آفتنۃ سے ہے جس کے معنی سخاوت کے ہیں * - آفتنی حکم دینا - قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يَفْتِيْكُمْ (۱۴۷) - استفتی - فتویٰ (حکم یا فیصلہ) طلب کرنا (۱۴۷) -

ف ج ج

آلفج - دو پہاڑوں کے درمیان وسیع راستہ - فیجاتج - اسکی جمع ہے ** - قرآن کریم میں ہے مِّنْ كُلِّ فُتُجٍ عَمِيْقٍ (۲۲) - ” ہر دور دراز راستے سے “ - آلفجاتج - بھی اسی کو کہتے ہیں - آلفج - دو چیزوں کے درمیان کشادگی کر دینے اور فاصلہ بڑھا دینے کو کہتے ہیں - آلفجۃ - دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی ** - قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا فِیْہَا فِجَاجًا (۲۱) - ہم نے پہاڑوں میں کشادہ راستے بنائے -

ف ج ر

آلفجّر کے اصلی معنی پہاڑ نے اور شق کر دینے کے ہیں - نیز اس میں میلان اور جھکاؤ (ایک طرف ہٹ جانے) کا مفہوم بھی ہوتا ہے - چنانچہ پہلے مفہوم کی رو سے فَجْرٌ - یَفْجُرُ کے معنی ہیں پانی کو پہاڑ کر بہا یا - فَجْرٌ - تَفْجِیْرٌ - شدت سے پانی کو پہاڑ کر بہا یا - آفَجْرَ السِّنْبُوْع - چشمہ کو پہاڑ کر نکالا - اِنْفَجَرَتْ عَنَّا یَہِیْمُ الدَّوْاھِی - ان پر ہر طرف سے مصیبتیں پھوٹ پڑیں - آلفجّر - صبح کی روشنی جو تاریکی کو پہاڑ کر باہر نکل آتی ہے - روشنی کے اعتبار سے طَرِبُقٌ فَجْرٌ واضح راستے کو کہتے ہیں اور پھٹنے کے مفہوم سے آلفجّار خود راستوں کو کہتے ہیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کشاد اور کھلا بن ہونے کے ہیں -

ایک طرف ہٹ جانے یا جھک جانے کے مفہوم سے فَجْرَ الْاَرَاکِبِ فُجُوْرٌ کے معنی ہیں سوار اپنی زین سے ایک طرف ہٹ گیا - اور فَجْرَ عَنَ الْحَقِّ کے معنی ہیں وہ حق سے ہٹ گیا * - فاسیق و فاجیر اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے -

لیکن اَلْفَجْرُ کے معنی مال و دولت کی فراوانی اور جُود و سخا اور عطیہ کے بھی ہیں۔ اور اَلْفَتَّاحُ - سال دار آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ نیز فِجَارَاتُ الْعَرَبِ - عربوں کے مفاخرات کو۔ فَجَّرَ الرَّجُلُ - آدمی سخی ہو گیا۔ تَفَجَّرَ بِالنَّكْرَمِ - اس نے بہت سخاوت کی*۔

قرآن کریم میں پہاڑ سے چشمے پھوٹ نکلنے کے لئے یہ مادہ (فَجَّرَ) میں آیا ہے۔ زمین سے چشمے بہہ نکلنے کے لئے (فَجَّرَ) میں۔ اور نہریں نکلنے کے لئے (فَجَّرَ) میں۔

سورۃ شمس میں نفسِ انسانی (انسانی ذات) کے متعلق ہے۔ فَالْهَمَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۱۸) اس کے معنی یہ کہنے جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز کا علم رکھ دیا ہے۔ (یہ مفہوم کسطرح قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اس کے لئے ل۔ ۵۔ م کا عنوان دیکھئے)۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس آیت میں فُجُورَهَا اور تَقْوَاهَا کہا گیا ہے جو نفسِ انسانی (انسانی ذات Human Personality) کی دو کیفیتوں کا نام ہے۔ فَجَّرَ کے معنی پہاڑ دینا ہیں۔ لہذا انسانی ذات کا فُجُورٌ اس کا منتشر (Disintegrate) ہو جانا ہے۔ اور تَقْوَاهَا چونکہ اس کے مقابل میں آیا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے انسانی ذات کا تشمت و انتشار سے محفوظ رہنا۔ (Disintegrate نہ ہونا)۔ اسی وجہ سے دوسری جگہ مُتَّقِيْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ آیا ہے (۳۸)۔ فَاجِرٌ کا لفظ (۱۹) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی راہ سے ہٹا ہوا۔

درحقیقت، جو انسان خدا کی راہ سے ہٹتا (اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا) ہے اس کی ذات (Personality) میں انتشار (Disintegration) واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے فاجر وہ ہے جس کی ذات مستحکم ہونے کے بجائے منتشر ہو جائے۔ نشو و نما یافتہ ذات (Developed Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ (Integrated) ہوتی ہے۔ لہذا سورۃ شمس کی مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی ذات میں پینے اور بگڑنے کی صلاحیت رکھدی گئی ہے۔ اب جو شخص چاہے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت سے اپنی ذات کی نشو و نما کر کے اسے مستحکم کر لے۔ اور جو چاہے اس سے منحرف ہو کر اسے منتشر و متفرق (Disintegrate) کر دے۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسانی ذات میں نہیں۔ اسکی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے۔

* تاج و محیط۔

یعنی وحی بتا سکتی ہے کہہ خیر کسے کہتے ہیں اور شر کیا ہے۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر انسان مطلق خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو وحی کی روشنی کے بغیر خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

ف ج و

الْفَتْحُوةُ* - کشادگی - دو چیزوں کے درمیان کھلی جگہ - زمین کا وسیع حصہ - فیرا خ جگہ - وسیع میدان اور صحن - فَتَحَ أَبَابَهُ فَتَحُوا - اس نے اپنا دروازہ کھول دیا - الْفَتْحَا - دونوں رانوں یا گھٹنوں یا ہنڈلیوں کے درمیان کا فاصلہ* -

قرآن کریم میں اصحاب کھف کے متعلق ہے - وَ هُمْ فِي فَتْحُوةٍ مِّنْهُ* (۱۸) - وہ اس غار کے اندر ایک کھلی جگہ میں تھے -

ف ح ش

الْفُحْشُ* - حد سے بڑھ جانا - زیادتی کر بیٹھنا - کسی بات کا حد سے تجاوز کر جانا - گفتگو میں آداب و احترام کے حدود پھاند جانا - فَحْشُ الْاَلَمْرِ* - معاملہ حد سے تجاوز کر گیا - الْفُتْحِيشُ* - حد سے تجاوز کر جانے والا** - قرآن کریم میں فَحْشَاءُ* - عَدُوْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶)۔ اور قِسْطٌ کے مقابلہ میں بھی (۴۹-۴۸) - سورة احزاب میں یہ لفظ قَسَمْتُ کے مقابلہ میں آیا ہے - (۳۳-۳۴) - قَسَمْتُ کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہیں - (دیکھئے عنوان ق - ن - ت) - اس لئے فَحْشُ کے معنی حدود خداوندی سے تجاوز اور سرکشی کے ہیں - یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی فَحْشٌ میں داخل ہے - یا کوئی ذلیل اور شرمناک حرکت (۳۴) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں برائی یا شاعت کے ہیں -

فَحْشَاءُ کے معنی بخل ہیں - بخیل کو فَتْحِيشُ* کہتے ہیں** - اَفْحَشَ اس نے بخل کیا*** - ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں فَضْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے - (۲۶۸) - فَضْلٌ کے معنی ہیں رزق کی کشائش، وسعت - لہذا فَحْشٌ کے معنی ہونگے رزق کی تنگی - کمی - یا اس کے خرچ میں ہاتھ روک لینا - اسی کو بخل کہتے ہیں - یا اس آیت (۲۶۸) میں فَحْشَاءُ کے معنی ہونگے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا -

الْفَوَاحِشُ*۔ فَاحِشَةٌ* کی جمع ہے۔ اور الْفَحْشَاءُ*، فَاحِشَةٌ* کا اسم ہے*۔ یعنی حدود فراموشی۔

سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فَاحِشَةٌ* میں شمار کیا گیا ہے (۱۴/۱۶)۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں فَاحِشَةٌ* کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی زنا ہی کے ہونگے۔ سورۃ انعام میں ہے ”وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلَا مَبْطُنً“ (۱۶/۱۷)۔ ”تم فواحش کے قریب مت جاؤ۔ جو ان میں سے ظاہر ہو اور جو چھپی ہوئی ہو“۔ ان کے قریب مت جاؤ۔ لہذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آجاتی ہے۔ اسی بنیاد پر سورۃ نساء میں جہاں فرمایا کہ وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّ الْفَوَاحِشَ مِنْ زِينَتِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةٌ مِنْكُمْ“ (۴/۱۵)۔ ”اور تمہاری عورتوں میں سے جو فاحشہ کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ“۔ تو اس میں فَاحِشَةٌ* سے مراد زنا نہیں۔ اس لئے کہ اول تو زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے۔ دوسرے زنا کی سزا دوسرے مقام پر خود درجے لکھی ہے (۲/۲۲)۔ لیکن اس جگہ فَاحِشَةٌ* کے جرم کی سزا صرف گھروں میں روک لینا کہا گیا ہے۔ اس لئے یہاں فَاحِشَةٌ* سے مراد زنا سے ورے بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا ٹک منتج ہو سکتی ہیں۔ قوم لوط کے متعلق کہا گیا ہے آتَا تُوْنَ الْفَوَاحِشَ (۸۰/۸)۔ اور اس سے اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اُس سے مراد لواطت ہے (۸۱/۸)۔ نہ کہ زنا۔ اور جس طرح دو مردوں کا اختلاط فاحشہ ہے اسی طرح عورتوں کا باہمی اختلاط (جماعت) بھی فاحشہ ہے۔

نیز لفظ فَوَاحِش (بطور جمع) خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف زنا ہی نہیں، دوسرے بے حیائی کے کام بھی فاحشہ میں داخل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (پیشہ ور عورتوں سے قطع نظر) فعل زنا کا ارتکاب یک لخت (فوری طور پر) ظہور میں نہیں آجاتا۔ اس کے لئے (غیر) مرد اور عورت باہمی (ملنے جلنے) کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ پھر ذرا بات آگے بڑھتی ہے تو ہم آغوشی وغیرہ کی نوبت آتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ جنسی اختلاط (زنا) تک بات پہنچتی ہے۔ قرآن کریم ان مبادیات کو روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ فواحش ہیں جن کا ذکر اوپر (۱۵/۱۶) میں آیا ہے۔

ف خ ر

الْفَخْرُ - وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو* - اور دھار بھی پتلی ہو*** - اس سے الْفَخْرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی باتیں بڑی بڑی کرنا لیکن جوہر ذاتی کا بہت کم ہونا - ایسی باتوں پر ناز کرنا جو انسان کے ذاتی جوہر نہ ہوں بلکہ اضافی ہوں - مثلاً حسب و نسب - دولت و حکومت وغیرہ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی پرانی باتوں کو شمار کرنا ہیں - سورۃ نساء میں بخیل کو فَخْرٌ کہا گیا ہے (۴۰: ۳۶) - یعنی جس کے تھن بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں سے دودھ بہت کم نکلتے - سورۃ حدید میں تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ (۵۶: ۲۱) آیا ہے - یعنی ایک دوسرے سے بڑا بننے کی کوشش ، ذاتی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اضافی نسبتوں کی بنیاد پر - ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انجان کے اندر ہے ، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یونہی نمائشی نسبتوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے بجائے جوہر ذاتی میں بڑھنے کی کوشش کرو - (۱۳۸: ۲) -

الْفَخْرُ - مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے - اصل میں فَخْرٌ مٹکوں (ٹھیلیوں) کو کہا جاتا ہے** جو اندر سے خالی ہوتے ہیں لیکن بولتے بڑے زور سے ہیں - قرآن کریم میں ہے - خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخْرِ (۹۵: ۱۴) - انسان کو ٹھیکری جیسی سوکھی مٹی سے پیدا کیا - (تفصیل اس کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی) -

ف دی

فَدَاهُ - بِفَدَاهُ - فِدَاءٌ وَفِدَى - اس نے کچھ خرچ کر کے اسے کسی مصیبت سے بچا لیا - تَفَادَى مِثْلُهُ - اس سے بچا - اِفْتَدَى اِيْهَ بِكَذَا - اس نے خود کو مال کے عوض چھڑا لیا - فَتَادَاهُ مَفَادَاةً - اهل لغت نے فَتَادَاهُ کے مختلف معنی لکھے ہیں - یہ بھی کہ اس نے کچھ دیکر اسے چھڑا لیا - اور یہ بھی کہ اس نے کچھ لے کر اسے چھوڑ دیا - بعض نے کہا ہے کہ مَفَادَاةٌ یہ ہے کہ تم ایک آدمی دیکر اس کے عوض دوسرا آدمی چھڑا لو - اور فِدَى یہ ہے کہ تم روپیہ دیکر اسے خرید لو - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں**** - بہر حال اس میں کسی کو

بچا لینے کا پہلو بنیادی ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی یہی ہیں کہ کسی چیز کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے اسکی جگہ کسی دوسری چیز کو دے دینا۔

قرآن کریم میں یہ لفظ قیدیوں کو کفارہ دیکر چھڑانے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۸۵)۔ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے۔ وَفَدَّ يَنْهٖ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۳۰/۳۷)۔ یعنی ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچا لیا۔ انہیں حضرت ابراہیمؑ کی چٹھری سے محفوظ کر لیا اور تولیت کعبہ کی خدمت عظیم ان کے سپرد کر دی (۱۲/۲۵)۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جس میں تمام آرام اور چین چھوڑ کر اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دینا تھا۔ یعنی وہ قیمت جو ان سے ان کی جان کے عوض بطور فدیہ لی گئی تھی۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ فَامَّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاً (۲/۲۰۰)۔ انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا ان کا معاوضہ لیکر (قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لیکر چھوڑ دو) بہر حال انہیں چھوڑنا ہوگا۔ لہذا جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا خیال قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا۔ اسے قرآن کریم نے اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک)

واضح رہے کہ فَاِمَّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاً سے یہ مراد نہیں کہ جنگ کے قیدیوں کو گرفتاری کے فوری بعد رہا کر دینا ہوگا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ تقاضائے حالات انہیں قید میں رکھا جاسکتا ہے (فَتَشَدُّ وَالْوَتَاقُ - ۲/۲۰۰) اس کے بعد جب انہیں (غلبہ) حاصل ہو جائے تو پھر ان کی (Disposal) کا سوال سامنے آئیگا جس کا یہ تقاضائے حالات فیصلہ کیا جائیگا کہ انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لیکر۔

ف ر ت

الْفُرَاتُ - نہایت شیریں پانی۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اسے فُرَاتُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (يَفْرُتُ الْعَطَشَ) پیاس کو تسکین دیتا ہے *۔ اسکی تیزی کو توڑ دیتا ہے *۔ سورہٴ مرسلات میں مَاءُ فُرَاتَا (۲۷/۲۷) آیا ہے۔ سورہ فرقان میں عَذْبُ فُرَاتٍ (۲۵/۲۵) آیا ہے۔ یعنی بہت شیریں۔

* تاج - راغب - محیط -

ف ر ث

الْفَرَثُ* - غذا جب وہ اوجھڑی کے اندر رہے* - سورہ نحل میں ہے کہ تم دیکھو کہ جانور کے پیٹ میں فرث اور خون جیسی اشیاء میں سے کس طرح دودھ جیسی صاف اور لطیف غذا تیار ہوتی رہتی ہے - (۹۶) - ویسے اَلْفَرَثُ* ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ریزہ ریزہ ہو گئی ہو (ابن فارس) فَرَثٌ - اس نے بکھیر دیا - فَرَثَ الثَّجُوبُ کَبِيدَةً* - محبت نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیے - لہذا فَرَثٌ، غذا کی وہ حالت ہے جس میں وہ معدہ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے - اہل لغت نے اس سے گوہر مراد لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد جانور کی خوراک کی وہ حالت ہے جس میں وہ ہضم ہونے کے لئے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے - (لین نے یہی تصریح کی ہے) -

ف ر ج

الْفَرَجُ* وَالْفُرْجَةُ* - دو چیزوں کے درمیان شکاف یا کشادگی** - بَابٌ مَفْرُوجٌ* - کھلا ہوا دروازہ - تَفَارُجٌ* الْأَصَابِعِ - انگلیوں کے درمیانی شکاف - اَلْفَرَجُ* - شرمگاہ، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی - نیز ہر خطرہ کی جگہ -

قرآن کریم میں ہے - اِذَا السَّمَاءُ فُرْجَتْ* - (۹۶) جب آسمان پھٹ جائے گا - کھول دیا جائے گا - دوسری جگہ ہے - اِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ* (۸۴) ”جب آسمان شق ہو جائیگا“ - سورۃ ق میں ہے مَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ* (۵۶) - ان میں کہیں کوئی شکاف نہیں - مطلب نقص اور خرابی سے ہے - جیسا کہ دوسری جگہ ہے هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُتُورٍ* (۲۴) - ”کیا تجھے کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے؟“

قرآن کریم میں حفاظتِ عصمت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے یہی الفاظ آئے ہیں - چنانچہ مردوں کے متعلق ہے - يَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ* (۲۴) - اور عورتوں کے متعلق ہے يَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ* (۲۴) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں - حضرت مریم کی پاک دامنی کا اظہار بھی انہی الفاظ سے کیا گیا ہے - وَالَّتِي أَحْصَيْنَا فُرُوجَهَا* (۹۱) جس نے اپنی عصمت کا تحفظ کیا -

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ فَرَحٌ * مقام مخصوص ہی کو نہیں کہتے بلکہ عربی محاورہ میں یہ لفظ عصمت کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ برخلاف ہماری زبان کے جس میں فَرَحٌ * کا لفظ صرف عورت کی شرم گاہ کے لئے آتا ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، ان کے ترجمہ میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ف ر ح

الْفَرَحُ *۔ لسان میں ہے کہ یہ حَزْنٌ * کی ضد ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ فوری یا عارضی لذت پر انشراح صدر کو کہتے ہیں۔ اور سُرُورٌ * اس انشراح صدر کو جس میں دل کو فوری اور دیر پا دونوں قسم کا اطمینان حاصل ہو، لیکن کبھی (اس فرق کی رعایت کے بغیر) یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں *۔ سورہ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔ فَبَيِّذْ أَلَيْكَ فَتَنَ يَفْتَرِ حُوتًا (۱۰۸)۔ انہیں چاہئے کہ اس قرآن کریم کے ملنے پر خوشیاں منائیں۔

نیز اس کے معنی لاترانے کے بھی ہیں *۔ سورہ نمل میں ہے۔ بَلْ أَنْتُمْ * بِمَهْدٍ يَشْتِكُمُ * تَفْتَرِ حُوتًا (۲۶)۔ تم اپنے اس تعفہ پر بڑا ناز کرتے ہو (کہ یہ بہت بڑی چیز ہے)۔ سورہ قصص میں ہے کہ قارون سے (اسکی قوم کے لوگوں نے) کہا۔ لَا تَفْرَحْ * إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۲۸)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اس میں اس اوچھے پن کے مظاہرے کی طرف اشارہ ہے جو کم ظرف انسان میں مال و دولت کے مل جانے سے پیدا ہو جاتا ہے۔

سورہ روم میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم نے کہیں ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا، جس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ * حِزْبٍ * بِمَا لَدَيْهِمْ * فَرِحَ حُوتًا (۳۲) ہر فرقہ اپنے مسلک پر اتراتا ہے اور مگن ہو رہتا ہے کہ یہی مسلک حق ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔ بس میرا فرقہ ناجی ہے باقی سب جہنمی ہیں۔

سورہ آل عمران میں يَفْتَرِ حُوتًا * بیہما کے مقابلہ میں تَسْتَوُ * ہُمُ * آیا ہے (۳۹)۔ یعنی برا لگنا۔ اور (۱۳۶) میں اس کے مقابلہ میں يُسْكِرُ * آیا ہے۔ یعنی ناگوار گزرنے۔ سورہ روم میں اس کے مقابلہ میں يَتَنَطَّوْنُ * آیا ہے (۳۹)۔ نا امید ہو جانا۔ اور سورہ حدید میں تَأْسَوُ * (۵۶)۔ ”افسوس کرنا“۔ اس تقابل سے فَرَحٌ * کے معنی اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

ف ر د

الْفَرْدُ "د" - تنہا - اکیلا - زَوْج "ج" جوڑے کو کہتے اور ان میں سے ہر ایک فَرْد "د" ہوتا ہے - وہ چیز جس کی مثال و نظیر نہ ہو - نَاقَة "ق" فَاَرْدَة "د" - وہ اونٹنی جو چراگاہ میں سب سے الگ اکیلی چرتی ہو * - راغب نے کہا ہے کہ الْفَرْدُ "د" اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہ ملائی گئی ہو - یہ لفظ وَتَر "ت" سے عام اور وَاحِد "ح" سے اخذ ہے - مُنْفَرِد "د" کے معنی یکتا (دوسروں سے الگ) ہونگے ** - سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا (۲۱) - اے میرے نشوونما دینے والے مجھے تنہا نہ چھوڑ - لیکن چونکہ انہوں نے اولاد کے لئے دعا مانگی تھی اس لئے یہاں اس کے معنی بے اولاد کے ہونگے - سورہ مریم میں ہے كَلَّمَهُمُ الْيَسْمَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (۱۹) - یعنی اعمال کے ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے نتیجہ میں شریک نہیں ہو سکے گا - نہ ہی اس کا کوئی حمایتی ہوگا - (اسے ۲۵) میں دہرایا گیا ہے - قانون مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متاثر ہوتا ہے - اس سے نفس انسانی (Self) کی یکتائی (Uniqueness) اور انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ حریت (Freedom) اور یکتائی، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات ہیں - قرآن کریم میں ہے - وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۶۵) اور یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح انفرادیت لئے ہوئے آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا - اس میں انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے - انسان اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے اور بہت سے مال و اسباب کو ان کے حصول کا ذریعہ - لیکن ان اعمال کا اثر اسکی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال و اسباب اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے - قرآن کریم کا قانون مکافات ایک عظیم حقیقت ہے جسکی بنیادوں پر انسانیت کی ساری ہمارت اٹھتی ہے - ہر عمل کا اثر اس فرد کی اپنی ذات پر ہوتا ہے - اس میں سے نہ آپ کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو کر آسکتا ہے - یہ انسانی ذات کی انفرادیت کی دلیل ہے -

ف ر ر س

الْفَرْدَسَةُ - وسعت اور فراخی - صَدْرٌ مُفْرَدٌ س - وسیع اور کشادہ سینہ - رَجُلٌ فَرَادِسٌ - بڑی چوڑی چکلی ہڈیوں والا آدمی - الْفَرْدُوسُ - کھانے میں برکت - ضیافت - کَرَمٌ مُفْرَدٌ س - انگوروں کی بیلےس جو ٹٹیوں پر چڑھائی گئی ہوں - فِرْدَوْسٌ - سرسبز وادی - باغ اور بستان جس میں ہر قسم کے درخت ہوں - اہل شام بستانوں اور انگوروں کے باغات کو فَرَادِیْسُ کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ رومی یا سریانی ہے - لیکن ابن القطاع نے کہا ہے کہ یہ عربی ہے اور الْفَرْدَسَةُ سے مشتق * -

قرآن کریم میں جَنَّاتُ الْفَرْدِ دَوْس (۱۸:۱۰) آیا ہے - یعنی وسیع اور فراخ ، سرسبز اور شاداب باغات - اس دنیا میں ایسا جنتی معاشرہ جس میں ہر قسم کی وسعتیں اور فراخیاں ، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں - اور اخروی زندگی میں ہر قسم کی وسعت اور شادابی -

ف ر ر

الْفَرَّارُ - الْفَرَارُ - کسی چیز سے ڈر کر بھاگنا ** - دراصل اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھولنے (کَشْفٌ) کے ہیں *** - فَرَّارٌ کے بنیادی معنی جانور کے دانتوں کو کھولنا ہے - اس سے اِفْتِرَارٌ کے معنی ہیں ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا **** - ممکن ہے کہ کھل جانے سے ، بھاگ جانے کے معنی لئے گئے ہوں -

الْفَرَّارُ - بھاگنے والے - فَرَّارٌ کی جمع ہے - (خود الْفَرَّارُ بھی واحد کے لئے مستعمل ہے) - کَتِيبَةُ فَرَّارٍ - شکست خوردہ فوج جو بھاگ اٹھے *** - قرآن کریم میں یہ لفظ بھاگنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے - سورہ کہف میں فِرَاراً (۱۸:۱) آیا ہے - سورہ مدثر میں ہے فَرَّقَتْ مِّنْ قَسْوَرَةٍ (۹۹:۱) - شیر سے ڈر کر بھاگے ہیں - سورہ نوح میں ہے قَدَمٌ يَزِدُّهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَاراً (۹۱:۱) - مینے جتنا انہیں اپنی طرف بلایا یہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے - سورہ قیامہ میں ہے اَيْنَ الْمَفَرِّ (۹۵:۱) - بھاگنے کی جگہ کونسی ہے ؟ یا بھاگ کر کہاں جانا ہے ؟ سورہ ذاریت میں ہے فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ (۵۱:۱) - اس کے معنی رجعت الی اللہ - یا قانونِ خداوندی کی طرف لوٹنے کے ہیں - (مزید تشریح - ج - ع - کے عنوان میں دیکھئے)

* تاج و محیط - * تاج - *** محیط و ابن فارس **** راغب -

ف ر ش

فَرَشٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو بچھانا - کسی چیز کو پھیلانا - چنانچہ اَلْفَرَشُ اس فرش کو کہتے ہیں جو گھروں میں بچھایا جائے، نیز کھیتی جو زمین پر خوب پھیل جائے - اور وسیع اور کشادہ فضا کو بھی - اَلْفَرَشُ اس بیل کو کہتے ہیں جو زمین پر پھیل جاتی ہے * -

اَلْفَرَّاشَةُ اُڑنے والے کپڑے، کپڑے کو کہتے ہیں (مثلاً پروانہ - تلی وغیرہ) - اَلْفَرَّاشُ اسکی جمع ہے - (۱۳۱) - فِرَّاشٌ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو بچھائی جائے * -

سورة انعام میں ہے - وَمِنْ اَلْاَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَّ فَرَشَاتٌ (۱۳۱) - فراء نے کہا ہے کہ اس میں حَمُولَةٌ سے مراد ایسے جانور ہیں جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے قابل ہوں اور فَرَشَاتٌ سے مراد وہ چوپائے ہیں جو اس قابل نہ ہوں - * صاحب محیط نے کہا ہے کہ فَرَشَاتٌ سے مراد چھوٹی عمر کے اونٹ ہیں ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو ذبح کرنے اور کھانے کے لئے ہی موزوں ہوں -

سورة رحمن میں ہے مُتَّكِئِينَ عَلٰی فُرُشٍ (۵۶) - یہ فِرَّاش کی جمع ہے - یعنی بچھائی ہوئی چیزیں - سورة ذاریت میں ہے - وَاَلَا رُضَ فَرَشْنٰهَا (۵۸) - ہم نے زمین کو پھیلا رکھا ہے - سورة واقعه میں ہے - وَفُرُشٍ مَّرْقُوعَةٍ (۵۶) - بےاں فُرُشٌ سے مراد بیگمات ہیں - اور مَرْقُوعَةٍ کے معنی ہیں عالی مرتبت -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْفِرَّاشُ، میاں بیوی میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں، لیکن اس کا صحیح انطباق بیوی پر ہوتا ہے -

ف ر ض

اَلْفَرَضُ کے بنیادی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں - چونکہ جس چیز کو کاٹا جاتا ہے اس کا پہلے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسے کہاں سے اور کیسے کاٹنا چاہئے اس لئے یہ لفظ اندازہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا - اندازہ کرنے کے اعتبار سے اَلْفَرَضُ مَقْرَرٌ حصہ کو کہتے ہیں - نیز ہر وہ چیز جسے معین و مقرر کر دیا جائے - اَفْرَضَ لَہُ - اس کے لئے کسی چیز کو معین و مقرر کر دیا - فَرَضَ لَہُ فِی الْیَدِیْہِیْہِ - اسکی

* تاج - ** محیط -

تنخواہ کا رجسٹر میں اندراج کیا۔ اِنْفَرَضَ الْجُنْدُ - فوج نے اپنی تنخواہ یا واجبات وصول کسر لئے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ چونکہ کاٹنے سے چیز نشان زدہ اور متعین ہو جاتی ہے اس لئے اِنْفَرَضَ کوفرض اسی جہت سے کہا جاتا ہے کہ اس کے حدود اور نشانات متعین ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں عورتوں کے مہر کے لئے فَرَرِ يَضَّةٌ کا لفظ آیا ہے (۲۳۶)۔ کیونکہ اس کی متعینہ مقدار اپنے اوپر لازم کر لی جاتی ہے۔ ترکہ کے حصہ کو نَصِيْبًا مَفْرُوضًا (۲) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی مقررہ حصہ ہوتا ہے۔ سورہ نوبہ میں جہاں صدقات کی تقسیم کا اصول بیان ہوا ہے اسے فَرَرِ يَضَّةٌ مِّنَ اللّٰهِ (۹۰) کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اصول تقسیم۔ سورہ نور میں ہے سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا - (۲۴)۔ وہ سورہ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور اس میں درج شدہ احکام کوفرض ٹھہرایا گیا۔ لیکن یہ چیز کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ سارے کمال قرآن اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْفَرَضَ اَنْ (۲۸)۔ بے شک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کوفرض قرار دیا ہے۔ یعنی یہ فرض قرار دے دیا ہے کہ اس کے تمام احکام ہر پورا پورا عمل کیا جائے۔

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے۔ لَا فَرَارِضَ وَلَا بَیْکُثْرَ (۲۸)۔ بیکثر جوان کو کہتے ہیں۔ یا چھوٹی عمر والی کو۔ اس لئے فَرَارِضَ کے معنی ہوئے بڑی عمر والی۔ معمر و سن رسیدہ۔ جوہری نے کہا ہے کہ بڑی چیز یا ہر پرانی چیز کوفَرَارِضَ کہتے ہیں، کیونکہ اسی درخت کو کاٹا جاتا ہے جو پرانا اور بڑا ہو چکا ہو*۔

قرآن کریم نے جس کام کے کرنے کا حکم دیدیا ہے وہ فرض ہے اور جس سے روک دیا ہے وہ ممنوع ہے۔ لہذا فَرَضَ کے ساتھ دوسری اصطلاحات (مثلاً واجب۔ مستحب وغیرہ)۔ یا دوسری طرف، حرام کے ساتھ اس قسم کے اصطلاحات (مثلاً مکروہ تحریمی۔ مکروہ تنزیہی وغیرہ) فقہ کی اصطلاحات ہیں، قرآنی نہیں۔

سورہ تحریم میں ہے قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَکُمْ تَحْلِیْلَۃً اَیْمًا یَّکُمُ (۲۱)۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ اس قسم کی قسمیں جن میں حلال کو حرام کر لیا ہو، (کفارہ دیکر) توڑ دی جائیں۔ سورہ احزاب میں ہے مَا کَانَ عَلَی الشَّیْءِ مِّنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَہُ (۳۸)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ نے رسولؐ کے لئے مہین

کر دیا ہو ان میں درحقیقت کوئی تنگی نہیں - واضح رہے کہ یہ ایک عمومی بات ہے (جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے) - اس کا سابقہ آیت (قصہ حضرت زیدؓ) سے خصوصی تعلق نہیں -

ف ر ط

فَرَطٌ - اس مادہ میں اصل معنی سبقت کرنے اور آگے بڑھ جانے کے ہیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اسکی جگہ سے ہٹا دینے اور ایک طرف کر دینے کے ہیں - سبقت کرنے والا، دوسروں کو پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھتا ہے - الْفَرُطُ - تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے بڑھ جائے * - الْفَرَاطُ اور تَفَرُّطٌ میں فرق یہ ہے کہ الْفَرَاطُ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو زیادتی اور کمال کی سمت میں ہو، اور تَفَرُّطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو کمی کی جہت میں ہو * - فَرَطٌ عَلَيْهِ کے معنی ہیں کسی پر زیادتی کی - جلدی میں اسکے ساتھ ناروا سلوک کیا * - قرآن کریم میں ہے - اَنَّا نَخَافُ اَنْ يَّفْشُرَ طَ عَلَيْنَا (۱۶۱) - ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے - اسکے برعکس فَرَطٌ کے معنی ہیں کسی بات میں کمی کرنا - کوتاہی کرنا - اسے ضائع کر دینا - صاحب لطائف اللغة نے بھی کہا ہے کہ فَرَطٌ کے معنی ہیں کمی کرنا - اور اَفْرَطُ کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا - قرآن کریم میں ہے قَالُوا يٰحَسْبُ تَنَازُلًا عَلٰى مَافَرَطْنَا فَيَسْمَا (۱۶۲) - وہ کہیں گے ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم نے (قانون مکافات کے صحیح اندازہ لگانے میں) کس قدر کمی کی - فَرَطٌ اور اَفْرَطُ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کا خیال تک نہ کیا جائے - فَرَطَتِ السَّيْلَةُ - کھجور اور اسکے خوشے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا - اَفْرَطَ الْاَمْرَ - وہ اس بات کو بھول گیا - اس نے اس بات کو چھوڑ دیا * - قرآن کریم میں ہے وَ اَنقَضَهُمْ مُّفَرِّطُونَ (۱۶۳) - اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونگے - یعنی دوسرے لوگ ان سے آگے بڑھ جائیں گے - جنت اور جہنم میں یہ بنیادی فرق ہے - یعنی جنت میں انسان زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور جہنم میں انسان کی نشوونما رک جاتی ہے - اور وہ متحرک کی بجائے جامد ہو جاتا ہے اَلَا مَرُ الْفَرُطُ - وہ بات جس میں آدمی حد سے بڑھ جائے * - قرآن کریم

میں ہے وَاَنْ اَمْرُهُ فَرَطًا (۱۸)۔ اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔
 راغب نے کہا ہے کہ الْفَرَطُ - قصداً آگے بڑھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی
 اس میں مقصد اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے۔**

سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ زمین ہر چلنے والے جانور اور ہوا میں
 اڑنے والے پرندے، تمہاری ہی طرح امم ہیں۔ اس کے بعد ہے مَافَرَطُنَا
 فِي الْكِتَابِ مِثْلُ شَيْءٍ (۱۹) ”ہم نے کتاب میں کسی شے کی کمی
 نہیں چھوڑی“۔ سبق کے اعتبار سے یہاں الکتاب سے مراد، کتاب فطرت
 ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد خود قرآن کریم ہے تو بھی بات
 بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان ہوا ہے مکمل طور پر بیان
 ہوا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں رکھی گئی۔ اسکی تائید کئی ایک دیگر
 مقامات سے بھی ہوتی ہے۔

ف ر ع

فَرْعٌ مَّكْلٌ شَيْءٌ - ہر چیز کے بلند ترین حصے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ
 الْفَرْعَةُ - پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ فَارِعَةُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا بلند
 ترین حصہ*۔ بلندی کے علاوہ لمبائی کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔
 چنانچہ الْفَرْعُ - ہر لمبی چیز کو کہتے ہیں*۔ فَرْعُ الشَّجَرِ -
 درخت کی شاخ کو کہتے ہیں**، اس لئے کہ وہ اصل (جڑ) کے مقابلہ میں
 اونچی ہوتی ہے اور ویسے لمبی بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے
 اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۲۰)۔ اسکی جڑ مضبوط و محکم
 ہے اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔

فرعون

قدیم شاہان مصر کا لقب - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”موسیٰ“۔

ف ر غ

فَرَّغَ - فَرَّوْغًا - خالی ہونا۔ فَارَغٌ - خالی*۔ وَاصْبَحَ فَرَّادٌ
 اُمٌّ مَّوْصِلٌ فَرَّغًا - (۲۱) موسیٰ کی والدہ کا دل صبر سے خالی ہو گیا۔
 (بیچین ہو گیا)۔ فَرَّغَ لَهُ وَآلِيَهُ - ہر طرف سے فارغ ہو کر کسی کی
 طرف توجہ دینا یا اس کام کا ارادہ کرنا*۔ سورہ رحمن میں سَنَفَعُكُمْ لَكُمْ آيَةُ الْفَلَاحِ (۲۲)
 آیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اے ثقلان جب تمہاری باری آئیگی تو تمہاری طرف
 توجہ کریں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کام میں اس طرح مصروف ہے۔
 *تاج - **راغب -

فرعون کی طرف توجہ دینے کی فرستائی نہیں ہے۔

الْفِرَاقُ * - ڈول کی وہ سمت جدھر سے پانی انڈیلا جاتا ہے * - اَفْرِغْ
انڈیلنا - بہانا * - اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا (۱۳۶) - ہم پر ہمت و استقامت
فراوانی سے انڈیل دے - اَلْفِرَاقُ * - چمڑے کا بڑا وسیع حوض یا برتن * -

سورة الانشراح میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ اب جو تجھ سے ان
تمام تفکرات کو دور کر دیا گیا ہے جن سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی (یعنی
نظام خداوندی کے متشکل کرنے کی راہ میں جو مشکلات تھیں انہیں آسان کر
دیا گیا ہے) تو اب اپنے پروگرام پر جم کر عمل کر - فَاِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ
(۹۴) - یعنی آپ کے پروگرام کا پہلا حصہ جس میں قدم قدم پر مزاحمت ہوتی تھی،
اور اس لئے تعمیری کاموں کے لئے یکسوئی نہیں ملتی تھی، ختم ہو گیا ہے -
اب پورے اطمینان کے ساتھ اس پروگرام کے تعمیری حصہ پر تمام توجہات کو
مرکوز کر دیں - عام قاعدہ یہ ہے کہ جب مشکلات کا دور ختم ہو جاتا ہے تو
پھر انسان اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے - لیکن نظام خداوندی میں کیفیت یہ ہوتی ہے
کہ جب تخریبی پروگرام کے ابتدائی مراحل ختم ہوتے ہیں اور مخالفتوں پر
قابو پا لیا جاتا ہے تو پھر اس پروگرام کا تعمیری حصہ شروع ہوتا ہے - اور
اس میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے - یہ تعمیری پروگرام، پسوری
انسانیت کی نشو و نما پر مشتمل ہوتا ہے - یہ کوئی چھوٹا کام نہیں -

ف ر ق

الْفَرَقُ * - سر کی سانگ جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے
سے الگ ہو جاتے ہیں - یہ ہیں اس کے بنیادی معنی - ابن فارس نے کہا ہے کہ
اس مادے کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا اور الگ کر
دینا ہیں - اَلْفَرَقُ * - مانگ نکالنے کی جگہ - اَلْفَرَقُ الطَّرِيقُ - راستہ
کی وہ جگہ جہاں سے اس میں سے نیا راستہ پہنٹا ہو - اَلْفَرَقُ * - وہ بدلی جو
دوسری چھائی ہوئی بدلیوں سے الگ ہو کر برے - اَرْضُ فَرَقَةٍ * - وہ زمین
جس کے پودے ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں * -

اس اعتبار سے اَلْفَرَقُ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کرنا - فیصلہ
کرنا - بات کہو واضح طور پر الگ الگ کر کے بیان کرنا - فَرَقَ لَّهِ
الطَّرِيقَ * - اس کے لئے دو راستوں میں سے صحیح راستہ واضح ہو گیا - فَرَقَ
لَّهِ اَسْرًا * - بات واضح ہو گئی اور اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی * -
فَرَقَهُ * - اسے الگ کیا -

الْفَرَقُ* اور الْفَرَقُ* - ایک پیمانے کو کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا - اس سے فَرَقَ کے معنی ہیں اس نے پیمانے (ہرتن) سے ہانی پیا* - الْفَرَرِيقُ* - اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو جائے - تَفَرَّقَ کے معنی ہیں فساد کی غرض سے الگ الگ کر دینا - انشمار و تفرق پیدا کر دینا* - الْفَرِيقُ* - الگ ہو جانے والا ٹکڑہ (۲۶) - الْفَرِيقَةُ* - جماعت - گروہ (۱۲۲) -

قرآن کو فَرَقَانُ* - کہا گیا ہے (۳۰) - اس اعتبار سے کہ یہ غلط اور صحیح (حق و باطل) کو بالکل الگ الگ کر دیتا ہے - اور یا اس لئے کہ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر شے کی قیمت ماپی جاتی ہے - یعنی مستقل اقدار کا مجموعہ - کتاب موسیٰ* کو بھی فَرَقَانُ* کہا گیا ہے - (۲۵ و ۲۸) - خدا کی وحی فَرَقَانُ* ہوتی ہے - یعنی وہ حق و باطل میں فرق کر دیتی ہے - یَسُومُ الْفَرَقَانِ (۸۱) - اس سے جنگ بدر کا دن مراد لیا جاتا ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا -

سورۃ انفال میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی تو یَجْعَلُ لَّكُمْ فَرَقَانًا (۳۹) - اللہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا - مومن ، دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے کے لئے آتا ہے - ایسی بلند کردار کی زندگی جسے دیکھ کر ہر شخص ہکا بکا اٹھے کہ یہ عام انسانوں سے ممتاز انسان ہے - مومن کی زندگی ، حق و باطل میں امتیاز کا معیار ہونی چاہئے - دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان - قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملت واحدہ) بنایا ہے - اسی جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود، قرآن کریم کے واضح الفاظ میں شرک ہے (۳۲) - اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں (۳۴) جن سے اللہ اور رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا - (۶۱) - قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی - وحدت خالق کا عملی ظہور وحدت امت (بالکے وحدت انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے - لہذا جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے - امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے - امت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے ، اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں ، اور یہ شرک ہے -

سورۃ توبہ میں قَوْمٌ * یَفْرَقُونَ آیا ہے (۵۶)۔ راغب نے فَرَقَ کے معنی خوف سے دل کا منتشر ہونا کئے ہیں۔ یعنی خوف سے بدحواس ہو جاتے ہیں*۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوف زدہ لوگ ہیں جن سے امن نے مفارقت کر لی ہو۔

فَارَقَ - چھوڑ دینا۔ علیحدہ ہو جانا۔ قَارِ قَوْمُ هُنَّ (۵۶)۔ ان سے الگ ہو جاؤ۔

ف ر ا

فَرَّه - یَفْرَهُ - حاذق اور ماهر ہونا۔ چست اور پھرتیلا ہونا۔ حسین و جمیل ہونا۔ اس سے اسم فاعل قَارَهُ آتا ہے، اس کی جمع قَارٍ هُوْنَ اور قَارٍ هِیْن ہے۔ الْفَارِ هَمَّ - حسین و ملیح نوجوان لونڈی۔ نیز بہت زیادہ کھانے والی کو بھی کہتے ہیں۔ فَرَّاعٌ نے کہا ہے کہ فَرَّه میں هاء دراصل حاء کی جگہ ہے۔ یعنی فَرَّح - جس کے معنی اکڑنا اور اترا کر چلنا ہیں**۔ قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے وَ تَنْحِثُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَرَّ هِیْن (۲۶)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تم بڑی مہارت سے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں محلات اور قلعے بناتے ہو، اور دوسرے معنی یہ کہ تم پہاڑوں میں اتنے اتنے بڑے مکانات بناتے ہو جن پر تمہیں خاص طور پر فخر ہوتا ہے۔ اور اگر دونوں معانی کو یک جا سامنے رکھا جائے تو اس سے مراد ایسی حسین و جمیل عمارات ہونگی جنہیں نہایت صنعت کاری اور فخر کے ساتھ بنایا جائے۔

ف ر ی

الْفَرَّی - کھال (یا کپڑے) کو کاٹنا (یا پھاڑنا)، درست کرنے اور سینے کے لئے۔ اور اَلْفَرَّاءُ - اسے خراب کرنے کے لئے کاٹنا یا پھاڑنا۔ اَلْفَرَّاءُ - کتیریونت کر کے کچھ کا کچھ بنا دینا۔ یہ اصلاح اور فساد دونوں کے لئے آتا ہے، لیکن اس کا زیادہ استعمال خرابی ہی کے معنوں میں ہوتا ہے***۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں افتراء جھوٹ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔

الْفَرَّی - گھڑی ہوئی بناوٹی بات۔ عظیم اور اہم بات۔ نیز حیرت انگیز اور عجیب سی بات کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں هُوَ یَفْرِی الْفَرَّی -

*راغب - **تاج و محیط و راغب - ***تاج و راغب

وہ حیرت انگیز اور تعجب خیز کام کرتا ہے*۔ سورۃ مریم میں ہے کہ ہیکل کے پیشواؤں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۱۹)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ تو نے یہ عجیب حرکت کی ہے کہ رسم و آئین خانقاہیت کے خلاف راہبہ بن کر متاہل زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ اور دوسرے معنی یہ کہ انہوں نے خود حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کہا کہ وہ عجیب و غریب سا بچہ ہے جسے حضرت مریمؑ لے کر آئی ہے۔ اَلْفَرَى - حیران اور مبہوت ہو جانے کو کہتے ہیں (ابن فارس)۔ اَلْمُفْتَرِی - افتراء کرنے والا۔ کتربیونت کر کے کچھ کا کچھ بنا دینے والا۔ قَالُوا لَإِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ (۱۶)۔ اور مُفْتَرٍ (۲۸) بنایا ہوا۔ افتراء کیا ہوا۔ اَلْفَتْرَى عَلٰی - کسی کے خلاف بہتان تراشنا۔ کوئی بات خود وضع کر کے اسے کسی اور کی طرف منسوب کر دینا۔ (۳۰)۔

ف ز ز

فَزَّةٌ مِّمَّنْ لَّآئِمًا عَنِ النَّوَاسِیْ - فلان آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔ فَزَزَتْ عَنْهُ - وہ اس سے الگ ہو گیا۔ ایک طرف ہٹ گیا۔ فَزَزَ الْفَلَّاحُ یَفْرِزُ - ہرن گھبرا گیا*۔ اِسْتَفَزَّہُ - اسے اس کے گھر سے نکال دیا اور بے قرار کیا۔ اسے ہلکا اور بے وزن سمجھا، یا اسے ہلایا اور اپنے ساتھ رکھنا چاہا۔ اِسْتَفَزَّہُ الْخَوْفُ - اسے خوف نے پریشان کر دیا، اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور اپنے ساتھ لئے لئے بھرا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے کے ہیں۔ لہذا اس لفظ کے معنوں میں دل کا اضطراب بھی شامل ہے اور محسوس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانا بھی۔ ہلکا ہو کر اپنے مقام سے اکھڑ جانا دونوں میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی کسی کو گڑبڑا دینا اور اس طرح اسے اس کے مقام سے اکھیڑ دینا۔ قرآن کریم میں ابلیس سے کہا گیا ہے کہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَاعْتَ مِنْهُمْ (۱۶)۔ ان میں سے جس پر تیرا زور چل سکے اسے گڑبڑا کر اس کے صحیح مقام (یا راستہ) سے ہٹا دے۔ فرعون کے متعلق ہے۔ فَتَارَادَ اَنْ یَّسْتَفْزِزَہُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۶)۔ اس نے چاہا کہ انہیں گڑبڑا کر ان کے مقام سے اکھیڑ ڈالے**۔ نیز اس کے معنی کسی کی تاک میں رہنے اور دھوکہ دے کر اسے ہلاکت میں ڈال دینے کے بھی آتے ہیں***۔

*تاج و محیط - **تاج و راغب - ***تاج -

ف ز ع

الْفَزَعُ: گھبراہٹ۔ ڈر۔ بیتردد نے اپنی کتاب کامل میں لکھا ہے کہ اصل میں فَزَعٌ خوف کہہ سکتے ہیں۔ پھر کنایۃً دشمن وغیرہ کے اچانک حملہ سے مدافعت کے لئے لوگوں کا تیزی سے باہر نکلنا بھی فَزَعٌ کہلانے لگا۔* راغب نے کہا ہے کہ فَزَعٌ اس انقباض اور وحشت و پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک چیز کی وجہ سے واقع ہو۔**۔ الْفَزَعُ: کسی سے فریاد کرنا۔ اور کسی کی فریاد رسی کرنا۔ دونوں معنی آتے ہیں (اضداد میں سے ہے)۔ فَزَعٌ اَلَيْهِمْ: اس نے ان سے فریاد کی۔ مدد مانگی۔ فَزَعَهُمْ: اس نے ان کی مدد کی۔ ان کی فریاد رسی کی۔ اَفْزَعَهُمْ کے بھی یہی معنی ہیں۔ نیز اس کے معنی انہیں ڈرایا اور ان سے ڈر کو دور کیا، بھی ہیں۔ فَزَعَهُ: اس نے اسے ڈرایا اور گھبرا دیا۔ فَزَعٌ عَنْهُ: اس سے خوف اور گھبراہٹ کو دور کر دیا*۔ (یعنی اس میں سلب ماخذ کا خاصہ ہے)

قرآن کریم میں ہے لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ (۲۱۱)۔ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں کبیدہ خاطر نہیں کر سکیگی۔ سورۃ النَّمَل میں ہے۔ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ اٰمِنُونَ (۸۹)۔ وہ اس دن گھبراہٹ سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اسی سورۃ میں ہے۔ فَفَزَعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (۸۷)۔ کائنات کی ہر چیز گھبرا اٹھیگی۔ سورۃ سبا میں ہے۔ حَتّٰى اِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ (۲۳)۔ جب ان کے دل سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی۔

ف س ح

اَلنَّفْسُحَّةُ: اَلنَّفْسُحَّةُ: وسعت اور فراخی۔ فَسَّحَ الْمَكَانُ: جگہ وسیع ہو گئی۔ اَلنَّفْسُحَ صَدْرُهُ: اسکا سینہ کھل گیا۔ انشراح صدر ہوا۔ فَسَّحَ لَهُ فِي الْمَجْلِسِ: اس نے محفل میں اس کے لئے جگہ کر دی*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا قِيْلَ لَهُ لَكُمْ تَنَسَّعُوا فِي الْمَجَالِسِ فَانْفَسَحُوا يَنْفَسِحِ اللّٰهُ لَكُمْ (۵۸)۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھ جایا کرو۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی اور وسعت پیدا کر دے گا۔

ف س د

فَسَادَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا مضمحل ہو جانا۔ اس کا اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہنا۔ لَحْمٌ فَاسِدٌ اس گوشت کو کہتے ہیں جو گل سڑ کر بدبودار ہو گیا ہو اور کسی کام کا نہ رہا ہو۔ فَسَادٌ درحقیقت صَلَاح کی ضد ہے۔ صَلَاح کے معنی ہیں حالات کا مستقیم و متوازن رہنا۔ لہذا فَسَاد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جانا*۔ [اس کے واضح مفہوم کے لئے ص۔ ل۔ ح کا عنوان دیکھئے کیونکہ جب تک صَلَاح کا صحیح تصور ذہن میں نہ آئے اس کی ضد (فَسَاد) کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا]۔

قرآن کریم نے مُفْسِدِیْنَ کے مقابلہ میں مُصْلِحِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے (۲/۱۱)۔ حرث و نسل کے تباہ کر دینے کو بھی فَسَاد قرار دیا ہے (۲/۵)۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا۔ معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا۔ یہ سب فَسَاد ہے (۲/۸۵ ; ۲/۱۸۳)۔ صالح نظام کو درہم برہم کر دینا۔ صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَاد ہے (۲/۳۴)۔ ارتکاب جرم کو بھی فَسَاد سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۲/۱۳)۔ فَسَاد درحقیقت معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے کا نام ہے، خواہ اسکی شکل کوئی بھی ہو۔ اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ (۲/۲۴)۔ نیز ”حکمت فرعونی“ کا بھی یہی شیوہ ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کر کے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رہیں (۲/۲۸)۔ منشاء خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے۔ (۲/۶۰)۔

سورہ شعراء میں مُسْرِفِیْنَ کو مُفْسِدِیْنَ کہا گیا ہے (۱۵۱-۵۴) اور سورہ قصص میں یہ لفظ أَحْسَن کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۵)۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ ملائکہ نے کہا کہ آدم ارض میں فساد مچائیگا اور خوں ریزیاں کریگا۔ اس کے برعکس، نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۱)۔ ہم تیری مشیت کے ہر و گرام کو سزاوار حمد و ستائش بنانے کے لئے ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے جہانتک بھی جانا پڑے جاتے ہیں۔

* محیط - تاج - لین۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ نے جمو پروگرام انسانوں کے لئے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے، اسکی خلاف ورزی کرنا فساد^{*} ہے۔ اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بد نظمی (Disorder)۔ کائنات کا یہ عظیم القدر اور مجیر العقول سلسلہ اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے۔ اگر اس میں متعدد ”خداؤں“ کا اقتدار کار فرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۴)۔ انسانی زندگی بھی اسی حسن و خوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطہ^{*} واحد کے ماتحت بسر کی جائے۔

ف س ر

الْفَسْرُ - واضح کرنا۔ چھپی ہوئی چیز کو کھول دینا۔ فَسْرٌ - يَفْسِرُ اور يَفْسُرُ - واضح کرنا۔ فَسْرٌ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن اس میں مبالغہ کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ التَّفْسِيرَةُ - فارورہ کا امتحان (Test) کرنا^{*}۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق کہا ہے وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۲۵)۔ اسکی نہایت عمدہ وضاحت اور تشریح خود خدا نے کر دی ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتِهِ (۱۹) اسے ظاہر اور واضح کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر و توضیح، تصریف آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی ایک بات کو مختلف آیات میں پھیر پھیر کر بیان کرنے سے۔ (۱۶۰۶-۱۵۰۶)۔ اس لئے قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے ہوگی۔ اور اس کے دعاوی کی تائید اور شہادت کائنات کے نظم و نسق اور تاریخی شواہد سے۔ یا اس کے نظام کو عملاً مشکل کرنے سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں، ان سے۔

ف س ق

فَيْسَقٌ - دائرہ حق سے باہر نکل جانا۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قَيْشَرٍ هَا - گدڑی کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل گئی۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ پھل نشوونما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے (یہی صورت ہر پھل کے ساتھ ہوتی ہے)۔ وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (Pattern) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے

چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنی پختگی تک نہیں پہنچتا۔
 عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے فَسَقَتِ الرَّطَبَةُ عَنِ قِشْرِهَا
 کہتے تھے۔ جاہلیت عرب میں یہ لفظ اسی مفہوم کے ادا کرنے کے لئے بولا
 جاتا تھا۔ انسانوں کے لئے نہیں بولا جاتا تھا*۔ قرآن کریم نے اسے انسانوں
 کے لئے استعمال کیا۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا زندگی کا قالب
 عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح نشو
 و نما ہو جاتی ہے۔ جو فرد (یا گروہ) اس نظام کے قالب سے باہر نکل جائے
 اسے فاسق^۱ کہتے ہیں۔ اس کی صحیح نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہر شخص
 جو قانونِ خداوندی کے دائرے سے باہر نکل جائے وہ فاسق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں
 یہ لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے وہاں اسکی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ اَلَّذِينَ
 يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِمْ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ
 بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۲۴۰-۲۴۱)۔ یعنی فاسقین وہ
 ہیں جو اللہ سے پختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کو ملانے کا
 خدا نے حکم دیا ہے (یعنی نوعِ انسانی کا رشتہ) اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے
 کر دیتے ہیں۔ اور انسان کی تمدنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔
 اسی طرح ذرا آگے چل کر ظالمین کو بھی فاسقین^۲ کہا گیا ہے
 (۲۴۶)۔ اور کافرین کو بھی (۲۴۹)۔ نیز معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے گریز
 کی راہیں نکالنے والوں کو بھی (۲۸۱)۔ سورۃ المائدہ میں فاسق کا لفظ احکام
 خداوندی کی خلاف ورزی کے لئے بولا گیا ہے خواہ وہ حکم چھوٹا ہو یا بڑا
 (۳۰)۔ یعنی ہر مجرم فاسق ہے۔ اس لئے کہ کھجور کے چھلکے میں ذرا
 سا شگاف بھی پھل میں نقص پیدا کر دیتا ہے۔ مومن اور فاسق ایک دوسرے
 کی ضد ہیں۔ (۳۰۶)۔

سورۃ بقرہ میں ہے۔ ”لَا فَسْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ“۔
 (۲۴۰)۔ اسکے عام معنی گالی گلوچ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم یہی
 ہے کہ حج میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کرنی چاہئے جس سے انسان صحیح
 راستے سے ذرا بھی اُدھر اُدھر ہو جائے۔ ایک دوسرے سے سخت کلامی اور
 منب و شتم بھی اس کے اندر آجاتے ہیں۔

ف ش ل

فَشِيلَ - يَفْشُلُ*۔ کمزور اور بزدل ہو جانا*۔ اصل میں اَلْفِشْلُ*
 ہودج کے پردے کو کہتے ہیں جس کے پیچھے ہورتیں بیٹھتی ہیں، یا وہ گدا
 * تاج و محیط۔

جسے ہودج میں بچھا کر اس پر عورتیں بیٹھتی ہیں۔ اسلئے فُتْشِلَ کے معنی ہوئے عورتوں کی طرح بزدل ہو جانا۔ اَلْيَدُ الْفُتْشَلَاءُ۔ ہائیں ہاتھ کو کہتے ہیں جو عموماً (دائیں کی نسبت) کمزور ہوتا ہے۔ **۔ (یہ عوام کی بولی ہے، فصیح نہیں)۔ اس لئے فُتْشِلَ میں کمزوری کے ساتھ بزدلی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ***۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا (۲۶)۔ آپس میں چھینا جھپٹی (تنازع اور جھگڑا) مت کرنے لگ جاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ گے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ تَفْشَلُ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہ پڑا۔ اس سے بھی کمزوری اور عدم استحکام کا مفہوم واضح ہے، یعنی قوتوں کے بیکار ضائع ہو جانے سے کمزور ہو جانا۔

ف ص ح

اَلْفَصْحُ۔ واضح اور ظاہر ہونا۔ آئمہ اشتقاق نے کہا ہے کہ اس ترکیب میں ”ظہور“ یعنی ظاہر ہونے کا مفہوم مضمحل ہوتا ہے۔ ایسی زبان جس سے مطلب بالکل ظاہر اور واضح ہو جائے فَصِيحٌ کہلائیگی۔ نیز وہ آدمی بھی فَصِيحٌ کہلائیگا جو بات کو واضح اور کھول کر بیان کرے اور اس کے بیان میں کوئی نقص اور خامی نہ ہو۔ اَلْفَصَاحَةُ بات کا واضح اور صاف ہونا۔ خوش بانی۔ اَفْصَحَتِ الشَّاةُ۔ (پیوسی)۔ یعنی بچہ دینے کے بعد ایک دو دن تک جس قسم کا دودھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد (بکری نے) صاف دودھ دیا۔ اَفْصَحَ الصَّبِيحُ۔ صبح روشن اور نمودار ہو گئی۔ فَصْحٌ اس دودھ کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر سے جھاگ اتار کر بالکل صاف کر لیا جائے۔ اس لئے کسی چیز کو ان چیزوں سے صاف کر دینا جو اس میں بالعموم مل جاتی ہیں اَلْفَصْحُ کہلاتا ہے۔ ****۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کا قول (حضرت ہارونؑ کے متعلق) ہے۔ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي (۲۶)۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

ف ص ل

اَلْفَصْلُ۔ دو چیزوں کے درمیان روک جو یہ بنا دے کہ یہاں تک پہلی چیز ختم ہو گئی اور اسی کے بعد دوسری چیز شروع ہو گئی (لِطَائِفِ اللُّغَةِ)۔

تاج۔ **محیط۔ ***راعب۔ ****تاج و محیط و راعب۔

دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح الگ کر دینا کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور اس طرح ایک دوسری سے الگ اور متمیز ہو جائے*۔ اَلْفَصْلَةُ - اس موتی کو کہتے ہیں جو دو موتیوں کے درمیان امتیاز کے لئے ڈال دیا جائے۔ اَلْمَفْصِلُ - جسم کے جوڑے - نیز ہمارے ہاتھوں کے درمیان کی جگہیں جن سے ہانی بہتا ہے۔ فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۰) - فیصلہ کن بات - اَلتَّفْصِيلُ - جدا جدا کر دینا۔ واضح کر دینا، متمیز کر دینا۔ آیات مُفَصَّلَاتٌ - واضح آیات - اَلْاِنْفِصَالُ - انقطاع - جدا ہو جانا۔ فِصَالٌ - بچے کا دودھ چھڑانا*۔ (۲۳۴) - فَصْلُ الشَّيْءِ - چیز کو الگ الگ حصوں میں منقسم کر دینا۔ فَصْلُ الْكَلَامِ - کلام کو واضح کر دینا۔ کھول کر بیان کر دیا**۔ فَصِيلَةُ الرَّجُلِ - خاندان (۱۱۳) - فَصْلُ مَرْنِ الْبَلَدِ - وہ شہر سے روانہ (جدا) ہو گیا*۔ (۲۳۹) -

قرآن کریم کے متعلق تَفْصِيلُ الْكِتَابِ (۱۳۰) - نیز اَلْكِتَابِ مُفَصَّلًا (۱۱۵) کہا گیا ہے۔ عام طور پر تفصیل کے معنی (Details) لئے جاتے ہیں اور مفصل کے معنی (Detailed) - اس لئے جب قرآن کریم کو مُفَصَّلٌ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس میں تمام باتوں کی تفصیل (Details) دی ہوئی ہیں۔ لیکن، جیسا کہ اوپر دیکھا جا چکا ہے، تَفْصِيلُ کے معنی وضاحت ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح - یعنی جس میں ہر بات نکھار کر اور الگ الگ کر کے (Distinctly) بیان کی گئی ہو***۔ قرآن کریم ایک واضح کتاب ہے جس کے مطالب میں کوئی ابہام (Confusion) نہیں۔ لیکن اس میں تمام امور کی تفصیل (Details) نہیں دی ہوئیں۔ اس نے (بجز چند احکام کے) اصولی قوانین بیان کئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان اصولی قوانین کی تفصیل و جزئیات قرآنی نظام کو قائم کرنے والی جماعت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، خود طے کر رہی۔ ان تفصیل میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ مناسب رد و بدل ہوتا رہے گا لیکن قرآن کریم کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے۔ یہی اَلْمَدْرِسُ الْقَدِيمُ ہے (۱۱۳) اور یہی مستقل اقدار۔ كُتُبٌ قَدِيمَةٌ (۱۱۸)۔

پھر سمجھ لیجئے کہ تَفْصِيلُ کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح اور صاف، متمیز، نکھرا ہوا - (Distinct) نہ کہ (Detailed) - یعنی ایسا جس میں ہر اصولی حکم کی جزئیات تک بھی دی گئی ہوں۔

ف ص م

فَصَّمْ - کسی چیز کو اس طرح توڑ دینا کہ وہ دو ٹکڑے نہ ہو بلکہ جڑی رہے۔ یہ لفظ بالعموم ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب کسی کڑی یا حلقے کا منہ کھل جائے لیکن وہ ٹوٹے نہیں۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اَلْفَصْمُ یہ ہے کہ کوئی چیز صرف تڑخ جائے اور وہ جدا نہ ہو۔ اور اَلْفَصْمُ - اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اِنْفَصَمَ - ٹوٹ گیا۔ کٹ گیا*۔

سورة بقرہ میں خدا پر ایمان کے متعلق ہے کہ یہ اس قابل اعتماد قانون حیات پر ایمان ہے، لَا اِنْفِصَامَ لَهَا (۲۵۶)۔ جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں تڑخ تک بھی نہیں آسکتی۔ اس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ف ض ح

أَلَا فَضَحْ - ایسی سفید چیز جسکی سفیدی شدید نہ ہو۔ اَفْضَحَ الصُّبْحُ - صبح ظاہر اور روشن ہو گئی۔ چنانچہ اَلْفَضْحُ خود صبح کو کہتے ہیں۔ اس سے فَضَحَتْ فَضْحًا کے معنی ہوتے ہیں کسی کے عیب کو ظاہر کر دینا۔ اَفْضَحَ کے معنی ہیں آدمی کا کسی برے کام کو کرنا اور اس کے ساتھ مشہور ہو جانا۔ اسکی برائیوں کا کھل جانا۔ اَلْفَضِيحَةُ - رسوائی کو کہتے ہیں۔ یعنی برائیوں کا کھل جانا**۔

قرآن کریم میں یہ لفظ رسوا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَتَلَا تَفْضَحُونَ (۱۵۸)۔ تم میری فضیحت نہ کرو۔ مجھے رسوا نہ کرو۔ یعنی لَا تُخْزُونِ (۱۵۹) مجھے شرمندہ نہ کرو۔

ف ض ض

اَلْفَضُّ - بکھیر دینا۔ مجتمع ہونے کے بعد متفرق کر دینا۔ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اِنْفَضَّ - ٹوٹ کر بکھیر جانا، متفرق ہو جانا۔ فَضَّ مِنَ النَّاسِ - متفرق لوگ*۔

سورة آل عمران میں ہے لَا تَنْفَضُّوا مِّنْ حَوْلِيْكَ (۳۸)۔ وہ تیرے ارد گرد سے بکھیر جائے۔ تجھ سے الگ ہو جائے۔ سورة جمعة میں ہے..... اِنْفَضُّوا لَهَا (۱۲)۔ (مجمع کو چھوڑ کر) اس چیز کی طرف متفرق و منتشر ہو کر چل دیتے ہیں۔

* تاج - ** تاج و محیط - * راغب -

فِضَّةٌ* - چاندی (۱۳۳) - فَضْضُ الشَّيْءِ* - کسی چیز پر چاندی چڑھائی۔

ف ض ل

الْفَضْلُ* - نقص (کمی) کی ضد ہے - راغب نے کہا ہے کہ فَضْلٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا متوسط ضرورت سے زائد ہونا - فَضْلٌ زیادہ تر اچھی باتوں میں استعمال ہوتا ہے - اور فَضُولٌ بری باتوں میں - الْفَضِيلَةُ* کے معنی مرتبہ کی بلندی اور برتری کے ہیں - (یہ تَقِيصَةٌ* کی ضد ہے -) یعنی بھلائی کی کثرت اور زیادتی - تَفَضَّلَ عَلَيَّهِ* - وہ اس سے فضیلت و برتری میں بڑھ گیا - یا اس کے معنی ہیں اس نے اس پر احسان کیا اور اپنے زیادہ مال سے اسے دیدیا - فَوَاضِلُ الْمَالِ - مال کا منافع - مثلاً زمین کی پیداوار، جانوروں کا کرایہ، دودھ یا اون وغیرہ*۔

قرآن کریم میں یہ مادہ باب تفعیل سے فضیلت دینے کے معنوں میں آیا ہے - وَفَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ* (۲۴) میں نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت اور برتری عطا کی - رسول اللہ* کو وحی کے وہی طور پر ملنے کو بھی فَضْلٌ* کہا گیا ہے - (۹۰) - لیکن عام طور پر یہ مادہ معاشی خوش حالی کے معنوں میں آیا ہے - مثلاً لِيَتَبَتَّغُوا مِنْ فَضْلِيهِ* (۱۱) کے معنی ہیں تلاش معاش - میدان جنگ کی فتوحات کو بھی فَضْلٌ* کہا گیا ہے (۱۳۳) - مصائب اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے (۲۳۳) - اور فَحْشَاءٌ* (بخل) کے مقابلہ میں بھی (۲۶۸) -

لہذا فَضْلٌ* کا عمومی مفہوم زندگی کی خوش حالیوں اور معاشی فارغ البالیوں میں جن کے حاصل کرنے کی مؤمنین کو تاکید کی گئی ہے (۱۲) - سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۱۸۱-۱۸۸) میں اس مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، جہاں مختلف روش پر چلنے والی قوموں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ - دیکھو ہم نے کس طرح ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ خوش حالیوں عطا کی ہیں - یہ اس کا عمومی مفہوم ہے - خصوصی مفہوم ہر وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ملی جس میں وحی بھی شامل ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے - تمام قومی امتیازات اور ملی سرفرازیوں خدا کا فضل ہیں - اور اپنی ہم عصر اقوام کے مقابلہ میں ممتاز پوزیشن کا حاصل ہو جانا بھی اسکی نعمت ہے (۲۴) -

سورۃ النحل میں ہے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔
یعنی جہاں تک رزق کمانے کی استعداد کا تعلق ہے وہ مختلف انسانوں میں
مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کو خدا نے زیادہ
استعداد دی ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اس استعداد سے جس قدر زیادہ کمالیے وہ
اس کا مالک ہے اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ فَمَا الَّذِي فَضَّلُوا
بِرَّادٌ یَّیْ رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاُولَٰئِكَ فِيْهِ سَوَآءٌ۔
جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے وہ زائد رزق کو اپنے ساتھیوں کی
طرف نہیں لوٹاتے اس خیال سے کہ اس طرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ
میں سب مساوی ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ
اَفَبِیْعْمَتِهِ اللّٰهُ يَجْعَلُ لَّہٗ ذٰلَکَ (۱۱)۔ یہ لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار
کرتے ہیں۔ یعنی زیادہ رزق کمانے کی استعداد، خدا کی طرف سے بلا معاوضہ
ملی تھی۔ یہ لوگ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی واحد ملکیت قرار دیکر
اس حققت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملی تھی۔

یہ آیت (اور اسی قسم کی دیگر آیات) مثلاً ۱۱۱ : ۲۳ : ۱۱۱ : ۲۳ : ۱۱۱ : ۲۳
وغیرہ) قرآن کریم کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ اس نظام کی رو سے
ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ مؤمنین کا فریضہ یہ
ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کسے کمائیں اور اپنی ضرورت سے زائد
رزق دوسرے لوگوں کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ (تفصیل ان اسور
کی میری کتاب نظام و بیویٹ میں ملے گی)۔

ف ض و

اَلْفَضَاءُ۔ رحن۔ وسیع زمین۔ وسیع جگہ*۔ اَلْفِضَاءُ۔ ہانی چو
زمین پر بہ رہا ہو*۔ اَفْضٰی فَلَانَ اِلٰی فَلَانَ۔ فلاں آدمی فلاں تک
پہنچ گیا*۔ اسی سے کنایہ اَفْضٰی الرَّجُلُ اِلٰی الْمَرَاۃِ عورت سے
جماع کرنے کے لئے ہوا جاتا ہے۔ اَلْاَفْضَاءُ دو حقیقت آخر تک پہنچنے
کو کہتے ہیں اور بہ کنایہ ہے خاوت اور مباشرت سے*۔ وَقَدْ اَفْضٰی
بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (۱۱) میں یہی مفہوم ہے۔ یعنی آزاد فضا میں بے
روک ٹوک ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

ف ط ر

اَلْفَطْرُ۔ بھاڑنا۔ تنق کرنا۔ پہلی مرتبہ بھاڑنا۔ (پہلی مرتبہ کی
خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں داخل ہے) چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتا ہے کہ
*ناج۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ فطائر السموات وَالْأَرْضِ کیا ہوتا ہے، حتیٰ کہ میرے پاس دو اعرابی (بدو) آئے جو ایک کنوین کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فَطَرْتُہَا۔ یعنی اس کے کھودنے کی ابتداء میں نے کی تھی۔ لہذا فَطَرْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے اَنَا أَوَّلُ مَنْ فَطَرَہَا۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اس کی ابتداء کی ہے*۔ اس لئے فطائر السموات وَالْأَرْضِ (۱۳) کے معنی ہیں وہ خدا جس نے پہلی مرتبہ کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اسی کو بَدِیْعُ السموات وَالْأَرْضِ کہا گیا ہے (۱۴)۔ سورہ ہنسی اسرائیل میں فَطَرْتُكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۵) کہہ کر اسکی وضاحت کر دی۔ لہذا فِطْرَۃ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق۔ وہ قانون بنا طریقہ جس کے مطابق اس نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ فطرت کے معنی عام طور پر (Nature) کے لئے جاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں انسان کی فطرت یہ ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے ایسی خصوصیتیں جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں اور جو بدلی نہ جا سکتی ہوں۔ لیکن لفظ فطرت کا یہ مفہوم بعد کی پیداوار ہے۔ جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو اس میں (Nature) کا لفظ آیا۔ اس لفظ کا ترجمہ ”فطرت“ کے لفظ سے کیا گیا اور اس طرح جو مفہوم لفظ (Nature) کا تھا وہی مفہوم لفظ فطرت کا ہو گیا۔

نیچر (Nature) کے بھی دو مفہوم ہیں۔ ایک تو وہ قوانین جو کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ انہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور ہر شے کے اندر رکھ دئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ فطرت کے اس مفہوم میں کوئی حرج نہیں۔ اس مفہوم کے رو سے حیوانات کی جبلت (Instinct) کو بھی ان کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت۔ یہاں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ انسان میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا ہے۔ یعنی اس کا جسمانی نظام کم و بیش وہی ہے جو حیوانات کا ہے۔ لہذا جو قوانین اس کے جسمانی نظام سے متعلق ہیں انہیں قوانین فطرت کہہ دینے میں بھی کچھ حرج نہیں۔ یعنی

وہ قوانین جن کے مطابق انسان کی طبعی زندگی کی مشینری چل رہی ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ افزائش نسل۔ بیماری۔ موت۔ وغیرہ۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر غصود ”انسان“ کی فطرت کا تصور سامنے لایا جاتا ہے تو یہ چیز محل نظر اور قابل اعتراض ہو جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اسی فطرت کے مطابق دین ہے۔ یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کسی دوسری روش پر چل پڑتا ہے۔ یعنی اگر کسی انسانی بچہ کو خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔ یہ بات بالبداهت غلط ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیں جہاں کوئی اور انسان نہ ہو اور وہیں اسکی پرورش ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑا ہو کر بالکل جانور بن جائیگا۔ چنانچہ اس قسم کے کئی بچے ملے ہیں جن کی پرورش جانوروں کے اندر ہوئی۔ وہ بالکل جانوروں کی مانند تھے۔ اسوقت (۱۹۶۰ میں) اس قسم کا ایک بچہ ہندوستان کے ایک ہسپتال میں زیر علاج اور زیر مشاہدہ ہے۔ یہ بالکل حیوانوں کی سی عادات و خصائص رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ اگر انسان کو اسکی ”پیدائشی فطرت“ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور ہوگا۔ لہذا اگر یہی وہ ”فطرت اللہ“ (خدا کی فطرت) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ تو کوئی قابل شرف بات نہیں۔ (نیز خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اسکی ”بہی“ ”فطرت“ ہے بڑی گستاخی ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود قرآن کریم نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ”فطرت اللہ“ کے مظاہرے نہیں ہو سکتے۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کچھ اس انسان کے متعلق کہا ہے جو وحی کی راہ نجاتی میں نہیں چلتا بلکہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے)۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ خَلِیْقٌ هَلُوْغًا (۹۰)۔ انسان بڑا ہی بے صبرا ہے۔ اسکی نیت ہی نہیں بھرتی۔ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً (۹۱)۔ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ قَتِیْلٌ الْاِنْسَانُ مَنَّا کَفُوْرًا (۹۲)۔ بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ شَیْءً جَدُوْلًا (۹۳)۔ اکثر باتوں میں جھگڑتا رہتا ہے۔ فَاَرْذَلُوْا خَصِیْمَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹۴)۔ بڑا ہی جھگڑالو ہے۔ یہ کچھ قرآن کریم نے ”الانسان“ کے متعلق کہا ہے۔ اگر یہ مانا جائے

کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، تو اس سے خود ”خدا کی فطرت“ کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ (نعوذ باللہ) بڑا گھناؤنا ہے۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال اس قدیم تصور سے متاثر ہو کر پیدا ہوا جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ ”خدا نے آدم کو اپنی شکل پر ڈھالا تھا“۔

اسی (غلط) تصور کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ہے جو اسے نیکی اور ہدی کا علم دیدہی ہے۔ ایسے ”انسانی فطرت“ کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی فطرت خود خدا کی فطرت ہے اس لئے اس کے اندر کی آواز، خود خدا کی آواز ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق (Absolute right) اور مطلق باطل (Absolute wrong) میں تمیز کر دے۔ اگر یہ قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی تو پھر انسانوں کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ چیز حیوانوں تک تو چلی آتی ہے۔ یعنی حیوانات وغیرہ کو ان کے قرائض اور وظائف زندگی کا علم جبلی طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ یعنی ایک فرد (نبی) کے ذریعے باقی افراد کو۔ انسان کے اندر یہ امکانی قوت موجود ہے کہ وہ چاہے تو حق کو اختیار کر لے اور چاہے باطل کو اختیار کر لے۔ یہی اختیار انسان کی بنیادی خصوصیت ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں۔ اگر انسان وحی کی راہ نمائی کو اختیار نہ کرے تو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور تباہیاں خریدتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ **يَدْعُ الْاِنْسَانَ بِالشَّيْرِ دُعَاءَ الْاِنْسَانِ** (۱۶) وہ بھلائی کو بلانے کے بجائے شر کو آواز ہی دہکر بلاتا رہتا ہے۔ اگر انسان کے اندر ”خیر و شر“ کی تمیز و دبعت کر کے رکھ دی جاتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اسے ایسا کرنے کی آزادی ہی نہ ملتی۔ جس طرح حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس روش کے خلاف چلیں جس پر چلنے کی تمیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ (مزید تفصیل ل۔ ۵۔ ۴۔ م کے عنوان میں ملیگی)۔

لہذا، یہ تصور غلط ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ”فطرت“ پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کی طرف آئیے جس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہم

دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں (جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے) لفظ فِطْرۃ کے معنی ہیں وہ قانون یا قاعدہ جس کے مطابق کسی چیز کی پہلی مرتبہ تخلیق کی جاتی ہے۔ خدا فاطر السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ہے۔ لہذا فطرت اللہ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق۔ آیت یہ ہے فِطْرَتَ اللَّهِ الْتَمَّتْ فِطْرَتَ النَّاسِ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ . ذَٰلِكُمُ الدِّينُ الْقَوِيمُ (۲۴۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا۔ یعنی جس طرح اس نے تمام ارض و سما (کائنات) کو ایک خاص قانون کے مطابق پیدا کیا اسی طرح اس نے انسان کو بھی پیدا کیا۔ اس کے قانون تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ ہے دین قیم یعنی محکم نظام۔ تم ہر طرف سے منہ موڑ کر اس قانون پر سیدھے چلتے جاؤ۔ فَاَقِيمُوا وَجْهَكُمْ لِلدِّينِ حَنِيفًا (۲۴۸)۔ اور اس کی تفسیر یہ ہے مَنِيبِينَ إِلَيْهِ . وَاتَّقُوهُ . وَاتَّبِعُوا الصَّلَاةَ . وَ لَا تَكُونُوا مِنْ الْمُشْرِكِينَ (۲۴۸)۔ اس کی طرف توجہ کئے ہوئے۔ مومن اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور نظام صلاۃ کو قائم کرو۔ اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ انسان کی ایک غہر متبدل فطرت ہے۔ وہ فطرت "اللہ کی فطرت" کے مطابق ہے۔ اور اس فطرت کی رو سے انسان خیر اور شر، حق اور باطل، میں از خود تمیز کر سکتا ہے۔ اور اسلام اس فطرت کا دھن ہے۔ یہ سب غلط عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے کہ ہم نے لفظ فطرت کے وہ معنی لے لئے جو یونانی لفظ نیچر کے معنی تھے۔ اگر اس لفظ کے وہ بنیادی معنی سامنے رکھے جائیں جو عربوں کے ہاں رائج تھے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے ان حیوانی رجحانات کے علاوہ جو انسان کی طبعی زندگی کا خاصہ ہیں، انسان کی کوئی غیر متبدل فطرت نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی وحی سے حاصل کرنی ہے۔ اور اس کا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس راہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت (The Capacity to Choose) وہ خصوصیت ہے جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اس میں ہر انسان، یہ حیثیت انسان ہونے کے شریک ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی انسان کو دی گئی ہو اور کسی کو نہ دی گئی ہو۔ لیکن یہ خصوصیت مضمر شکل (Un - Developed Form) میں دی گئی ہے جس کی نشو و نما کی جاسکتی ہے۔ یہ ہے وہ خاص ساخت جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا

کیا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر انسان کی کوئی ”فطرت“ ہوتی تو اسے اختیار و ارادہ کی صلاحیت کبھی نہ ملتی۔ ”فطرت“ اور اختیار و ارادہ دو متضاد باتیں ہیں۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی ایک فطرت ہے اس لئے ان میں سے کسی کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل نہیں۔ انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں۔ انسان کے اندر بہت سی امکانی قوتیں ہیں جنہیں نشو و نما دینا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا، مقصدِ زندگی ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”اسلام کے نام خطوط“ میں ایک خط میں ملے گی)۔

ہم نے دیکھا ہے کہ فطر کے معنی کھودنے، پھاڑنے، شق کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (۸۴)۔ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ نیز (۹۹)۔

مُنْفَطِرٌ۔ پھٹ جانے والا۔ (۱۸)۔ فُطُوْرٌ۔ شکاف، عیوب، خلل، (۶۴)۔

ف ظ ط

اَلْفُطْرَةُ۔ اونٹ کی اوجھ میں جمع رہنے والا ہانی جسے، صحرا میں جہاں ہانی نہ ملے اور جان کا خطرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں، اس کا پیٹ چاک کر کے نچوڑ لیا جائے اور اسے پی لیا جائے۔ یہ ہانی مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ پیا جاتا تھا، لہذا اس لفظ کو ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جائے لگا جس کے پاس خوشی سے نہ بیٹھا جائے بلکہ اسدِ ضرورت میں بادلِ ناخواستہ پہنچا جائے۔ اسی سے یہ لفظ تذخو، جفا پشہ، درشت مزاج شخص کیلئے بولا جاتا ہے۔

اِفْطَرَّ الرُّجُلُ کے معنی ہیں اس نے اونٹ کو ہانی ہلایا اور پھر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ وہ جگلی نہ کر سکے۔ پھر جب سفر میں ہانی نہ ملا تو اس کا پیٹ چاک کر کے اس ہانی کو پی لیا*۔

قرآن کے۔ ریم میں رسول اللہؐ کے متعلق کہا ہے کہ آپ اپنے رفقاء کے لئے نرم واقع ہوئے ہیں (لَيَسَّرَ لَّهِمْ)۔ فُطْرًا نہیں ہیں (۱۵۸)۔ یہی راہنما کی شان ہوئی چاہئے کہ لوگ اس میں کشش و جاذبیت پائیں اور اسے اپنا بہترین مشیر اور اچھا رفیق سمجھیں۔ نہ ایسا کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کی خاطر اپنے رفقاء کا پیٹ چاک کر کے ہانی نکال لے۔

* تاج و راعب۔ ** محیط۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْفَعْلُ اُس شخص کو کہتے ہیں جو سخت ، بد مزاج ، سنگدل ، درشت کلام ہو لیکن اس کے ساتھ ایسا بزدل بھی ہو کہ ڈرنے کے مقام پر ڈرنا تو ایک طرف ، جس جگہ کسی قسم کا خطرہ نہ ہو وہاں بھی ڈرے ***۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ناپسندیدگی اور کراہت کے ہیں۔

ف ع ل

فِعْلٌ کے معنی انسان کا حرکت کرنا ہیں۔ اور اس کا مطلب ہے کوئی کام کرنا۔ فِعْلٌ کی صحیح تعریف کرنے اور عَمِلَ اور صَنَعَ اور فَعَلَ کا فرق بتانے میں علمائے لغت نے بڑی بحث کی ہے۔ مثلاً صاحبانی کہتا ہے کہ کسی چیز کو وجود میں لے آنا فعل ہے خواہ وہ عمل ہو یا غیر عمل۔ اس طرح یہ عمل سے زیادہ خاص ہے۔ المحکم میں ہے کہ یہ کتابۃً ہر کام اور عمل کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ عمل متعدی ہو یا غیر متعدی۔ ابن الکمال کا کہنا ہے کہ کسی چیز پر اثر ڈالنے سے اثر ڈالنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے فعل کہتے ہیں*۔ راغب نے فعل کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے لئے ہیں۔ اس میں عمومیت ہے، یعنی خواہ وہ عمدگی سے کی جائے یا بغیر عمدگی کے۔ علم سے کی جائے یا بغیر علم کے۔ قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے۔ اس میں انسان ، حیوان ، جمادات سب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہی مفہوم عمل کا بھی ہے اور صنیع اس سے زیادہ خاص ہے**۔ محیط میں کلیات کے حوالہ سے سادہ ”عمل“ کے تحت ہے کہ عَمِلَ اس کام کو کہتے ہیں جو فکر و تدبیر اور علم و ارادہ کے ساتھ سرزد ہو۔ فِعْلٌ میں یہ شرط نہیں۔ نیز عَمِلَ اسے کام کو کہتے ہیں جو طویل مدت تک ہوتا رہے۔ اس کے برعکس فعل ایک دفعہ بھی کسی کام کے کرنے کے لئے بولا جاتا ہے***۔ (اس کے ساتھ ع۔ م۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

لیکن یہ قاعدہ کا یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ قرآن حکیم میں اللہ کے لئے فِعْلٌ آیا ہے (عَمِلَ نہیں آیا)۔ اور اس کا ہر فعل ، علم و ارادہ پر مبنی ہوتا ہے اور بیشتر امور ایسے ہوتے ہیں جن میں استمرار اور دوام بھی ہوتا ہے۔ لہذا فِعْلٌ کی وہ خصوصیات جو آئمہ لغت نے بتائی ہیں ، انسانوں تک تو درست ہو سکتی ہیں۔ افعال خداوندی کے لئے نہیں۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ * محیط ۔

مَنْ فَعَلَ (۲۹) کس نے کیا ہے؟ فَعَلَ (۳۰) کام - فَعَلًا (۳۱) ایک حرکت - ایک دفعہ کام کرنا - فَعِيل (۳۲) کرنے والا - فَعَالٌ (۳۳) بہت زیادہ کرنے والا - زیر دست کام کرنے والا - كَانَ مَفْعُولًا (۳۴) جو کام کیا جا چکا ہے - ہو مکمل ہو چکا ہے -

قرآن کریم میں یہ مادہ اس کثرت سے آیا ہے کہ اس کا احصاء اس مقام پر ممکن نہیں - نہ ہی اس کی کوئی خاص ضرورت ہے - جہاں یہ مادہ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے - اس میں کوئی پیچیدگی نہیں جس کے لئے اس کی وضاحت یا تشریح کی ضرورت لاحق ہو -

ف ق و

فَقَدَ - تَفَقَّدَ - فَقَدْ أ - کسی موجود شے کو گم کر دینا * - راجب نے فَقَدَ اور عَدَمَ کا فرق یہ بتایا ہے کہ فَقَدَ تو کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا ہے، لیکن عَدَمَ فَقَدَ تو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے مرے سے موجود ہی نہ ہونے کو بھی * - سورة يوسف میں ہے - مَا ذَا تَفَقَّدَ وَنَى - (۳۵) تم نے کیا چیز گم کر دی ہے - تم کیا چیز نہیں پا رہے ہو؟ اِفْتَقَدَ وَ تَفَقَّدَ - کسی گم گشتہ کا تلاش کرنا - لیکن راجب نے کہا ہے کہ اِلْتَفَقَدَ کے معنی ہیں یہ معلوم کر لینا کہ فلاں چیز گم ہو گئی ہے * - لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی ہیں اس چیز کا طالب یا تلاش کرنا جو غائب ہو - چنانچہ سورة نمل میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ (۳۶) - اس کے یہ معنی ہونگے کہ حضرت سلیمانؑ نے تیز رفتار گھوڑوں کے ہرکاروں کو (جو اس وقت وہاں نہیں تھے) طلب کیا - (دیکھئے عنوان ط - ی - ر)

ف ق و

الْفَقِيرَ - ریڑھ کی ہڈی کا ایک منکا - الْفَقِيرَ - وہ شخص جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو - کمر شکستہ - نَزَّ الْفَقِيرَ اُس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں کھجور کا ہودا لگایا جاتا ہے * - اسی طرح کنویں، نیزہ، گڑھے کو جس میں پانی بھر جاتا ہو فَقِيرَ کہتے ہیں - الْفَقْرَ - الْفَقِيرَ - گڑھا کھودنا - نیز موتیوں میں سوراخ کرنا - اونٹ کی ناک چھیدنا تاکہ اس میں نکیل ڈال دی جائے * - اور ایسے اونٹ کو الْفَقِيرَ کہتے ہیں * - ان

* تاج - * راجب -

معانی سے فقیر* - اور فقیر* کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - قرآن کریم میں فقراء* اور مستاکین* کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں (۱۰۰) جس کی وجہ سے ائمہ لغت اور فقہ نے ان کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے - لیکن ان میں کوئی متعین خط امتیاز نہیں کھینچ سکا - عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ فقیر* وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو لیکن نہ اتنا کہ وہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے - اسکی جمع فقراء* ہے - لیکن مستکین* وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو - مستکین* کے معنی کے لئے دیکھئے عنوان س - ک - ن - وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک انہی ہاں کے محتاج کو فقیر* کہتے ہیں اور غیر قوم کا شخص جو اسلامی مملکت میں آکر بس گیا ہو اور صاحب احتیاج ہو مستکین* کہلاتا ہے -

قرآن کریم میں فقیر* - بمقابلہ غنی* آیا ہے (۱۸۰ : ۳۰) - (غنی کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان غ - ن - ی) - لہذا فقیر* کے معنی احتیاج کے ہوں گے - ضرورتوں کا کما حقہ پورا نہ ہو سکا - یعنی فقراء* معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو پوری پوری محنت کرنے کے بعد بھی اتنا نہ کما سکیں کہ وہ ان کی ضروریات کے لئے سکتی ہو سکے - اصحاب احتیاج (۲۲) - لیکن اس کے معنی صرف طبعی ضروریات کی احتیاج ہی نہیں بلکہ انسان کی نشوونما کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہو ان کی احتیاج بھی فقیر* ہے - چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ اِنِّیْ لِمِمَّا آثَرْتُ النَّاسَ مِنَ الْغَنِیِّ (۲۶) - جو کچھ بھی تو نے میرے لئے خیر میں سے بھیجا ہے میں اس کی احتیاج رکھتا ہوں - اس میں طبعی ضروریات اور شرف انسانیت کے اسباب و وسائل دونوں آجائے ہیں - اس اعتبار سے کائنات کی ہر شے اور ہر انسان اپنی نشوونما اور تکمیل ذات کے لئے ربوبیت خداوندی کا محتاج ہے - بِسْمَلٰہِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۹) - کائنات کی ہر شے اس کی محتاج ہے - سورہ فاطر میں تمام نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ اَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ اِلٰی اللّٰهِ - وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْعَلِیْمُ (۴۰) - تم سب اپنی نشوونما کے لئے عطا پائے خداوندی کے محتاج ہو، اور اللہ کسی معاملہ میں بھی تمہارا محتاج نہیں - طبعی ضروریات کے لئے انسان، فطرت کے عطا کردہ سامان پرورش کا محتاج ہے - اور شرف انسانیت کی نشوونما کے لئے وحی کی راہ معانی کا محتاج -

قرآنی معاشرہ میں فقراء* وہ ہونگے جو پوری پوری محنت کے باوجود اتنا پیدا نہ کر سکیں جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو - معاشرہ ان کی

ضروریات کے فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور چونکہ ان کی سب ضروریات پوری ہوتی رہیں گی اس لئے اس معاشرہ میں در حقیقت فقیر (محتاج) کوئی نہیں رہے گا۔ یہ صرف اسوقت تک ہونگے جب تک قرآنی معاشرہ وجود میں نہیں آئیگا۔

نقیرۃ*۔ کمر توڑ دینے والی مصیبت (۴۵)۔

ف ق ع

فتاقع*۔ ہر تیز رنگ کو فتاقع کہتے ہیں۔ یہاں خالص اور صاف رنگ کو* (جس میں دو رنگ کی آمیزش نہ ہو)۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صفتِ رائے کے ساتھ آیا ہے (۴۶) جس کے معنی ہیں گہرا زرد رنگ۔
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں آتے۔ چنانچہ فتوابع اللہ ہر۔ زمانہ کے معائب و آلام کو کہتے ہیں۔

ف ق لا

الفیقہ*۔ کسی چیز کو جان لینا اور سمجھ لینا*۔ قرآن کریم میں ہے۔
لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا تَلْوِيْنًا (۴۷)۔ یہ بہت کم سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ اس قسم کی سمجھ اور پہچان کو کہتے ہیں جس طرح حیوان اپنی جبلی استعداد (Instinct) سے اپنی پہچان اور تمیز میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ چنانچہ لتحل* فقہیہ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو صحیح طور پر پہچان لئے کہ کونسی اونٹنی حاملہ ہے اور کونسی اختلاط کے قابل*۔

راغب نے کہا ہے کہ الفیقہ*۔ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں**۔ یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کر کے ان کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا**۔ تفقہ فی الدین (۴۸) کا یہی طریقہ ہے۔ یعنی زمانہ کے ٹھوس واقعات پر غور کر کے یہ سمجھنا کہ ان پر دین کے کون سے حقائق و قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے تفقہ فی الدین کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ہر مقام سے کچھ لوگ مرکز میں آئیں اور دین میں تفقہ حاصل کریں۔ پھر یہ واپس جا کر باقی لوگوں کو اس سے آگاہ کریں (۴۹)۔ یعنی تفقہ فی الدین کسی خاص گروہ کا اجازہ (Monopoly) نہیں۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ان حالات میں بتایا گیا تھا جو ابتدائے اسلام میں تھے۔ ویسے از روئے قرآن کریم تفکر۔ تدبیر۔ تفقہ ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے۔

*تاج۔ **راغب۔

فقہ ایک قانونی اصطلاح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں (اور روزِ سرہ کے حالات کے مطابق) جزئی قوانین مستنبط کئے جائیں۔ یہ کام اسلامی نظام کا تھا۔ لیکن اب فقہ کے معنی ہیں کسی خاص امام کا مسلک۔ مثلاً فقہ حنفی کے معنی ہیں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک۔ یا ان فقہاء کے فتاویٰ جو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ اہل فقہ، اہل حدیث کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہیں۔ غور کیجئے، قرآن کریم کی رو سے تفقہ فی الدین کا مفہوم کیا تھا۔ اور اب اس کا مفہوم کیا رہ گیا ہے! جب دین، ایک نظام، اجتماعی کی بجائے انفرادی چیز بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

فکر

فَتَكْتَرُ - أَفْكَرَ - فَتَكْتَرُ - تَفَكَّرَ فَيَسِّرُ - کسی چیز یا (معاملہ) میں اطمینان سے (ایک خاص ترتیب کے ساتھ) غور کرنا اور عقل و نظر سے کام لینا* (اور اس سے صاف نتیجہ اخذ کرنا) - صاحب مفردات کے نزدیک ہم انہی چیزوں پر فکر کر سکتے ہیں جن کا کوئی تصور دل میں قائم ہو سکے۔ جن چیزوں کا تصور قائم نہ ہو سکے ان میں فکر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تَفَكَّرُوا فِي آلاءِ اللَّهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللَّهِ - اللہ کی قدرتوں (مظاہرِ فطرت وغیرہ) پر تو غور و فکر کرو، لیکن اللہ کی ذات کے متعلق کچھ نہ سوچو، کیونکہ اس کا تصور ہی ذہن انسانی میں نہیں آسکتا**۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَفَكَّرَ کے معنی ہیرت حاصل کرنے کے لئے دل کو گھمانا اور ادھر ادھر ہلانا ہیں۔

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھنے جائیے۔ قدم قدم پر آپ کو غور و فکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دھوکے کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا اور اسے فکر و تدبیر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور و فکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (۱۶۴) ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسولؐ کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یوں نہیں چلتے چلتے سن لو۔

*تاج - **راغب -

اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفَرَادٰی۔ (۳۴) اس کے لئے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے جا رہے ہو اس میں بہے نہ جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رکو۔ تھمو۔ ٹھہرو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ سب کے سب نہیں تو ایک ایک۔ دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن خالصۃً للہ۔ دل میں کوئی اور خیال، جذبہ یا مقصد لئے ہوئے نہیں۔ اور پھر؟ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا (۳۵)۔ پھر تم سوچو۔ غور کرو۔ پس یہ ہے وہ بات جسکی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہے مَتَابِعَاتُکُمْ مِّنۡ جِیۡنَکُمۡ (۳۶)۔ یہ دعوت فکر جو تمہیں دی جا رہی ہے وہ اس داعی کے جنون کا نتیجہ نہیں۔

ابن قدر تاکید تھی غور و فکر کی !

لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ غور و فکر ہم پر حرام قرار پا چکا ہے۔ کوئی معاملہ ہو۔ کوئی مسئلہ ہو۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ہو۔ اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کی بابت اسلاف نے کیا کہا ہے۔ اگر آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسی بات کہیں جس کی سند اسلاف کے ہاں سے نہ ملتی ہو۔ تو آپ فتنہ پرداز۔ ملحد۔ بے دین۔ قرار پا جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے معاملات، حتیٰ کہ قرآن کریم کے متعلق، جو کچھ سوچا سمجھا جانا تھا وہ سب سوچا سمجھا جا چکا ہے۔ اب ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس کی اندھی تقلید کرتے جائیں۔ خود نہ کچھ سوچیں نہ سمجھیں۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو غور و فکر کا حکم دیا تھا تو وہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ تمام زمانوں کے انسانوں کے لئے یکساں حکم تھا۔ اس لئے (قرآن کریم کی رو سے) جس طرح ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ (اسلاف) غور و فکر کے لئے مکلف تھے اسی طرح ہم پر بھی غور و فکر لازم ہے۔ اگر ہم غور و فکر نہیں کرتے تو یہ روش قرآن کریم کے واضح حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔

لیکن ہم ہیں کہ غور و فکر کو الحاد اور بیدینی قرار دے رہے ہیں! اصل یہ ہے کہ جب قومیں قوت عمل سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔ غور و فکر بجائے خویش ایک عمل ہے جس میں ذہن کو بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پھر، غور و فکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل ہی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے۔ غور و فکر سے بھاگنے کی اصل وجہ

تو یہ ہوتی ہے لیکن انسان کی خوئے بہانہ سازی اسے ”سلف صالحین“ کا اتباع قرار دیکر جھوٹے اطمینان کا موجب بنا دیتی ہے۔

یاد رکھئے۔ جو قوم غور و فکر سے محروم رہ جاتی ہے وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے۔ انسان و حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہے۔ ہم اپنے اسلاف کے غور و فکر کے نتائج سے مستفید ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا غور و فکر ہمارے لئے حرفِ آخر نہیں ہو سکتا کہ اس سے اختلاف، الحاد و بیدینی قرار پا جائے۔ زمانے کی علمی اور فکری سطح بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے، علم و فکر میں آگے ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے اس لئے اس پر مسلسل غور و فکر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں غور و فکر کے لئے اس قدر کثرت سے تاکید آئی ہے کہ ان مقامات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے ابکی مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ جب آپ قرآن کریم کا مطالعہ کریں گے تو وہ تمام مقامات آپ کے سامنے آجائیں گے اور ان سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کے خلاف کتنی سخت تنبیہات آئی ہیں۔ (مزید تفصیل (ع - ق - ل) - (ع - ل - م) - (د - ب - ر) اور (ق - ل - د) کے عنوانات میں ملیگی)۔

ف ک ک

فَكَفَّهِ - يَفْكُفُهُ - فَكَّيَا - اس نے اسے جدا کر دیا - فَانْفَكَّتْ - تو وہ اس سے جدا ہو گیا - فَتَكَكَّتْ الشَّقِيئُ - میں نے اس چیز کو چھڑا دیا - اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا - فَكَّكَ الْآسِيزُ - اس نے قیدی کو چھڑا دیا - فَكَّكَ يَدَهُ - اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا - یعنی مٹھی میں جو چیز تھی اسے ظاہر کر دیا - فَكَّكَ الْخَتَمَ - اس نے مہر کو توڑ دیا*۔

قرآن کریم میں فَكَّكَ رَقَبَةً (۱۱۰) آیا ہے جس کے لفظی معنی کسی گردن کا آزاد کرنا ہیں۔ اس میں مظلوموں کو استبداد سے چھڑانے اور زیردستوں کو ظلم سے بچانے کے تمام پہاؤ آجاتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے - لَسْمٌ بِتَكْنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَسْأَلِيَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (۲۸) - اہل کتاب اور مشرکین اپنے باطل عقائد و رسوم کی خود ساختہ زنجیروں

سے رہا نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کے پاس (الْبَيْتِیْنَتَہ) خدا کا یہ قانون نہ آتا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا ہے - وَ یَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۱۵۷) - یہ اس لئے آیا ہے کہ انسانوں نے اپنے اوپر جو (خواہ مخواہ کے) بوجھ لاد رکھے تھے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا یہ انہیں ان سے آزادی دلائے۔ قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو انسانوں کے ہر قسم کے (ذہنی و جسمانی) استبداد سے نجات دلائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے ان تمام زنجیروں کو جو آپ ﷺ نے توڑی تھیں، ایک ایک کر کے اکٹھا کیا اور پھر سے انہیں اپنی گردنوں میں ڈال لیا۔ اب ہم ان جکڑ بندیوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہیں، لیکن وہ ایسی مقدس بن چکی ہیں کہ انہیں اتار پھینکنے کی ہمت کسی میں نہیں ہڑتی۔ ان زنجیروں کو صرف قرآن کریم کی تعلیم توڑ سکتی ہے، اور قرآن کریم کی طرف ہم آنا نہیں چاہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ف ک ہ

فَکِیہَ الرَّجُلُ* - وہ خوش مزاج، ہشاش بشاش اور ہر مزاح ہوا۔
ایسا شخص فکیہ* اور فکاکہ* کہلائیکا - اَلْفَکَکِیَّۃُ* - ہر قسم کا پھل -
جمع فَوَکَکِیَّۃُ* (۲۳) -

اَلْفُکَاکِیَّۃُ* - دلچسپ اور دل کو شگفتہ کرنے والی باتیں - خوش گئی۔
مزاح، فَاکَکِیَّۃُ* سَفَاکَکِیَّۃُ* - ایک نے دوسرے سے مزاح کیا* -

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے - فِی شُغُلٍ فَاکِیْہُوْنَ* (۱۵۷) - وہ کام میں لگے ہوئے خوش ہونگے - ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے خوشی کی باتیں اور مزاح کریں گے - یا قرحت و انبساط سے بھرے ہونگے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُفَاکَکِیَّۃُ* خوش مزاجی اور شیریں کلامی کو کہتے ہیں -

تَفَکَّکَہَ مِیْنُ کَسَدَا - اس نے فلاں چیز سے تعجب کیا - تَفَکَّکَہَ الرَّجُلُ* - وہ نادام ہوا* - اَلَا فَاکُکُوْہُۃُ* - تعجب کی بات - ہر مزاح بات -
سورۃ واقعہ میں ہے فَظَلَلْتُمْ تَفَکَّکَہُوْنَ* (۵۶) تم تعجب کرنے لگ جاؤ۔
ابن فارس نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ابتداءً یہ لفظ تَفَکَّکَہُوْنَ تھا -

بعد میں نون ہاء سے بدل گیا اور یہ تَفَكَّهُوْنَ بولا جائے لگا۔ تَفَكَّهُوْنَ کے معنی ہیں شرمندہ ہونا۔ اَلْفَكِيهْ۔ اِترائے والا۔ اِکْزَفُوْنَ کرنے والا*۔ قرآن کریم میں ہے اِنْقَلَبُوْا فِکْرِہِیْنَ (۱۳۱) اترائے ہوئے لوٹتے ہیں۔

ف ل ح

فَلَحْ کے معنی ہیں پھاڑنا۔ شگاف کرنا۔ چساک کر دینا۔ اسی لئے فَلَاحْ کاشتکار کو کہتے ہیں کیونکہ وہ کھیتی کے لئے زمین میں ہل چلا کر اسے پھاڑتا ہے۔ فَلَاَحَ۔ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کرنے کو کہتے ہیں**۔

چونکہ فَلَاحْ (کسان) کی معنت کا صلہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت ایک ایک دانہ کے بدلے سو سو دانوں سے اس کی جھولیاں بھر دیتی ہے، اس لئے فَلَاحْ کا لفظ کامیابی اور بقاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (ابن فارس)

مُفْلِحُوْنَ۔ وہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔ جن کی معنت ثمر بار ہو جائے۔ جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مومنین کے متعلق ہے۔ اُولَئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۰)۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ نفس انسانی کے نشوونما پا کر انسان کے کامیاب و کامران ہونے کے متعلق ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۱۱)۔ جس نے اس کی نشوونما کی وہ کامیاب ہو گیا۔

قرآن کریم نے انسانی سعی و عمل کا حاصل ”نجات“ نہیں بتایا۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ہوتی ہے۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی پہلی حالت میں پہنچ گیا۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ہوا۔ یہ قرآنی تصور نہیں۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جو ہر انسانی بچہ کو پیدائشی طور پر گناہ گار قرار دیتی ہے۔ اس کا ان گناہوں کی مصیبت سے چھوٹ جانا نجات (Salvation) ہے۔ یا ہندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا کے جیل خانے میں محبوس ہے۔ اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے۔ یہی تصور بدھ مت میں ہے۔ ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے۔

* تاج و محیط و راعب۔ ** تاج۔

یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہو کر مسادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے۔ اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی اصل سے جا ملنا مقصود حیات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ تصور نہیں۔ اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک صاف سلیٹ لے کر آتا ہے۔ وحی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے اس کی مضر صلاحیتوں کی نشو و نما اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس سے اُسے اس زندگی کی تمام خوشگوار باتاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی۔ یہ سب مثبت نتائج ہیں، اس لئے انہیں فلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا۔ اس کا ثمر بار ہونا۔ یا فَوْز سے (دیکھئے عنوانات ف۔ و۔ ز اور ن۔ ج۔ و)۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس نظام قرآنی کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲۰۰)۔ پھر وہ اس نظام کو عملاً متشکل کرتے ہیں اور جب اس کے مرنی و محسوس نتائج ان کے سامنے آ جاتے ہیں تو ان کا ایمان بالغیب (یعنی کسی پر اعتماد کر کے اس کی بات مان لینا) یقین میں بدل جاتا ہے (۲۱)۔ ان کی مثال اس کسان (فلاح) کی سی ہے جو اپنے ایمان محکم کی رو سے بیچ کو مٹی میں ملا کر مہینوں اس پر محنت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کی محنت کے نتائج فصل بن کر اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲۲)۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اَلْفَلَاحُ کے معنی اَلْبَقَاءُ ہیں۔ یعنی ثابت اور محکم طور پر باقی رہنا۔ اور مُفْلِحُونَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو عیشِ جاوداں کے مالک ہوں*۔ یاد رہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ کامیاب زندگی اس دنیا کی بھی ہے اور موت کے بعد کی بھی۔ اسی طرح ”آخرت“ سے مراد اس دنیا میں مستقبل کی زندگی بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔

ف ل ق

فَلَمَّا تَلَّى الشَّامِيُّ ۚ يَفْلِقُهُ ۚ وَفَلَقَهُ ۚ۔ اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ فَانْفَلَقَ ۚ۔ چنانچہ وہ چیز پھاڑ گئی**۔ فَالِقُ ۚ اَلْاَصْبَاحِ (۲۳)۔ رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح کو نمودار کرنے والا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی خَالِق کے بھی ہو سکتے ہیں**۔ اَلْفَلَاقُ ۚ۔ صبح۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی صبح کا واضح ہو جانا ہیں۔ اس کے معنی

مخلوق کے بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی مشکلات کے بعد حق کے واضح ہو جانے کے بھی ہیں *۔ چنانچہ قُلْ أَهْوُذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ (۱۱۳) میں یہی مفہوم مراد ہے۔

کائنات میں سلسلہ ارتقاء اس طرح جاری ہے کہ ایک چیز پھٹتی ہے تو اس میں سے نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے جو آگے بڑھتی اور اوپر کواٹھتی ہے۔ پھر اس میں سے اسی طرح ایک اور زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ دائے میں سے کونہل نکلتی ہے۔ پھر اس میں سے شاخ پھوٹتی ہے۔ شاخ میں سے پتہ پھوٹتا ہے۔ پھر شگوفہ۔ پھر پھول۔ پھر اس میں پھل لگتا ہے۔ پھل میں بیج پیدا ہوتا ہے۔ بیج سے پھر ایک نئے درخت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْغَيْبِ وَالنَّوْیِ۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَمِیّتِ وَیُخْرِجُ الْمَمِیّتَ مِنَ الْحَیِّ۔ (۶۶)۔ ”اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔“ یہ ہے خدا کا متعین کردہ قانون حیات و ارتقاء۔ اور یہ ہے رَبِّ الْفَلَقِ۔ (۱۱۳)۔

ف ل ک

الْفَلَکُ۔ ہر چیز کا بڑا اور گول حصہ۔ سمندر کی مضطرب و متسرد موج۔ ستاروں کا مدار **۔ قرآن کریم میں ہے کُلُّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶)۔ تمام کرے اپنے اپنے مدار (Orbit) میں نہایت تیزی سے تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ الْفَلَکُ (۱۶)۔ کشتی کو کہتے ہیں (مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ہے نیز واحد و جمع کے لئے یکساں مستعمل ہے) **۔

ف ل ن

فَلَانٌ وَفَلَانَةٌ۔ انسانوں کے ناموں کے لئے بطور کنایہ بولا جاتا ہے۔ اول الذکر مذکر کے لئے اور ثانی الذکر مؤنث کے لئے۔ اور الف۔ لام کے ساتھ (یعنی الْفَلَانُ وَالْفَلَانَةُ) انسانوں کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً بہائم وغیرہ کے لئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے ***۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ فَلَانٌ اور فَلَانَةٌ بغیر الف۔ لام کے ذوی العقول کے نام کی جگہ کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسی چیز سے کنایہ مقصود ہو جو صاحب عقل و شعور نہ ہو تو فَلَانٌ اور فَلَانَةٌ پر الف۔ لام کا اضافہ کر لیتے ہیں ****۔

* تاج و محیط۔ ** تاج و ابن فارس۔ *** تاج۔ **** محیط و محیط۔

قرآن کریم میں ہے یَا وَیْلَتْنِی لَیْسَ بِنَبِیِّ لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیلًا (۲۸) ”ہائے میری تباہی! کاش، میں نے فلان کو دوست نہ بنایا ہوتا۔“
 زجاج نے کہا ہے کہ یہاں فُلَانًا سے مراد شیطان ہے کیونکہ اس سے آگے ہے
 وَكَانَ الشَّیْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا (۲۹)۔ ”اور شیطان آخر انسان
 کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔“ لیکن [جیسا کہ ”شیطان“ کے باب (عنوان
 ش - ط - ن) میں بتایا جا چکا ہے] ہر شریر انسان شیطان ہے۔ اس لئے اس میں
 سرکشوں اور شرارت پسندوں کی دوستی کیطرف اشارہ ہے۔

ف ن د

أَفْتَنَدُ - بوڑھا ہونا - بڑھاپے یا بیماری کیوجہ سے عقل کا ناکارہ ہو
 جانا - بات یا رائے میں غلطی کرنا - مٹھیا جانا * - لسان العرب میں ہے کہ
 فَنَدٌ کے معنی جھوٹ کے ہیں * - راغب نے اس کے معنی کمزوری رائے
 بتائے ہیں ** - فَنَدَةٌ - اسے جھوٹا، کمزور رائے والا یا فاترالعقل بتایا۔
 أَفْتَنَدَ - جھوٹ بولا - بوڑھا آدمی جب بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے کہتے ہیں
 قَدْ أَفْتَنَدَ - کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو صحت کی راہ سے ہٹی
 ہوتی ہیں - لیکن بوڑھی عورت کو مُفْنِدَةٌ نہیں کہتے کیونکہ (عربوں
 کے خیال کے مطابق) عورت جوانی کے زمانے میں کونسی صائب الرائے ہوتی ہے
 جو اسے بڑھاپے میں مُفْنِدَةٌ کہا جائے؟ اصمعی نے کہا ہے کہ جب
 بوڑھا ہونے کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ باتیں کرنے لگے تو اسے مُفْنِدٌ
 کہتے ہیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوجھل اور
 سخت ہونے کے ہیں - نیز اس بڑھاپے کے بھی جس کے ساتھ عقل کا فتور
 شامل ہو۔

سورہ یوسف میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے لوگوں سے کہا کہ لَوْ لَا
 أَنْ تَفْنَدَ وَنَ (۱۲)۔ اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ
 سے میری عقل میں فتور آگیا ہے اور میں ہم کی بھی باتیں کرنے لگ
 گیا ہوں تو.....

ف ن ن

أَفْنَنٌ (جمع نَفْنَنٌ وَأَفْنَنَانٌ) حالت - قسم - نوع - عجیب معاملہ -
 أَلْفَنَنٌ اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں ترو تازہ ہتے ہوں - (جمع أَفْنَنَانٌ)

وَأَفَانِيْنَ)۔ اَلْفَنُونُ*۔ مختلف قبیلوں کے ملے جلے لوگوں کو کہتے ہیں۔ رَجُلٌ مِیْنٌ*۔ حیرت انگیز و تعجب خیز کام کرنے والا مرد۔ أَفَانِيْنَ* اَلْکَلَامُ۔ کلام کے مختلف اسالیب اور طریقے*۔ اس سے علوم و فنون کا مفہوم واضح ہے۔

قرآن کریم میں جنت (بَلَدٌ جَنَّتَنِ) کے متعلق ہے کہ وہ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ (۵۸) ہے۔ جسکی مختلف شاخیں ہوں۔ جہاں مختلف علوم و فنون عام ہوں۔ قرآن کریم کی رو سے جنتی معاشرہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ مختلف فنون کی آماجگاہ ہوگا۔

ف ن ی

اَلْفَنَاءُ*۔ بَقَاءُ* کی ضد ہے۔ بَقَاءُ* کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی اصلی حالت پر قائم رہنا۔ (دیکھئے عنوان ب۔ ق۔ ی)۔ یعنی اس کا تغیر پذیر نہ ہونا۔ لہذا اَلْفَنَاءُ* کے معنی ہونگے کسی چیز میں تغیرات واقع ہوتے رہنا۔ اسکا اپنی اصل حالت پر نہ رہنا بلکہ اس میں تغیر و تبدل واقع ہوتے رہنا۔ قرآن کریم میں ہے "کُلُّ شَيْءٍ عَلَیْہَا فَنٍ"۔ وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۲۶:۲۷)۔ فَنٍ*۔ اسم فاعل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ زمین پر جو کچھ ہے سب معدوم ہو جائیگا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائیگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کی ذات ایسی ہے جو تغیر پذیر نہیں۔

جسے "تغیر" (Change) کہا جاتا ہے، اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کسی شے کے اندر تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس طریق (Process) سے ہوتا یہ ہے کہ جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ چیز معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں کام اسطرح بیک وقت ہوتے ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پہلی چیز کب معدوم ہوئی اور اسکی جگہ دوسری چیز کب وجود میں آئی۔ (برگسان نے اس نکتہ کی بڑی عمدہ تشریح کی ہے) لیکن (برگسان کے فلسفہ کی رو سے) ذات (Personality) ایسی شے ہے جس میں نشوونما اور ارتقاء تو ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ معدوم ہو جائے (It does not cease to exist) اسی کو باردیوئے (Changelessness in change) سے تعبیر کیا ہے۔ اور خدا چونکہ

مکمل اور مطلق ذات ہے اس لئے اس میں تغیر اور معدوم ہو کر پھر سے متشکل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دور میں ہنوز فلسفہ ہمیں تک پہنچا ہے۔ لیکن اس سے بھی قرآن کریم کی مندرجہ صدر آیات (۲۵۵-۲۶۹) کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے۔

چونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ تبدیل شدہ چیز لے لیتی ہے، اس اعتبار سے اَلْفَنَاءُ*۔ کسی چیز کے ختم ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ نیز اَلْفَنَاءُ* بہت بوڑھے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو قریب الختم ہوتا ہے۔ اور فَنَاءُ* القدار۔ گھر کے سامنے کے وسیع میدان کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں گھر کی ہمارت ختم ہو جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے کلمات کسی قیاس کے مطابق نہیں آئے۔

ف ل م

فہیم*۔ یَفْہِمُ*۔ فہمًا*۔ کسی چیز کو جان لینا اور دل سے پہچان لینا۔ بعض لوگوں نے علم اور فہم میں یہ فرق کیا ہے کہ علم تو مطلق ادراک (کسی چیز کو جان لینے) کو کہتے ہیں اور فہم کہتے ہیں خارجی اشیاء پر غور کے بعد ذہن کا دوسری چیزوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جانا۔ بعض نے کہا ہے کہ الفاظ سے جو تصور ذہن میں آتا ہے اُسے فہم* کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک فہم* ذہن کی اس خوبی کو کہتے ہیں جس سے وہ مطالب کو تیزی اور عمدگی سے اخذ کر لیتا ہے**۔ فہمًا*۔ میں نے اسے سمجھا دیا**۔ قرآن کریم میں ہے فَفَہَّمْنَاهَا سُلَیْمٰنَ (۲۱)۔ ہم نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا۔

ف و ت

فَاتَتْ* اِلَا مَرًّا*۔ وہ معاملہ اسکی گرفت سے جاتا رہا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔ دسترس سے دور ہو گیا***۔ (۱۵۲)۔ دراصل فَاتَتْ* اِلَا مَرًّا* کے معنی ہیں اس کام کو کرنے کا وقت نکل گیا***۔ اَلْفَوْتُ* کے معنی ہیں کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لئے دشوار ہو***۔ (۳۳)۔ چنانچہ معاورہ ہے هُوَ قَوْتُ فَمِیْہِ اَوْ قَوْتُ رَمَیْہِ۔ وہ اسے نظر تو آ رہا ہے لیکن اسکی دسترس سے باہر ہے***۔ اَلْفَوْتُ*۔ شکاف۔

* تاج و محیط۔ ** تاج و راغب۔ *** تاج۔ **** راغب۔

نیز دو انگلیوں کے درمیانی خلا کو کہتے ہیں *۔ تَفَاوُت کے معنی عدم مطابقت اور عدم تناسب کے ہوتے ہیں **۔ سورة الملک میں ہے۔ مَا تَرَىٰ فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ۔ (۹۶)۔ تم خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ ہر جگہ توازن و تناسب نظر آئے گا۔

ف و ج

آلَفَتَوْجُ۔ آلَفَتَاجُ۔ لوگوں کی جماعت۔ رؤساء کے متبعین۔ جمع آفَوَاجُ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہو جانے کے ہیں۔ آفَاجُ۔ وہ تیز رفتار ہوا۔ فَاجُ الثَّيْسُكُ۔ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ اس لفظ آلَفَتَوْجُ تیزی سے گزرنے والی جماعت کو کہتے ہیں ***۔ قرآن کریم میں ہے۔ یَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا (۲۸۰)۔ ”جس دن (یا جس دور میں) ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ کو اکٹھا کرینگے“۔ یہاں اس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ سورة النصر میں ہے یَدُ خَلَوْنِ رَفِیْ دَرِیْنِ اللّٰہِ آفَوَاجًا۔ (۱۱۴)۔ ”اللہ کے دہن میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہیں“۔ یہاں اس میں تیزی اور کثرت دونوں کا مفہوم ہے۔ نظام خداوندی کی تشکیل میں پہلا مرحلہ تو وہ ہے جس میں داہی الی الحق کی بڑی محنت اور مشقت کے بعد، اکا دکا کر کے، مدت مدید میں، کچھ افراد جمع ہوئے ہیں۔ پھر ان کی محنت شاقہ اور سعی پیہم سے، اس نظام کے اولین مراحل طے ہوئے ہیں۔ یہ السابقون الاولون کی جماعت ہوتی ہے جنہیں قدم قدم پر سینکڑوں قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی اس سعی مسلسل کے بعد، جب یہ کھیتی پروان چڑھتی ہے تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر، لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ منزل جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَدُ خَلَوْنِ رَفِیْ دَرِیْنِ اللّٰہِ آفَوَاجًا۔

ف و ر

فَارَ۔ فَوْرًا۔ جوش مارنا۔ بھوٹ کر نکل پڑنا۔ فَارَتِ الثَّیْدُ رُ۔ ہانڈی جوش کھانے لگی۔ آفَوَارَۃ۔ وہ جگہ جہاں سے چشمہ جوش مار کر نکلے۔ رَجُلٌ فَوْرٌ۔ تیز مزاج اور جلد غصہ میں آجانے والا آدمی۔ **۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** تاج و محیط و راغب۔

سورة ہود میں ہے - فَارَ السَّيُّورُ (۱۱) - زمین میں سے جوش کے ساتھ چشمے اہل پڑے - سورة آل عمران میں ہے - وَ يَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرٍ هِيمٍ (۱۳۳) - وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں - سورة ملک میں ہے - وَ هِيَ تَفْؤُرُ (۶) - وہ جوش مار رہی ہوگی - ابن فارس کے نزدیک اس کے بنیادی معنی جوش مارنے کے ہیں -

فَوْرٌ کے معنی جلدی اور بغیر رکے کسی کام کو کرنے کے بھی ہیں - عربی زبان میں عَلَى الْفَوْرِ اور مِّنْ فَوْرٍ اور اردو میں فوراً بولتے ہیں - عجلت کا مفہوم اس لئے پیدا ہوا کہ جوش میں عجلت ہی سے کام لیا جاتا ہے -

ف و ز

الْفَوْرُ - اگرچہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا پا لینے کے بھی ہیں * - لیکن اس کا دوسرا مفہوم اپنی آرزو بنا خیر کو حاصل کر لینا ، مقصود کو پا لینا ہے * - مصیبت سے رہائی پالینا محض ایک سلبی (Negative) چیز ہے لیکن قرآن کریم ، جنت کی زندگی کو ایک ایجابی (Positive) مقصد کا حصول (Achievement) قرار دیتا ہے - اس لئے وہ اہل جنت کو فَنَائِزُونَ (۵۹) کہتا ہے - یعنی وہ جو فَتَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (۳۳) کے حامل ہیں - اس میں اس دنیا کا سال و متاع اور خوشگواریاں بھی شامل ہیں ، جیسا کہ قرآن کریم نے (نہج۱) میں خود واضح کر دیا ہے - دوسری جگہ اسے مَفْتَازًا کہا ہے - (۴۱) - سورة آل عمران میں ہے کہ جو شخص تباہیوں سے محفوظ رہا اور ”جنت میں داخل ہو گیا“ - فَتَقْدُ فَتَازَ (۳۳) تو یہ ہے جسے کامیاب کہا جائے گا - دیکھئے ، اس میں دونوں پہلو موجود ہیں - تباہیوں سے بچنا اور زندگی کی خوشگواریوں کا حاصل ہو جانا - یہ ہے کامیابی - اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے - يَنْتَجِبِي اللَّهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا يَمْتَفِزُوا بِمَفْتَازٍ هِيمٍ (۳۶) - متقیوں کو اللہ تباہیوں سے بچاتا ہے ، اُن کی کامیابی کے ساتھ - یعنی وہ تخریبی قوتوں کے شر سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور اپنے مقاصد کو حاصل بھی کرتے ہیں -

دنیا کے مذاہب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہے - جن میں انسان گرفتار ہوتا ہے - لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا - اس کے نزدیک ان تباہیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو

حاصل کرنے (Positive Achievement) کا نام کامیابی ہے۔ (دیکھئے عنوان ف۔ ل۔ ح اور ن۔ ج۔ و)۔ یہ مثبت کامیابی، اس دنیا میں سربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت۔ یہی فوز عظیم ہے۔

ف و ض

فَوَضَّ إِلَيْهِ الْأَمْرَ تَفْوِضَ يَفْضِي - اس نے معاملہ اس کی طرف لوٹا دیا، اس کے حوالہ کر دیا*۔ اس معاملہ کا فیصلہ اس کے اوپر چھوڑ دیا۔ اَلْمُتَّفَاوَضَةُ کے معنی ہوتے ہیں ایک دوسرے کے برابر اور شریک کار ہونا۔ مَتَّاعُهُمْ فَوَضَّ بَيْنَهُمْ - ان کا سامان اس طرح ان کے درمیان مشترک ہے کہ اس میں ہلا تخصیص غیرے سب برابر کے شریک ہیں۔ اسلئے قَوْمٌ فَوَضَّی اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تمام لوگ برابر ہوں۔ کوئی کسی پر حکم نہ چلائے، نہ کوئی کسی سے مشورہ کرے۔ اور نہ ان کا کوئی حاکم اور لیڈر ہو*۔ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جن کا معاملہ غیر واضح اور گڈمڈ ہو۔ ان میں سے کوئی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتا ہو اور ایک دوسرے پر کام ڈالتا ہو۔ اسی سے آجکل فَوَضَّوْا بَيْنَهُمُ اَنَارِكِي (Anarchy) کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَ اَفْوَضُ اَمْرِي اِلٰی اللّٰهِ (۳۳)۔ میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اسے اپنے معاملہ کا مختار بناتا ہوں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی پر تکیہ کرنا اور اس کے سپرد کر دینا ہیں۔ جماعت مومنین قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتی ہے اور اپنے معاملات کو انہی کے سپرد کر دیتی ہے۔

ف و ق

فَوْقُ - تَحْتَ کی ضد ہے۔ تَحْتَ کے معنی نیچے اور فَوْقُ کے معنی اوپر۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اَسْفَلَ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے (۳۳)۔ فَوَاقٍ فَوْقًا کے معنی ہیں کسی سے کسی بات میں زیادہ ہولنا۔ فَوْقُ کے معنی کبھی دُونُ یعنی ورے اور کمتر کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی کہے کہ فُلَانٌ صَغِيرٌ (وہ چھوٹا ہے) اور اس کے جواب میں کہا جائے وَ فَوْقَ ذَٰلِكَ تُوْبَهَا فَوْقَ سے مراد ہوگا اس سے بھی چھوٹا (جتنا تم

بتا رہے ہو) * - (۲۹) میں یہی مفہوم ہے - لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی یہ اوپر ہی کے معنی رکھتا ہے - یعنی مجھ سے بڑے مثلاً مکڑی وغیرہ -

الْفَتَاقُ * - ہر چیز کا بہترین حصہ - تَفْتَوَّقَ عَلٰی قَوْمٍ مِیْہ کے معنی ہیں وہ رتبہ میں اپنی قوم پر بلند ہو گیا - اس اعتبار سے قرآن کریم میں لفظ فَوَّقَ غلبہ و تسلط کے معنوں میں آیا ہے - يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (۱۱۰) - ان پر خدا کا جو غلبہ و تسلط ہے اس سے خائف رہتے ہیں - اِلْفَاقَةُ * - فَوَاقُ اور فَوَاقُ اس وقفے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہو - یا یہ کہ اونٹنی جنگل سے چر کر آئے تو اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس کا دودھ دوھا جائے * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی لوٹ آنا بھی ہیں - چنانچہ فَوَاقُ الْفَاقَةِ کے معنی ہیں دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا - سورة اعراف میں ہے - فَلَمَّا آفَاقَ (۳۴۱) - جب اسے غش کے بعد ہوش آیا - جب اس میں سکون پیدا ہوا - نِزَ فَوَاقُ * ہچکی کو کہتے ہیں * - سورة ہود میں ہے مَسَّالَهَا مِیْنِ فَوَاقٍ (۱۸۸) - اس میں وقفہ نہیں ہوگا - ابن فارس نے اس کے معنی رجوع اور ہلٹ کر آنا لکھے ہیں - یعنی تکرار اور دوبارہ ہونا - اِلْفَاقَةُ * - فقر اور ضرورت کو کہتے ہیں - اِلْفَاقُ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی فقیر اور حاجت مند ہو گیا * -

ف و م

الْفُؤْمُ * - بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاء، ثاء سے بدل دی گئی ہے اور اصل میں یہ لفظ فُؤْمُ (بمعنی لہسن) ہے - مگر صحیح یہ ہے کہ الْفُؤْمُ * کیہوں کو کہتے ہیں اور روٹی کو بھی - نیز ان تمام غلیوں کو کہتے ہیں جن کی روٹی پکائی جاتی ہے - بعض نے کہا ہے کہ الْفُؤْمُ * چنے کو کہتے ہیں ** -

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۱) میں آیا ہے -

ف و ہ

فَہ * - فُؤہ * - فِیْہ * - سب کے معنی مَنہ (فم) کے ہیں - جمع أَفْوَاهُ * - لَا فَوَہُ * - مسالے نیز وہ چیزیں جو خوشبو کے لئے ڈالی جاتیں - قسم قسم

* تاج و راغب - ** تاج -

کے پھول اور کلیاں - انواع و اقسام کی چیزیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کھلنے کے ہیں - (یعنی کسی چیز کا پسند نہ ہونا بلکہ کھلا ہونا)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں کسی کی بات (قَوْلٌ) کو فَمٌ یا فَوَہ کی طرف منسوب کیا ہے وہاں اس کے جھوٹ کی طرف اشارہ ہے - یعنی وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں - ان کے دل کی تائید اس کے ساتھ شامل نہیں ** - يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۱۶۶) - وہ زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں -

فی (حرف)

فی (۱) ظرفِ مکان یا ظرفِ زمان کے لئے آتا ہے - جیسے ، مسجد میں - یا چند سال کے عرصہ میں - فَاصْبِرْ فِي السَّاعَةِ بِنْتِ (۲۸) - پس وہ صبح کے وقت شہر میں آیا - يَا غُلِيْبَتِ الشَّرُّومُ فِي بَيْضِ مِصْرَ (۳۰۴) رومی مغلوب ہو گئے ، (اور وہ مغلوب ہونے کے بعد غالب اُجائیئنگے) چند سال کے عرصہ میں - یا ویسے ہی ”میں“ کے معنوں میں - مَثَلًا وَلَكُمْ فِي الْقِيَصَاصِ حَبْلُوةٌ (۱۲۹) - تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے -

(۲) معیت (ساتھ) کے معنوں میں - قَالَ ادْخُلُوا فِيْ اُمَمٍ (۳۸) - ان سے کہیگا کہ تم (سابقہ) امم کے ساتھ (جہنم میں) داخل ہو جاؤ - یعنی انہی میں شامل ہو جاؤ -

(۳) سبب کے لئے - قَالَتْ فَذَا لِيَكُنَّ الَّذِي لُعْمَتُنِّيْ فِيْهِ (۱۲) - (عزیز کی ہورت نے) کہا کہ یہی وہ ہے جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں -

(۴) علی (اوپر) کے معنوں میں - وَلَا صَلَیْبَ لَكُمْ فِيْ جَذْوَعِ النَّخْلِ (۲۱) - میں تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دوں گا -

(۵) الی (تک - کی طرف) کے معنوں میں - فَرَدُّوْا اَیْدِیْہُمْ فِيْ اَفْوَاهِہِمْ (۱۹) - تو وہ اپنے ہاتھ ان کے منہ تک لئے گئے -

(۶) مین (سے) کے معنوں میں - وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ کُلِّ اُمَّةٍ شَہِیْدًا - جس دن (۸۹) - ہم ہر امت میں سے شاہد کھڑے کریں گے -

(۷) مقابلہ کے لئے - فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (۲۸) - متاع دنیا آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہے -

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے - قَالَ ارْكَبُوا فِيهَا (۱۱) - اس نے کہا کہ اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ - فی اس لئے زائد ہے کہہ خالی ارْكَبُوا ہا کے بھی وہی معنی ہیں -

(۹) سورہ عنکبوت میں ہے - وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹) - اس کے معنی ہونگے ، جو لوگ ہمارے لئے یا ہماری راہ میں یا ہماری (متعین کردہ منزل) کی طرف آنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہ نمائی کر دیتے ہیں (یہ مثال لغت کی کسی کتاب میں نہیں ملی) -

فی ا

فَیْءٌ - سایہ - محیط میں ہے کہ طلوع آفتاب سے لیکر زوال آفتاب تک کے سایہ کو ظیلؓ کہتے ہیں ، اور زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کے سایہ کو فَیْءٌ - چونکہ سایہ لوٹ کر آتا ہے اسی لئے فِئَاءٌ کے معنی لوٹنے یا واپس آنے کے ہوتے ہیں اور اَفْئَاءٌ کے معنی لوٹانے اور ہلانے کے - فَیْءٌ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہوتے ہیں - مال غنیمت اور خراج کو بھی فَیْءٌ کہتے ہیں ، اسلئے کہ وہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کی طرف لوٹ آتا ہے -

سورہ نحل میں ہے - يَتَفَقَّهُوْهُ ظِلِلُهُ عَنِ الشِّمَائِلِ (۱۶) - اس کا سایہ دائیں بائیں لوٹتا رہتا ہے -

سورہ حجرات میں ہے - حَتَّى تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ - (۲۹) - تاوقتیکہ وہ قانون خداوندی کی طرف لوٹ نہ آئے -

قرآن کریم نے فیؓ اور غنیمت کا الگ الگ ذکر کیا ہے - مال فیؓ کے متعلق سورہ حشر میں ہے وَمَا أَفْئَاءُ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَىٰ سِنٍ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلِلَّهِ اللَّهُ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ (۵۹) - ”اور اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان سے جو مال فیؓ دلایا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ - لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جسپر چاہتا ہے تسلط دیدیتا ہے“ - اس سے ظاہر ہے کہ مال فیؓ وہ ہے جو بغیر لشکر کشی کے حاصل ہو جائے - ہو سکتا ہے کہ

اس میں (دشمن سے حاصل کردہ مال کے علاوہ) وہ مال بھی شامل ہو جو صوبے، اپنی ضروریات سے فاضل، مرکز کی طرف بھیج دیں۔ مال فی کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ یہ ”اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربىٰ کے لئے۔“ مساکین اور ابن السبیل کے لئے ہے۔“ اس کے بعد ”کی لا یَکُونُ دَوْلَةً بَیْنَنَا وَلَا غَنَیْبًا مِّنْکُمْ۔“ تاکہ یہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے۔“ یہ اصول قومی معیشت کے ایک بنیادی نکتہ کو بیان کرتا ہے۔ یعنی دولت کی گردش (Circulation) اوپر کے طبقہ ہی میں نہیں ہوتی رہنی چاہئے۔ اس کے بعد ”وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹)۔“ جو کچھ تمہیں رسولؐ دے اے لے لو۔ اور جس سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔“ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے مملکت کی دولت کے مصارف کی اصولاً نشاندہی کر دی ہے لیکن اس کی تفصیلی تقسیم کا حق مرکز کو دیا ہے جو مقتضائے حالات کے مطابق خرچ کریگا۔

مال غنیمت کے متعلق سورۃ انفال میں ہے ”وَاَعْلَمُوْا اَنْتُمْ غَنِمْتُمْ مِّثْنًا شَیْئًا فَاَنْ لِّلّٰهِ خُمُسُهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ... (۸۱)۔“ اور سمجھ لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربىٰ کے لئے۔ یتامیٰ۔ مساکین اور ابن السبیل کے لئے۔“

صدقات کے مصارف کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ وہ ”فقراء۔ مساکین۔ اور صدقات کے کارکنوں کے لئے ہیں۔ اور ان کے لئے جنکی تالیف قلوب ضروری ہے۔ اور بندہ نون میں جکڑے ہوئے لوگوں کو آزاد کرائے کیلئے۔ اور مقروض و مصیبت زدوں کے لئے۔ اور ”اللہ کی راہ“ میں خرچ کرنے کے لئے اور ابن السبیل کے لئے... (۹۰)۔“

مال فی اور غنیمت کے مصارف میں ”ذی القربىٰ“ کے متعلق استاذ محمدؒ عترة دروزہ نے اپنی کتاب ”الدستور القرآنی“ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ”رشتہ دار“ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اسلام میں پیش پیش رہے ہوں اور جنہوں نے اسلام اور ملت کے لئے مفید خدمات سرانجام دی ہوں۔ لیکن قرآن کریم کے دیگر مقامات سے اس مفہوم کی تائید نہیں ملتی۔ البتہ اس نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہؐ کے رشتہ دار نہیں، تو یہ چیز قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

ف ی ض

فَاضَ الْمَاءُ* - يَفِيضُ* - فَيُضِيضُ - فَيُضِيضُ* - فَيُضِيضُ* کسی جگہ پانی کا بہت زیادہ جمع ہو کر وہاں سے نکل پڑنا اور بہہ نکلنا - آنسوؤں کے بہنے کے لئے بھی آتا ہے (۸۴) - حَسُوْضٌ* فَيَاضُ* - لِبَابٍ بَهْرًا هَوَا حَوْضٍ - بَحْرٌ* فَيَاضُ* - ہر جوش سمندر جس کا پانی اوپر سے اچھل کر نکل رہا ہو - الْفَيْضُ* دریا اور نہر کو کہتے ہیں - فَيَقَاضُ* - بہت پانی والی نہر - قَاضٍ الْمَالُ* يَفِيضُ* - مال بہت زیادہ ہو گیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آسانی سے بہنے کے ہیں - یہیں سے یہ لفظ لوگوں کے کثیر تعداد میں ادھر ادھر جانے کے لئے استعمال ہونے لگا - چنانچہ آ"لِافْاضَةٍ" کے معنی ہیں کثیر آدمیوں کا تیزی کے ساتھ چلنا - یکبارگی چل پڑنا - یکبارگی روانگی اور واپسی کو افاضۃ* کہتے ہیں - نیز باتوں میں بہ جانے (مشغول ہو جانے) کو بھی* - در اصل الافاضۃ* کے معنی لٹکانا ، اوپر سے گرانا اور بہانا ہیں (۵۰)۔

چل پڑنے کے معنوں میں قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۹۹) میں آیا ہے - باتوں میں لگ جانے کے لئے (۲۸) میں - اور باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے ، دونوں معنوں میں (۲۳) میں -

ف ی ل

الْفَيْلُ* - ہاتھی* - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ "فیل" سے معرب ہے - اور جو لفظ فیل* عربی الاصل ہے اس کے معنی کمزوری کے ہوتے ہیں - رَجُلٌ* فَيْلٌ* الرَّأْيِ - کمزور رائے والا آدمی -

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْفَيْلِ (۱۰۵) آیا ہے - اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرہہ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لیکر کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا اور اس کے لئے اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں ، خفیہ راستہ اختیار کیا تھا - لیکن گدھوں کے جھنڈ ، جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کسی طرف جا رہی ہے اس لئے ہمیں ان کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک (لاشیں) ملیں گی ، ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آگئے - انہیں دیکھ کر قریش حرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آ رہا ہے - چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور

کا ہتھراؤ کیا۔ کچھ تو خود ان ہتھروں سے ، اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی
 بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے ، وہ فوج بھس کی
 طرح ہو گئی۔ یہ سارا واقعہ سورۃ فیل میں بیان ہوا ہے۔ واقعہ ایسا تھا
 جسے مخاطبین عرب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ، اس لئے وہ جانتے تھے
 کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے۔ قرآن کریم کا اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ تم
 اس دین حق کی مخالفت چھوڑ دو ورنہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

ق

قارون

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون، هامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا (۲۴۰)۔ اور ان دونوں کی طرح قارون بھی ہلاک ہوئے والوں میں سے تھا (۲۴۱)۔ قارون قوم موسیٰؑ میں سے تھا اور سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے (۲۴۸)۔ تورات میں ہے کہ قارون (قرح بن ظہار بن قیات بن لاوی) حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے اٹھا (گنتی ۱۰)۔ یہودیوں کا مشہور مؤرخ جوزیفس، اپنی تاریخ (Antiquity of the jews) میں لکھتا ہے کہ

قارون جسکی شہرت اس کے نسب اور اسکی دولت دونوں وجہ سے تھی، عبرانیوں کے مشاہیر میں سے تھا۔ اسے حضرت موسیٰؑ سے حسد پیدا ہوا اور اس نے تمام بنی لاوی کو اور اپنے اہل خاندان کو ان کے خلاف ابھارا (حصہ ۴ - باب ۳ - فصل ۲) جیوٹس انسائیکلوپیڈیا میں ہے

قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جو خزانے مصر میں دفن کئے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ تین سو خچروں کی ضرورت تو محض اس کے خزانے کی کنجیاں اٹھانے کیلئے ہوتی تھی۔ (جلد ۷ - صفحہ ۵۵۶)۔

چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دھوت انقلاب، نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو مٹانے کیلئے ہوتی تھی اسلئے قرآن کریم نے خصوصیت سے قارون کا ذکر کیا ہے۔ سرمایہ پرست کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ (وہ سمجھتا ہے کہ) میں جو کچھ کماتا ہوں وہ میری اپنی ہنرمندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے اس لئے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ

نہیں۔ میں جتنا جی چاہے جمع کروں اور ایسے جس طرح جی چاہے صرف کروں۔
 قارون (جسے قرآن کریم نے اس ذہنیت کے ایک ترجمان کی حیثیت سے پیش
 کیا ہے) یہی کہتا تھا۔ قَالَ لَانْتُمَا اَوْ تَبْتَغُوْنِ عَلٰی عِلْمِیْ (۲۸)۔
 ”وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا ہے۔“ قرآن کریم
 کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹) یہ ان لوگوں کی بڑی غلط نگہی اور گمراہی
 ہے۔ جس چیز کو انسان اپنی ہنر مندی اور ذاتی صلاحیت کہتا ہے ذرا سوچئے
 تو سمجھی کہ اس میں کتنا حصہ اس کا اپنا ہے اور کتنا حصہ قدرت کا عطیہ۔
 خود انسانی ذہن اور اسکی استعداد کو لیجئے۔ یہ کسی فرد کی نہ اپنی پیدا
 کردہ ہوتی ہے نہ زر خرید۔ یہ خالصہً موهبت خداوندی (عطیہ فطرت) ہے۔
 اس سے آگے وسائل پیداوار (زمین اور مافیہا) کو لیجئے تو یہ تمام کے تمام
 فطرت کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو انسان جو کچھ
 حاصل کرتا ہے اس میں محنت (Labour) اسکی اپنی ہوتی ہے، باقی سب کچھ
 خدا کا عطا کردہ۔ لہذا اس میں اسکا صرف حق المہنت ہوتا ہے۔ باقی سب
 کچھ خدا کا ہوتا ہے۔ خدا ”اپنے حصے“ کے متعلق کہتا ہے کہ ایسے نوع انسانی
 کی عام پرورش (ربوبیت عامہ) کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ لہذا قارونی
 (سرمایہ دارانہ) ذہنیت، قرآن کے نظام ربوبیت کی ضد ہے، اور اس کا نتیجہ
 تباہی اور بربادی۔ اسی لئے قرآن کریم نے قارون کے اس قول کے بعد جسے
 اوپر درج کیا گیا ہے کہا ہے کہ اَوَلَمْ يَتْلُكُمُ اللّٰهُ فَاَنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۲۸)۔
 ”کیا ایسے علم
 نہ تھا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی اسی قوموں کو تباہ کر دیا جو طاقت اور جمیعت
 میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی تعمیر میں
 خرابی کی صورت مضمحل ہوتی ہے اس لئے یہ نظام کبھی پتہ نہیں لے سکتا۔

ق ب ح

التَّبْيِيْحُ*۔ وہ چیز جسے نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے اور وہ عمل جس
 سے انسان کا دل نفرت کرے۔ مَتَّبِعُوْحُ*۔ وہ شخص جسے ذلیل و خوار سمجھا جائے
 اور دھتکار دیا جائے۔ وہ چیز جسے بدنما بنا دیا گیا ہو۔ نیز جسے خیر سے دور رکھا
 جائے*۔ ابن فارس نے تَبْيَحُّہُ کے معنی ایسے ہٹایا اور دور کر دیا لکھے ہیں، اور
 اس مادہ کے بنیادی معنی حسن کی ضد بتائے ہیں۔ نَاقَةُ تَبْيِيْحَةٍ الشَّيْخَبِ وہ
 اونٹنی جس کے تھنوں کے سوراخ بہت وسیع ہوں۔ تَبْيَحُ التَّبْيِيْحَةُ۔ اس

*راغب و تاج و محیط۔

نے انڈے کو توڑ ڈالا - نیز ہر چیز کو توڑے پھوڑے کے لئے بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے - الْقَتْبُحُ - حسن کی ضد ہے * -

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے هُمْ مِّنَ الْمُتَقَبِّحُوْنَ حِیْثُنَ (۲۴۹) - وہ زندگی کی تمام خوشگوار یوں سے محروم کر دئے جائیں گے - وہ ذلیل و خوار ہوں گے - ان کی صلاحیتیں ضائع چلی جائیں گی -

ق ب ر

الْقَبْرِ - میت کو دفن کرنے کی جگہ - الْقَبْرَةُ - قبرستان - قَبْرُهُ - یَتَقَبَّرُهُ - وَ یَتَقَبَّرُهُ - اس نے ایسے دفن کر دیا * - سورہ عبس میں ہے - ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاَقْبَرَہُ (۸۱) - پھر خدا اسے مارتا ہے (موت دیتا ہے) اور اسے قبر میں رکھواتا ہے - اس کے لئے قبر مہیا کرتا ہے یا ایسے قبر میں دفن کرنے کا کہتا ہے - یہاں قَبْرُهُ نہیں کہا بلکہ اَقْبَرُهُ کہا ہے - کیونکہ قَبْرُهُ اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کو اپنے ہاتھ سے دفن کرے - مَقْبَرَةُ کی جمع مَقَابِرُ آتی ہے - سورہ تکوین میں ہے اَرْزُقْهُمْ اَلْمَقَابِرَ - (۱۲۴) - قرآن کریم میں مِّنْ فِی الْقُبُورِ (۲۲ ; ۳۵) کثابۃ ان کے لئے بھی آیا ہے جو زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو چکے ہوں یا جہالت اور تعصب میں اس درجہ آگے بڑھ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو - (تفصیل کے لئے دیکھئے - م - و - ت اور ح - ی - ی کے عنوانات)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے مَرْدُوں کے متعلق قبر یا مرقد وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں (مثلاً مِّنْ بَعَثْنَا مِیْنَ مَرْدُوْنَ - ۳۶) - تو اس سے مراد یہ نہیں کہ مردے کسی خاص مقام (قبروں) سے اٹھائے جائیں گے - اگر یہ مراد ہو تو ان مَرْدُوں کی بابت کیا کہا جائیگا جنہیں دفن نہیں کیا جاتا ؟ دفن کرنا تو مَرْدُوں کی (Disposal) کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے - اس کے علاوہ مختلف اقوام کے ہاں اور طریقے بھی رائج ہیں - قرآن کریم کا مقصد موت کے بعد کی زندگی کو بیان کرنا ہے - عربوں کے ہاں چونکہ مَرْدے قبروں میں گاڑے (دفن کئے) جاتے تھے اس لئے قرآن کریم نے قبروں کا ذکر کیا ہے، ورنہ حیات بعد الممات کے لئے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے نہ اس جسم کی ضرورت جو موت کے ہاتھوں تلف ہو جاتا ہے - موت کے بعد زندگی یقینی ہے لیکن اس زندگی کے لئے پیکر یا مظہر کس قسم کا ہوگا، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے - ویسے بھی اصل مقصد تو زندگی سے ہے، نہ کہ اس کے مظاہر سے -

ق ب س

الْقَبَسُ - آگ کا شعلہ (یا چنگاری) جسے کسی بڑی آگ سے حاصل کیا جائے۔ الْقَبَسُ - آگ کی چنگاری *۔ سورہ طہ میں ہے۔ اَنِيْزْكُمْ مِّنْهُمَا بِقَبَسٍ (۲۰) میں اس آگ سے تمہارے پاس شعلہ لے آؤں۔ اَفْتَبَسَ - اس نے بڑی آگ سے کچھ آگ لے لی *۔ سورہ حدید میں ہے۔ نَفْتَبِسُ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۱۳) - ہم تمہاری روشنی سے کچھ روشنی لے لیں۔ تمہارے دیے سے اپنا دیا جلا لیں۔ اس سے اَفْتَبَسَ الْعِلْمُ کے معنی ہیں کسی سے علمی استفادہ کرنا *۔

ق ب ض

قَبَضَ عَلَيْهِ يَمْدِهِ - اس نے اسے اپنے پورے ہنچے سے پکڑ لیا۔ گرفت میں لے لیا۔ قَبَضَ يَدَهُ عَنْهُ - اس نے اسے پکڑنے سے اپنے ہاتھ کو سکیڑ لیا۔ یا کھینچ لیا۔ دراصل قَبَضَ کے معنی کھینچ لینے یا سکیڑ لینے کے ہوتے ہیں **۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کو لے لینا اور (۲) کسی چیز کا سکیڑ اور سمٹ کر مجتمع ہو جانا بتائے ہیں۔ یہ بَسَطَ کی ضد ہے (۲۴۵) جس کے معنی پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں۔ سورہ فرقان میں ہے۔ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا (۲۹) پھر ہم اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

قَبْضَةٌ - ملکیت۔ سورہ زمر میں ہے۔ وَاَلَا رُءُوسُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمُوءَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهِ (۳۹)۔ آسمانی انقلاب کے دور میں معاش کے تمام ذرائع اسی خدا کی ملکیت میں ہونگے جس کے تصرف میں کائناتی نظام ہے۔ یعنی اس وقت انسانی معاش بھی خدا ہی کے قانون کے تابع ہوگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کائنات میں خدا کا قانون چل رہا ہو اور زمین (انسانی معاش) میں انسانوں کا خود ساختہ قانون۔ یہ شرک ہے۔

قَبْضَةٌ - اختیار کرنا۔ سورہ طہ میں سامری کے متعلق ہے کہ اس نے کہا کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الْقَرْسُوْلِ (۲۶)۔ میں نے رسول (حضرت موسیٰ) کے نقش قدم (مسلك و مشرب) میں سے بہت تھوڑا سا اختیار کیا۔ یعنی میں نے ان کی بہت تھوڑی سی پیروی کی۔ فَتَبَذْتُهَا - اور پھر اسے بھی چھوڑ دیا ***۔

مَقْبُوضَةٌ - قبضہ کی ہوئی۔ ہاتھ میں لی ہوئی۔ (۲۸۳)۔

* تاج و محیط و راغب۔ ** تاج۔ *** ابو مسلم اصفہانی بحوالہ غریب القرآن۔ میرزا ابو الفضل۔

سورہ ملک میں ہر نندوں کے متعلق ہے۔ صَفَاتٍ وَبَتَّبِعْنِ (۱۶)۔
اس کے عام معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں اور سکڑتے ہیں۔ لیکن
صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ قَبَضَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں ہر نندے
نے اڑنے میں تیزی کی۔ اسی طرح فَرَسٌ قَبِيضٌ الشَّيْطَانُ کے معنی ہیں
تیزی سے پاؤں اٹھانے والا گھوڑا*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی
لکھے ہیں۔

ق ب ل

قَبْلٌ - بَعْدٌ کی ضد ہے۔ قرآن کریم میں ہے رَبُّهُ لَا مَرُّ مِنْ قَبْلُ
وَمِنْ بَعْدُ (۳۰)۔ ”پہلے اور پیچھے اللہ ہی کا امر ہے“۔ نیز قَبْلٌ کے
معنی ”بغیر“ کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے قَبْلُ أَنْ تَنْفَذَ
كَلِمَتُ رَبِّي (۱۸۹) جس کے معنی ہیں ”بغیر اس کے کہ میرے رب کے کلمات
پورے ہو سکیں***“۔ (اگرچہ یہاں اس کے معنی ”قبل اس کے“ بھی ہو سکتے ہیں)۔
الْقَبْلُ الْقَبْلُ۔ (یہ الدَّيْبُ و الدَّيْبُ پیچھے کی ضد ہے۔ یعنی)
آگے۔ سورۃ یوسف میں ہے وَلَئِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قَبْلُ (۱۲)۔
”اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے“۔

الْقَبْلُ - پہاڑ کا دامن (عرض میں)۔ الْقَبْلُ مِنْ الزَّمَانِ - زمانہ
کا اولین حصہ۔ الْقَبْلَةُ - بوسہ۔ قَدَّوْا بِلُ الْاَلَمَرِّ - کسی معاملہ کے
ابتدائی امور۔ مبادیات۔ الْقَبْلَةُ - آنیوالی شب۔ نیز وہ عورت جو بچہ
جنائے***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا دوسری
چیز کے آمنے سامنے ہونا ہیں۔ رہ گیا قَبْلُ کا لفظ جو بَعْدُ کی ضد ہے تو
وہ اس بنیادی معنی کے تحت نہیں آتا۔ لہذا وہ خلاف قیاس ہے، اگرچہ یہ
تاویل کی جا سکتی ہے کہ جو چیز پہلے واقع ہوتی ہے وہ زمانہ کے سامنے آرہی
ہوتی ہے۔ لیکن یہ توجیہ قرین قیاس نظر نہیں آتی***۔

قَبْلٌ کے معنی ہیں آمنے سامنے۔ نیز طرف، جہت، رخ، سمت۔ یہ
بمعنی عِنْدَ بھی آتا ہے۔ یعنی پاس، نزدیک۔ اس کے معنی تاب و توان اور
طاقت کے بھی ہیں۔ سورۃ حدید میں ہے وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ
(۵۶)۔ اس کے معنی ”باہر کی جہت“ یا باہر کی طرف، سامنے سے عذاب،

دونوں آسکتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں قِبَلِ الشَّمْسِ (۱۲۷) آیا ہے۔ اس کے معنی مشرق کی سمت ہیں۔ لیکن اگر قِبَلِ کو قِبْلۃ کی جمع تصور کر لیا جائے تو اس کے معنی ”مشرق و مغرب کے تمام قبلے“ ہونگے۔ (تفصیل آگے چل کر آئیگی)۔

تَقَبَّلَہُ وَقَبِلَہُ - اس نے اسے لیے لیا۔ منظور کر لیا۔ قبول کر لیا*۔ قرآن کریم میں ہے وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (۲۴)۔ ”اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے“۔ دوسری جگہ ہے قَابِلِ التَّوْبِ (۳۱)۔ ”توبہ قبول کرنے والا“۔ تَقَبَّلَہُ - کسی چیز کو اس طرح قبول کرنا کہ وہ اجر و ثواب کی مستحق ہو*۔ لِنَقْمَا بِتَقَبُّلِ اللَّهِ مِّنَ الْمُتَّقِينَ (۲۷)۔ ”اللہ صرف متقین کا عمل قبول کرتا ہے“۔ ان آیات میں ”قبول کرنے“ سے مراد کسی چیز کا لیے لینا ہیں (جیسے ہم کسی کا نذرانہ لیے لیتے ہیں)۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عمدہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اعمال اس کے مقرر کردہ قوانین اور قاعدے کے مطابق سرزد ہوں وہی خوشگوار نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ (۳۱)۔ ”خدا نے اسے اچھی قبولیت سے قبول کیا“۔ قَبِيلٌ وَقَبَلٌ - کھلم کھلا۔ رو در رو۔ آمنے سامنے۔ (نیز قَبِيلٌ کے معنی ذمہ دار۔ کفیل۔ اور نمائندہ کے بھی ہوتے ہیں)*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَحَشَرْنَاهُمْ إِلَىٰ قَبَلٍ شَدِيدٍ قَبَلًا (۱۱۲)۔ ”ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے“۔ الْقَبِيلُ - طاقت اور قوت*۔ فَلَنَنَازِلَنَّهُمْ بِجَنَّاتٍ لَا قَبِيلَ لَهُمْ يَهَيَّا (۲۷)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ہمارے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ وہ ان کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ الْقَبِيلُ - شوہر۔ نیز تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت جو مختلف قبیلوں اور قوموں یا ایک ہی جسدِ اعلیٰ سے متعلق ہوں۔ الْقَبِيلۃ - خاندان۔ ایک باپ کی اولاد (جمع قَبَائِل)۔ (۱۱۲)۔ قَبَائِلُ الرَّاسِ سر کی ہڈیاں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ اولاد اسماعیل کے لئے قَبِيلۃ کہتے ہیں اور اولاد اسحاق کے لئے سَبِط (جمع سَبَط)۔

الْقَبِيلۃ - کنوئیں کے منہ پر رکھی ہوئی بڑی چٹان۔ اَقْبَلَہُ - وہ اس کی طرف آیا۔ اَقْبَلَہُ الرَّجُلُ - اسے حماقت کے بعد عقل آگئی۔

قَابِلَتَهُ - مُقَابِلَتَهُ - وہ اس کے آمنے سامنے ہوا - رُو بَرُو ہوا - اَقْبَلَ عَلَیْهِ - اس کی طرف متوجہ ہوا - اَقْبَلَ عَلَی الْاَمْرِ - وہ اس کام میں لگ گیا اور اسے چھوڑا نہیں - اسے اپنے سامنے رکھ لیا - تَقَابَلَا - وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے* - قرآن کریم میں ہے اِخْسَوْاْ اَنَاْ عَلَی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ (۱۵۸) - یعنی وہ بھائیوں کی طرح تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہونگے -

اَلْقِبْلَتَةُ - اس لفظ کے اصل معنی جہت یا سمت کے ہوتے ہیں - لیکن عرف عام میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف نماز میں رخ کیا جائے* - جسے سامنے رکھا جائے - جو ”پیش نظر“ رہے - جو مقصودِ نگاہ یا نصب العین ہو -

دین کے نظام میں قبلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے - ہر نظام، ہر مملکت، ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افراد معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں - جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے - یہ دراصل نشان (Symbol) ہوتا ہے اس نظام یا حکومت کا جسے ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوتا ہے - اسے پیش نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفاداری کا اظہار ہوتا ہے - حکومت خداوندی کا محسوس قبلہ، اس مقام کے علاوہ اور کونسا مقام ہو سکتا تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِنْ اَوَّلُ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةٍ مَّبَارَکًا وَهُدًیً لِّلْعَالَمِیْنَ (۲۴۸) یعنی - دنیا کے ہتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا - جسے تمام اقوام عالم کے لئے راہ نمائی کا نشان بنایا گیا - جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مَن دَخَلَهُ کان آمِنًا (۲۶۶) - ”جو اس میں داخل ہو گیا اسے دنیا جہاں کی آفات سے امن مل گیا“ - قبلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اتباع کو قرآن کریم نے دین کے اتباع سے تعبیر کیا ہے - چنانچہ سورۃ بقرہ میں ایک جگہ ہے وَلَئِنْ اَتَیْتِ الَّذِیْنَ اَوْثَرُوا الذِّکْرَ بِمِکْلِ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَتِ بَعْضٍ (۱۳۵) - ”اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے تمام آیات (دلائل) بھی لے آئے تو بھی وہ تیرے قبلہ کا اتباع نہیں کریں گے - اور نہ تو ان کے قبلہ کے تابع ہوگا - اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں - دوسری جگہ ہے وَلَئِنْ تَرَضِیْ عَنْکَ الْیَہُوْدُ وَلَا النَّصَارَیْ حَتّٰی تَتَّبِعَ مِیْلَتَهُمْ (۱۳۰) -

”یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک تو ان کی ملت (مسلک) کا اتباع نہ کریگا“۔ اس سے ظاہر ہے کہ قبلہ، درحقیقت ملت و مسلک (دین) کا محسوس نشان ہے اور اتباع قبلہ سے مراد اتباع دین ہے۔

جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہوں، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے مرکز (قبلہ) کی طرف مرکوز رکھیں۔ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَرْقًا (۲۴۱)۔ ”تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو“۔ یعنی اپنی توجہات کو اس کی طرف مرکوز کرو۔ تمہارا نصب العین حیات ایک ہو اور یہی وحدت نصب العین تمہاری وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے۔

اسی کی محسوس شکل، اجتماعات صلوة میں کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی تبيين کے لئے فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الشَّرْقِ وَ الْمَغْرِبِ..... (۲۴۲)۔ ”کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف“۔ [اگر قبیلہ کو قبیلۃ کی جمع تصور کر لیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب میں جس قدر قبلے ہیں، وہ کسی قوم کے یا کسی مذہب کے ہوں، ان کی ساری اہمیت اضافی ہے۔ ذاتی نہیں]۔ بات بالکل واضح ہے۔ جو چیزیں کسی نظام کے لئے محسوس نشانات کا کام دیتی ہیں جب تک وہ نظام قائم رہے، ان نشانات کی اہمیت حتمی اور یقینی، اور ان کا احترام و التزام نہایت ضروری ہوتا ہے۔ (اسی کو دوسری جگہ شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر) لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہے تو ان نشانات کا احترام محض ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ لطیف اور اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے ایک جگہ تاکیداً کہا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اپنے دین اور نظام کے محسوس مرکز کی طرف رکھو۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری وفا شعاریوں کا مرکز کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس مرکز کی طرف منہ کرنا مقصود بالذات ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظام گم ہو جائے اور قوم انفرادی زندگی بسر کر رہی ہو، لیکن اس کے دل میں اس نظام کے قیام کی آرزو ہو، تو اس وقت قبیلۃ کسے بنایا جائے؟ یعنی اس وقت اجتماعی زندگی کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی

کہ ایسے حالات میں وَاجْعَلُوا بِئُوتُوتُكُمُ قِبْلَةً ۚ وَاقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۱۸۷)۔ یعنی ”اپنے گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز بناؤ اور وہیں سے نظام صلوٰۃ کے قیام کی ابتدا کردو“۔ یعنی اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے (ایک خاندان کو وحدت (Unit) تصور کر کے) کرو۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پوری کی پوری قوم کو محیط ہو جائیگا اور سب کے لئے ایک قبلہ قائم ہو جائیگا۔

یہودیوں کے لئے یہ اجتماعی مرکز بیت المقدس تھا۔ لیکن یہودیوں نے دین خداوندی کو اپنی نسل تک محدود کر لیا، لہذا یہ مرکز بھی ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا۔ عالمگیر انسانی برادری کا مرکز نہ رہا۔ ایک یہود پر ہی کیا موقوف، اُس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم کے سامنے بھی عالمگیر انسانیت کی وحدت کا تصور نہیں تھا۔ ان کے برعکس، قرآن کریم کے پیش نظر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا، اُس لئے وہ مختلف قومی مراکز میں سے کسی کو بھی اپنا مرکز قرار نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اس کعبہ کو مرکز قرار دے سکتا تھا جس کی بناء حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں اسی مقصد کے لئے رکھائی گئی تھی۔ (۱۲۷)۔ اس مقام کو مَثَابَةٌ ۚ لِلنَّاسِ وَآمَنًا (۱۲۵) قرار دیا گیا تھا۔ یعنی تمام نوع انسان کے لئے مرجع اور پناہ گاہ۔ یہ سَوَاءٌ ۚ لِّلْعٰلَمِیْنَ قِیْمٌ ۚ وَالتَّبَادُلُ (۲۲۵) تھا۔ یعنی وہاں کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ یہ بنایا ہی تمام انسانوں کے قائدے کے لئے گیا تھا (۲۵۳)۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو دین خداوندی کا مرکز (قبلہ) بنایا گیا۔

جہاں تک خود امت مسلمہ کا تعلق ہے، تعیین قبلہ کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً ۚ وَسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰهَدَآءَ عَلٰی النَّاسِ وَیَكُوْنُوا الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰهِدًا (۲۴۸)۔ ”اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا تاکہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہو اور رسول (تمہارا مرکزِ ملت) تمہارے اعمال کا نگران رہے۔“ اس آیتِ جلیلہ میں مسلمانوں کے مقصدِ حیات، مقام اور طریقِ عمل کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ کعبہ کو قبلہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ دین، قومی دوائر سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو محیط ہو جائے۔ اس دین کی حامل امت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیگر اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران رہے کہ کونسی قوم (نوع انسان کے لئے) کیا کچھ کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی نظم کی ضرورت ہے۔ اس نظم کا مرکز رسول (اور رسول کے بعد اس کے

مجھے جانشین) ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، تعین قبلہ کا منشا پورا ہوتا رہا۔ جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا نہ اس اُمت کا وہ مقام رہا، نہ اس کے قبلہ کی وہ حیثیت۔

رہ گئی رسم اذان، روح ہلالی نہ رہی

اس ”رسم“ میں روح پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پھر سے اُسی نظام کو زندہ اور قائم کیا جائے۔ قرآن کریم کی موجودگی میں اس نظام کا احیاء کچھ بھی مشکل نہیں۔ قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس پر متفرع نظام ہمیشہ قائم رہے اور اگر یہ کسی وقت (بدقسمتی) سے موجود نہ رہے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جاسکے۔ دنیا اب اپنی قوسی تنگناؤں سے دل برداشتہ ہو کر، کسی عالمگیر نظام کی متعنی ہوتی جا رہی ہے۔ اس نظام کے لئے ایک مشترکہ ضابطہ، حیات کی ضرورت ہے۔ یہ ضابطہ حیات، قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس دن دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، عالمگیر نظام حکومت کے خواب کی تعبیر سامنے آجائیگی۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی اُمت اپنے اندر وحدت پیدا کر کے اس قسم کے نظام کو مشکل کر کے دکھائے۔ اگر اسی قوم کے ”قبلے“ مختلف رہے تو ساری دنیا کا ایک قبلہ کس طرح بن سکے گا؟

ق ت ر

الْقَتَرُ - الْقَتِيرُ - صرف گذر بسر کے قابل معیشت یا نفقہ - قَتَرٌ وَقَتَرٌ - گذر بسر کے لئے ضرورت سے کم خرچ کرنا، خرچ میں تنگی کرنا - لَمْ يَسْرِ قَتَرًا وَ لَمْ يَنْقُتِرُوا (۲۵) - نہ ہی وہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی مناسب خرچ میں تنگی کرتے ہیں - الْقَتِيرُ (۲۶) تنگ دست، بمقابلہ الْمُوسِعُ - صاحب وسعت - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے - وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُورًا (۱۹) - انسان (اگر وحی کے تابع نہ چلے تو) بخل کرتا ہے اور اپنی دولت کو نوع انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہیں چھوڑتا -

الْقَتَرُ - غبار - سیاہی - دھندلا، دھوئیں جیسا رنگ - مَثِيلاً رَنُجٌ - الْقَتَرَةُ - غبار بمعنی قَتَرٌ - بھول بعض یہ قَتَرٌ کا واحد ہے - تَرَّهَتْهَا قَتَرَةٌ (۸۱ و ۸۲) انہیں (ذلت کی) سیاہی ڈھانپ لے گی - ان پر افسردگی چھا جائے گی - الْقَتِيرُ - زرہ کے حلقوں کے کنارے - رَجُلٌ قَاتِرٌ - ضعیف آدمی -

* تاج - ** راغب -

ق ت ل

الْقَتْلُ - ہتھیار کی ضرب ، یا پتھر ، یا زہر ، وغیرہ سے کسی کو مار ڈالنا ۔ جان نکال دینا ، قَاتَلَهُ - اس سے جنگ کی * ۔ ایک نے دوسرے کو قتل کرنا چاہا * ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ذلیل و حقیر کرنے اور جھکا دینے کے بھی آتے ہیں *** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور ماسار ڈالنے کے ہیں ۔ قَتِيلٌ الْإِنْسَانُ مِمَّا أَكْفَرَهُ (۱۶۰) میں قوانین خداوندی سے انکار کرنے والوں کی ذلت و حقارت اور تباہی و بربادی ہی کا بیان ہے ۔ اسی طرح قَاتَلَهُمُ اللَّهُ (۱۶۱) کے معنی ہیں خدا انہیں ذلیل و حقیر کرے ۔ خدا انہیں تباہ و برباد کرے ۔ خدا انہیں مغلوب کرے ۔ قَتِيلٌ الْخَيْرُ أَصْوَنُ (۱۶۱) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اسی طرح راغب نے لکھا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً إِمْلَاقٍ (۱۶۲) نیز وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ (۱۶۴) میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو مچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں علم و تربیت سے محروم رکھنا ہے ۔ اور اس کے مقابلہ میں ان کا اسْتَحْيَاءَ (زندہ رکھنا) انہیں علم و بصیرت عطا کرنا ہے *** ۔ یعنی اس خیال سے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا کہ اس کے اخراجات سے ہم غریب ہو جائیں گے ۔

تذلیل و تحقیر کے مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی ان آیات کا مطلب بھی صاف ہو جاتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا ذکر ہے ۔ (اس کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

تذلیل و تحقیر کے اعتبار سے قَتْلُ کے معنی ہیں کسی کو ایسا کر دینا کہ اس کی بات ہر کوئی دھیان نہ دے ۔ اس کی کوئی پرواہ نہ کرے ۔ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہے ۔ وہ (Ineffective) ہو جائے ۔ اُقْتُلُوا فَلَانًا کے معنی ہیں اُسے ایسا کر دو گویا وہ ”مردوں میں شامل ہو چکا ہے“ ۔ یعنی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو جائے ۔ قَتَلَ الشَّرَابَ کے معنی ہیں شراب میں پانی ملا کر اس کی تندی اور کیف آوری کو کم اور ہلکا کر دیا * ۔

قَتَلَ الشَّقَى خُبْرًا - اس نے اس چیز کا پورا پورا علم حاصل کر لیا ۔ اِنْقَهَ لِقَتْلِ شَرٍّ - وہ شر کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اسی نہج سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو آرا ہے ۔ وَمَا قَتَلُوهُ بِبَقِيَّةٍ (۱۶۵) ۔ تو اس کے

معنی یہ ہیں کہ انہیں حقیقت کا یقینی علم بالکل نہیں۔ یعنی مَافَتَلُوا عِلْمَهُمْ بِقِيَّتِهِمَا*۔ اَلْبُسْتَان میں بھی مَافَتَلُوا وہ بَقِيَّتَا کے معنی لکھے ہیں لَمْ يَحْيِيْنَطُوا بِهٖ عِلْمًا۔ اَلْمُقْتَلُ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت تجربہ کار اور اشیاء کی حقیقت کا علم رکھنے والا ہو*۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں قَتَلَ کا لفظ آئے گا ہر جگہ اس کے معنی مار ڈالنے کے نہیں ہونگے۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی متعین کئے جائیں گے۔ کہیں مار ڈالنا۔ کہیں ذلیل و حقیر کرنا۔ غیر موثر بنا دینا۔ تباہ و برباد کر دینا۔ کہیں علم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا۔ اور کہیں پورا پورا علم حاصل کرنا، وغیرہ۔ حتیٰ کہ انتہائی کوشش کرنا بھی، چنانچہ اِسْتَقْتَلَ رَفِیْ الْاَمْرِ کے معنی ہیں اُس نے اس معاملہ میں جان کی بازی لگا کر کوشش کی*۔

سورة بقرہ میں یہودیوں کے متعلق ہے۔ وَ يَفْتُلُوْنَ النَّبِيَّيْنِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲۶) تو اس کے یہ معنی بھی ہونگے کہ وہ اپنے انبیاء کی تعقیر و تذلیل کرتے تھے اور یہ بھی کہ وہ ان کے درپے قتل ہوتے تھے یا قتل کر دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ انہیں یہودیوں نے قتل نہیں کیا تھا۔ نہ ہی آپؑ کو صلیب دی گئی تھی (۱۵۷)۔ اسی سورت میں دوسری جگہ فَاَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۲۴) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ۔ اس لئے کہ راغب نے کہا ہے کہ قَتَلْتُ فَلَا نَمَّا کے معنی ذَلَّلْتُهُ آتے ہیں۔ یعنی اسے مطیع و فرمانبردار بنا لیا**۔

سورة نساء میں ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اس کے بعد ہے وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹)۔ یعنی اس طرح اپنے آپ کو تباہ نہ کرو۔ یا ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہ کرو۔ یا اپنی ذات کو ہلاک نہ کرو۔ جس معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانے لگ جائیں، اس میں سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں جنگ کرنے کے لئے بالعموم قِتَالٌ کا لفظ آیا ہے (۲۶۶) لیکن (۱۳۳) میں جو کہا ہے کَتَيْبٌ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ۔ تو اس کے معنی ہیں وہ لوگ (جماعت مومنین) جن پر (قتل کرنا) جنگ واجب قرار دی گئی تھی۔ یہ معنی نہیں کہ ”جن کا قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا“۔ اول تو اس

لئے کہ کُتِبَ عَلٰی کے معنی کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔
 دوسرے یہ کہ قَتَلَ کے معنی قتل ہونے ہی کے نہیں۔ قتل کرنے کے بھی
 ہیں۔ جیسے اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنْ الْقَتْلِ میں ہے (۲۱۷)۔ تیسرے یہ
 کہ اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ ”ان کے لئے قتل ہو جانا مقدر ہو چکا ہے“ تو
 یہ تصور قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف جاتا ہے جس کی رو سے انسان
 اپنے اعمال میں صاحب اختیار ہے۔ مجبور نہیں۔

(سزائے قتل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ص۔ ص میں لفظ قصاص)۔

ق ث ا

قِيَّامٌ - قِيَّامٌ - کھیرے کو کہتے ہیں **۔
 قرآن کریم میں قِيَّامٌ (۲۱) میں آیا ہے۔

ق ح م

اَلَا قَتِيحَامٌ - کسی خوفناک اور شدید معاملہ کے اندر گھس جانا۔
 قَتَحَمَ الرَّجُلُ فِيْ اَلْاَمْرِ - اس نے اپنے آپ کو اس معاملہ میں بے سوچے
 سمجھے یکبارگی ڈال دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی
 کسی چیز پر ذرا سختی سے اقدام کرنے ہوئے پہنچنا ہیں۔ تَقَتَحَمْتُ
 بِهِنَّ التَّقَاتُ کے معنی ہوتے ہیں اونٹنی اسے لے کر وحشیانہ طور پر بھاگ
 کھڑی ہوئی۔ قَتَحَمْتُهِنَّ النِّفَرَسُ اسے گھوڑے نے منہ کے بل گرا دیا **۔
 راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں گھوڑا، سوار کو لیکر خوفناک مقام
 میں گھس گیا *۔

ان معنوں میں یہ لفظ سورہ ص میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ هٰذَا
 فَوْجٌ مَّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ (۳۸)۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اندھا دھند
 تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ہے۔ مَحَالَةً قَتَحُوْا - اس چرخہ کو
 کہتے ہیں جو تیزی کے ساتھ گھومتی ہو۔ اَفْتَحَمَ الْمُتَنَزِّلُ کے معنی
 ہیں وہ کھر میں گھس پڑا۔ (اس میں سختی اور شدت کا پہلو ہوتا ہے) **۔
 یعنی تیزی کے ساتھ کسی مقصد کی طرف آنا۔ ان معنوں میں سورہ بلد میں ہے۔
 فَلَا اَفْتَحَمَ الْعَقَبَةُ (۲۱)۔ انسان (خدا کے مقرر کردہ نظام ربوبیت کی)
 گھاٹی پر چڑھنے کے لئے (جس کی تفصیل اگلی آیت میں دی گئی ہے) تیزی

*راغب۔ **تاج۔

سے دوڑ کر نہیں آتا وہ اس میں، ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا
دراڑہ نہیں گھستا۔ (حالانکہ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو یہ وہ
منزل ہے جس کی طرف اسے والہانہ آنا چاہئے)۔

قَدْ - (لَقَدْ) - (حرف)

قَدْ - (۱) ماضی کو ماضی قریب بنا دیتا ہے۔ قَدْ ضَرَبَ - اس نے
مارا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءَنَا (۲۴۲)۔ اب ہمارے لئے کونسی
وجہ باقی ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے گھر بار
اور بال بچوں سے جدا کر دئے گئے ہیں۔

(۲) فعل ماضی کے ساتھ تحقیق کے معنوں میں۔ قَدْ أَفْلَحَ
الْمُؤْمِنُونَ (۲۳)۔ مومن یقیناً کامیاب ہیں (یا کامیاب ہونگے)۔

(۳) مضارع کے ساتھ تحقیق کے لئے۔ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ
(۲۴)۔ اللہ یقیناً جانتا ہے کہ تم کس حال میں ہو۔

(۴) اکثر یا بکثرت کے معنوں میں۔ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ
فِي السَّمَاءِ (۲۴۴)۔ ہم نے تجھے اکثر (یا بار بار یا بکثرت) آسمان کی
طرف نظر لگائے دیکھا ہے۔

(۵) بعض اوقات یہ (الف) ”کبھی کبھی“ کے معنوں میں بھی استعمال
ہوتا ہے۔ مثلاً۔ قَدْ يَصْدُقُ الْكَذُّ وَبُ - جھوٹا بھی کبھی کبھی سچ
بول لیتا ہے۔ یا (ب) قَدْ يَقْدَمُ الْغَائِبُ - اسکی توقع ہے کہ جو اسوقت
یہاں نہیں وہ آجائے گا۔ یا (ج) قَدْ فَعَلَ - وہ یہ کام پہلے ہی کر چکا ہے۔
یا مثلاً (د) جب کوئی پوچھے کہ فلاں کا کیا حال ہے۔ یا فلاں زندہ ہے یا
مر گیا۔ تو اس کے جواب میں کہا جائیگا۔ قَدْ مَاتَ فلاں - وہ تو مر
چکا ہے۔ وہ مر گیا۔

(۶) لَقَدْ - قَدْ پر۔ ل - بڑھانے سے تاکید بڑھ جاتی ہے۔ یعنی
زیادہ یقین سے کہا جاتا ہے۔

ق د ح

الْقَيْدُ ح - تیر کی ڈنڈی جس میں ابھی نہ ہر لکے ہوں نہ پھل - ابن
فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز میں نقص

کی وجہ سے سوراخ ، شگاف یا گڑھا پڑ جانا ، اور (۲) کسی چیز کو چمچہ وغیرہ سے نکالنا ۔ اَلْقَدَحُ - پیالہ (خالی پیالے کو قَدَحٌ اور بھرے ہوئے کو کاس کہتے ہیں) - قَدَحَ بِالْقَنْدَرِ - اس نے چقماق سے آگ نکالی ۔ قَدَحَ رِفِیْ فُلَانٍ قَدْحًا - اس نے اس شخص میں طعن کیا ۔ اسکی عیب چینی اور تنقیص کی * ۔

قرآن کریم میں ہے فَالْمُؤَرِّیَاتِ قَدْحًا (۱۳۱) - یہ قَدَحَ بِالْقَنْدَرِ سے ہے ۔ یعنی وہ گھوڑے جو پتھروں پر اس طرح سُم ساریں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں نکلیں ۔

ق د د

اَلْقَدَدُ - کاٹنا ۔ کسی چیز کو طول میں شق کرنا یا چیرنا ۔ میدان کو قطع کر لینا ۔ کلام کو قطع کر دینا ۔ نیز قد و قامت یا کسی چیز کی کاٹ تراش ** ۔ سورہ یوسف میں ہے ۔ وَقَدَدْتُ قَمِیْصَہُ (۱۲۵) - اس عورت نے اسکی قمیص پھاڑ دی ۔ اَلْقِدْقَةُ - ٹکڑا ۔ فرقہ ۔ لوگوں کا گروہ ، ٹہولی ۔ (اسکی جمع قِدَدٌ ہے) قرآن کریم میں ہے کُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا - (۱۲۱) - ہم مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہم متفرق راستے اختیار کئے ہوئے تھے ۔ ایسے لوگ جو مختلف مقاصد رکھتے ہوں اور اس لئے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں ** ۔

ق د ر

قَدَرٌ کے بنیادی معنی ہیں اندازہ ۔ پیمانہ ۔ قَدَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا ۔ اس کا اندازہ کیا ۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت ، کمیت وغیرہ کو متعین کیا ۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے ، کتنی ہے ، اس کا تناسب کیا ہے ۔ اور قَدَرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں ۔ یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے ۔ قَدَرْتُ عَلَیْہِ الثُّوْبَ کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے ۔ قَدَرْتُ عَلَیْہِ الشَّیْءِ کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسبت تبدیل یا کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آگئی ۔ لہذا تَقْدِرُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا ۔ اور مَقْدَارٌ

اس پیمانے یا ماڈل (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کسی چیز بنائی جائے *۔ قَدْرُ کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ - پیمانہ، حجم، جسامت - طول، عرض، وغیرہ - هَذَا قَدْرٌ هَذَا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے، پیمانے، جسامت، وغیرہ کے بالکل برابر ہے - اس کے عین مطابق ہے - دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں - جَاءَ عَلَيَّ قَدْرٌ کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا - اور جَاءَ زَ قَدْرُهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے، حدود، پیمانے سے تجاوز کر لیا - اس سے آگے نکل گیا - أَقْدَرُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے - قَدَارٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو - نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا - اَلْمُقْتَدِرُ - ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں - كَمَّ قَدْرَةَ نَخْلِكَ - تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کس قدر معین فاصلہ ہے * - عوام کی بولی میں اَلْمُقْتَدِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کر کے بتائے کہ غلے کی کتنی انداز پیدا ہونے کی امید ہے - قِدْرٌ - ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں - اسکی جمع قَدْرٌ وُورٌ ہے - قَدِيرٌ - اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب مسالوں کے ساتھ) ہنڈیا میں پکایا جائے - قَدَارٌ - ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی) * -

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قَدْرٌ اور تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ - یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا - نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا - متوازن اور معتدل رہنا - ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے -

(۲) چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری قدرت حاصل ہو، اس لئے قَدْرٌ کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں - قَدْرَتٌ عَلَيَّ الشَّيْءِ کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا - مَالِيَّ عَلَيَّكَ مَقْدَرَةٌ (یا مَقْدَرَةٌ - یا مَقْدَرَةٌ) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی

اقتدار و اختیار حاصل نہیں۔ اس بنا پر قَدَر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار و ہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور و فکر کرنا۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں*۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولیے یونہی دیدیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قَدَر کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ماب تول کر دینا*۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا*۔

سورہ رعد میں ہے۔ اَنْزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَتُهُ بِقَدَرِهَا (۱۳) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قَدَر) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں۔ یہاں سے قَدَر کے معنی اندازے۔ یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ وَاَنْ مَّيْنُ شَيْئٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلُہُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵)۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر، حضرت سلیمانؑ کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قَدَر و رَاسِیَّت (۳۳)۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں، بنایا کرتے تھے۔ یہاں قَدَر کے معنی دیگ کے ہیں۔

کسی پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوا عَلَیْہِمْ (۹)۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر لو۔ سورہ انبیاء میں ہے۔ فَظَنُّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ (۲۱)۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کر سکیں گے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ اِنْ رَیْکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ (۲۱)۔ یہاں قَدَر*۔ بمقابلہ بَسْطُ آہا ہے۔ بَسْطُ کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی۔ لہذا قَدَر کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا نہ تولا ملنا۔

تَقْدِیر* کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش۔ ی۔ ا) میں تَشِیِّت کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں

ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشہ اول وہ ہے جہاں امر الہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہی قواعد و ضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ انہی کو ان کی ”تقدیریں“ کہا جاتا ہے۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیٹال ہے، نشیب کی طرف بہتا ہے، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔ سورہ فرقان میں ہے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵)۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیے۔ اسام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے۔ (جیسے مملوآت*)۔ اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہی اسکی تَقْدِيرٌ ہے۔

اسام راغب نے جو پہلی بات کہی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گزرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قَدَر (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہو (Actualize) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔ ”دَوْر“۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقہ نہیں مل گئی کہ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔ اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جا رہا تھا۔

چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے۔ اس طرح وہاں تم نے گلہ بانی کی۔ اس طرح تمہاری تربیت ہوئی۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر تم جیئتِ اعلیٰ قَدَرِ بِلْمُوسٰی (۱۳۳)۔ تم، اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا*۔ یہاں لفظ قَدَر نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا۔ سورۃ اعلیٰ میں ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوَّیْ۔ وَ الَّذِیْ قَدَرَفَتْھِ دُل (۱۳۴)۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیاء نے کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے۔ اور انکی اس راستے کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں۔ یہ ہے خدا کا نظام ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تَقْدِیْر تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اسے دیگر اشیاء نے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے اور چاہے دوسرا راستہ جس سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز، وحی کی رو سے ہوتا ہے۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا، یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔ جس طرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ فَتَلَمَّحًا زَاغُواْ ۚ اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبُہُمْ (۱۳۵)۔ جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں

* واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گذارا جا رہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ نبوت وہی حق ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

کو ٹیڑھا کر دیا۔ دوسری جگہ ہے۔ یَوْفُوتُكَ عَنْهُ مَنْ أَفِيكَتَ (۵۱)۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس لئے اس کے لئے تقдіرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ”تقدیر“ بن جائے گی۔ اقبال کے الفاظ میں:۔

حرفے باریکش بہ رمزے مضمراست تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خساک شتو نذرِ هوا سازد ترا سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی! افتندگی تقدیرِ تست قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہو جائیگا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر زیک تقدیرِ خون گردد جگر خواہ از حق حکمِ تقدیرے درِ گر

تو اگر تقدیرِ نوخواہی رواست زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقدیرؒ کا مفہوم۔ لہذا جب کہا جائے گا کہ إِنَّ اللَّهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جارہا ہے۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تقدیرؒ) اس پر حاوی ہوگا۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے، اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے، خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جاسکتا۔ إِنَّ اللَّهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے ہیمائے (قوانین، اندازے، تناسب، توازن) مقرر ہیں، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت

بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کار فرمائی ہے۔ یونہی اندھیر گردی نہیں۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو۔ اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کار فرما نہیں۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے۔ ”پہلے سے لکھا ہوا“ صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ انسان کی ”قسمت“ نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانونِ خداوندی کو قرآن کریم نے قَدَرٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوانین جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کار فرما ہیں۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے یہی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے۔ اسی وجہ سے نزولِ قرآن کریم کی ”رات“ کو لَيْلَةُ الْقَدَرِ کہا گیا ہے (سج۱۶)۔ وہ ”شب“، (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر، انسانیت کی سطح پر آتا ہے، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie ہڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عند الضرورت، جان تک کو بھی۔ دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔

ق د س

قَدَسَ رَفِی الْاَلَاَرْضِ کے معنی ہیں وہ بہت دور تک چلا گیا *۔ اس لئے قَدَسَہ کے معنی ہیں اس نے اس سے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا۔ قرآن کریم میں جہاں ملائکہ نے کہا ہے کہ نَقَدَسُ لَكَ (سج۲) تو زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے لئے خود بھی پاک و صاف

ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کو ہلاک اور صاف کرتے ہیں جو تیری اطاعت کرے*۔ (لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم وہ ہے جو آگے چل کر درج کیا جاتا ہے)۔ قَدْ وَسَّ (۱۱۶)۔ خدا کی صفت ہے، جس کے معنی ہیں ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور، منزہ۔ اَلْقُدَّاسُ۔ گرانقدر اور محکم شرف، نیز اُس پتھر کو بھی کہتے تھے جو حوض میں یا اس کے دھانہ میں لگا دیتے تھے تاکہ اس سے پانی کا اندازہ ہو جائے اور اس طرح وہ آپس میں پانی کی تقسیم کر لیں**۔

سورة بقرہ میں نَسَبَ بَیْحٌ اور نَقَدَّسَ سٌ ساتھ ملاتے آئے ہیں (۱۱۶)۔ اس لئے اس کے ساتھ (س۔ ب۔ ح) کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہونگے، خدا کے کائناتی پروگرام کو درخور حمد و ستائش بنانے کے لئے دور دور تک چلے جانا۔ بڑی تگ و تاز کرنا۔ انتہائی جد و جہد کرنا۔

رُوحُ الْقُدَّاسِ کے لئے دیکھئے عنوان (ر۔ و۔ ح)۔

الْأَرْضُ الْمُقَدَّسَةُ (۱۱۶)۔ وہ زمین جہاں زندگی کے ہر طرح کے سامان و اسباب بافراط موجود ہوں۔ یا برکت زمین (دیکھئے عنوان ب۔ ر۔ ک)۔ مصر اور فرات کا درمیانی حصہ**۔ عام طور پر فلسطین کے علاقہ کو کہتے ہیں۔

ق د م

الْقَدَمُ۔ پاؤں (۱۱۶)۔ اسکی جمع آقْدَامٌ ہے۔ قَدَمٌ۔ آگے بڑھنا۔ پہل کرنا۔ مُقَدِّمَةٌ الْجَيْشِ (دال کے زیر اور زیر سے) فوج کا ہراول دستہ۔ مُقَدِّمَةٌ۔ ہر شے کا ابتدائی حصہ۔ قَدَمٌ۔ آگے بڑھنا۔ پیش کرنا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۱۵)۔ اور سورہ اعراف میں ہے فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ (۱۱۶)۔ قَدَمٌ کے معنی ہیں سبقت کرنا۔ اور آگے بڑھتے چلے جانا۔ بَدِ أَخْرَ۔ پیچھے کی ضد ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ مُسْتَقْدِرٌ مِیْنِ کے مقابلہ میں مُسْتَأْخِرٌ مِیْنِ (۱۱۶) آیا ہے۔

قرآن کریم میں مَا قَدَّمَتْ آيَةُ يُمِيمٌ (۱۱۶) متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ اس سے

مراد اعمال انسانی ہیں۔ چونکہ انسان کی موت اس کے ان تمام اعمال کے بعد ہوتی ہے جو اس سے اس دنیا کی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں، اس لئے اعمال انسان سے آگے آگے چلتے ہیں۔ اس میں ماضی (Past) کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ نیز ہر عمل جو سرزد ہو جاتا ہے، ماضی (گذرے ہوئے زمانے) سے متعلق ہو جاتا ہے، اور انسان کی دسترس سے باہر۔ اور چونکہ اعمال کے نتائج بھی ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی لئے ان نتائج کو بھی ”پہلے بھیجے ہوئے“، کہہ کر ہکا بکا کیا گیا ہے۔ مِّنْ قَدْ قَدْ لَنَّا هَذَا (۳۸)۔ جس نے اسے ہمارے لئے آگے بھیجا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم پر یہ عذاب آیا ہے۔ لہذا، جنت اور دوزخ کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے ساتھ کے ساتھ تعمیر کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کی نمود اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

سورہ یونس میں ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدْ مَصِيدٌ قِیْلٌ عِندَ رَبِّهِمْ (۱۰)۔ ایمان والوں کو بشارت دو کہ ان کے لئے ان کے نشو و نما دینے والے کے ہاں قَدْ مَصِيدٌ قِیْلٌ ہے۔ یہاں قَدْ مَصِيدٌ کے معنی بزرگی، شرف اور بلندی مدارج بھی ہیں، اور سبقت بھی۔ یعنی صلاحیتوں کی ایسی نشو و نما جس سے انسان، زندگی کے آئندہ مراحل طے کرنے (آگے بڑھنے) کے قابل ہو جائے۔ نیز ثبات و استحکام۔

قدیم اور حادث کی اصطلاحات قرآنی نہیں۔ متکلمین کی ہیں۔ البتہ قرآن کریم میں قَدْ مَصِيدٌ کا لفظ پرانی، یعنی اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو پچھلے زمانہ سے چلی آرہی ہو۔ مثلاً اَلْعُمُرُ جُؤُنَ الْقَدْرِ (۳۱)۔ خوشہ کی کہنہ اور خشک شاخ۔ اَفْکَکَ قَدْ مَصِيدٌ (۳۱)۔ وہ جھوٹ جو شروع سے چلا آرہا ہے۔ اَفْکَکَ مَصِيدٌ (۳۱) اگلے زمانے کے لوگ۔ آبا و اجداد۔

سورہ فرقان میں ہے۔ وَقَدْ مَنَّ اَلِیٰ مَاعْمِلُوْا (۲۵)۔ اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں۔ یعنی آگے بڑھ کر لینا۔ سورہ حجرات میں ہے۔ لَا تَقْدِرُ مَوَابِتِنَ یَدِیْ اَللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ (۲۹)۔ خدا اور رسول (نظام خداوندی) کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو۔ یا ان کی باتیں کاٹ کر نہ چلو۔ ان کی اطاعت کرو۔

سورہ فتح میں ہے مَا تَقْدِرُ مِّنْ ذَنْبِکَ (۴)۔ وہ نازیبا باتیں جو ان لوگوں نے پہلے سے تیرے پیچھے لگا رکھی ہیں۔ یعنی وہ باتیں درحقیقت

درست نہیں بلکہ ان لوگوں نے یونہی تہمت کے طور پر تمہارے پیچھے لگا رکھی ہیں (مثلاً ساحر - مجنون - شاعر - کاذب - مفتری - وغیرہ) - ذَنْبُکَ کے یہی معنی ہیں - اس انداز بیان کی مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں - مثلاً سورۃ نحل میں ہے - اَبْنِ شُرَکَآئِیَ الَّذِیْنَ کُنتُمْ تَشْبَقُوْنَ فِیْہِمْ (۲۱) - یہاں شُرَکَآئِیَ کے معنی ”میرے شریک“ نہیں - اس کے معنی ہیں وہ معبود جنہیں تم بزعم خویش میرے شریک سمجھتے تھے - (یا جو بزعم خویش میرے شریک بنتے تھے) - شُرَکَآءُ کُمْ الَّذِیْنَ کُنتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۲۲) - وہ جنہیں تم بزعم خویش خدا کے شریک قرار دیا کرتے تھے - لہذا ذَنْبُکَ (۲۳) کے معنی ”تیری نازیبا باتیں“ نہیں - اس کے معنی ہیں وہ نازیبا تہمتیں جن سے یہ مخالفین تجھے مطعون کرتے رہتے ہیں - (نیز دیکھئے عنوان ذ - ن - ب)۔

ق د و

الْقِدْوَةُ - درخت کی اصل جس سے شاخیں نکلتی ہیں - اسی سے الْقِدْوَةُ کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں - اور چونکہ یہ شاخیں سیدھی نکلتی ہیں اس لئے تَقْدَاتُ بِسْمِ دَابَّتْہ کے معنی ہوتے ہیں سواری کا جانور اسے لیکر سیدھے راستے پر چلتا رہا* - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے مطابق بن جانا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہیں -

الْقِدْوَةُ - وہ جس کی پیروی کی جائے - جسکے پیچھے پیچھے چلا جائے* - اِقْتَدَى - پیروی کرنا - قرآن کریم میں تمام انبیائے سابقہ کے ذکر کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے - اُولَیْکَ الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ فَبِہِدٰیہُمْ اِقْتَدِہ (۹۱) - یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی راہ نمائی (وحی) عطا کی تھی - پس انہی کی راہ نمائی کی پیروی تو کر، یعنی جو راہ نمائی انہیں دی گئی تھی اب وہی راہ نمائی اس قرآن کریم میں تجھے دی گئی ہے - لہذا قرآن کریم کی راہ وہی ہے جس پر تمام انبیائے سابقہ چلتے رہے ہیں - قرآن کریم پر چلنا انبیاء کی راہ پر چلنا ہے - قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو واضح کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے تمام انبیاء کرام کو ایک ہی دین ملتا رہا ہے - وہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا - اب وہی اصول (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم

میں دے دیئے گئے *۔ اس لئے جو شخص قرآن کریم کا اتباع کرتا ہے وہ اسی راستے پر چلتا ہے جس پر انبیاء کرامؑ چلتے رہے ہیں۔ یہی معنی قَتِیہْدُہُمْ اَقْتَدَہُ (۹۱) کے ہیں۔ اقتداء اس ہدایت کی ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء کو ملتی رہی ہے۔ اس کے خلاف دوسری راہ اشخاص کی اقتداء کی ہے جس کی مخالفت قرآن کریم نے جا بجا کی ہے۔ (مثلاً ۲۳)۔ لیکن ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے قرآن کریم نے روکا تھا۔ یعنی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نجاتی (قرآن کریم) کے بجائے، زندہ اور مردہ اشخاص کی اقتداء۔

ق ذ ف

قَذَفٌ۔ تیر یا پتھر وغیرہ کو پھینکنا **۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی دور پھینکنا ہیں ***۔ اسی طرح یہ لفظ کسی بات کو منہ سے نکالنے اور پھینکنے، نیز کسی چیز کو ڈالنے کے لئے بولتے ہیں۔ اور استعارۃً الزام یا تہمت لگانے کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے **، جیسے اس مفہوم کے لئے رَمٰی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قَذَفٌ گالی دینے اور عیب جوئی کرنے کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے ***۔ چنانچہ قَذَفَ الْمُحْصِنَاتَ کے معنی ہیں اس نے ہا کباز عورت پر بد چلنی کی تہمت لگائی۔ اَلْقَذَافُ۔ منجنيق وغیرہ جس سے کوئی چیز دور پھینکی جائے **۔

سورہ طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اَنْ اَقْدَرَفِيْہُ فِی التَّابُوْتِ فَاَقْدَرَفِيْہُ فِی النَّیْمِ (۲۶)۔ اسے تابوت میں رکھ دے اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔

سورہ انبیاء میں ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ (۲۸) ہم حق کو باطل پر مار رہے ہیں۔ حق اور باطل میں باہمی تصادم و تزاوج، باہمی کشمکش، ہوتی رہتی ہے۔ تعمیری اور تخریبی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور تعمیری قوتیں آخر الامر غالب آجاتی ہیں۔

دور رکھنے کے معنوں میں سورہ الصافات میں ہے۔ وَیَقْذِفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ (۳۸) انہیں ہر طرف سے دور رکھا جاتا ہے۔

* جن سابقہ احکام میں (اصول نہیں بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں احکام ہوں) کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں رد و بدل کر کے نئے احکام قرآن کریم میں دے دیئے گئے ہیں۔ لہذا اب اطاعت خداوندی صرف قرآن کریم کی رو سے ہو سکتی ہے۔ اور کسی مبینہ آسمانی کتاب کی رو سے نہیں ہو سکتی۔ نیز دیکھنے عنوان (ن - س - خ)۔ ** تاج۔ *** راغب۔

ق ر ا

قَرَأَ کے بنیادی معنی ہیں جمع کرنا (ابن فارس)۔ اقْرَأَتِ النِّقَاقَةَ کے معنی ہیں نر کا سادہ منویہ اونٹنی کے رحم میں قرار پا گیا اور جمع ہو گیا۔ قَرَأَتِ النِّقَاقَةَ۔ اونٹنی حاملہ ہو گئی۔ خون کے رحم میں جمع ہونے کو بھی قَرَأَ کہتے ہیں۔ اقْرَأَتِ الْمَرْأَةُ اس وقت کہتے ہیں جب ہورت کو قَرَأَ یعنی حیض آجائے۔ قَرَأَ کی جمع قَرُوءٌ آتی ہے (۲۴۸)۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ یہ لفظ (قَرَأَ) اس وقت بھی بولتے ہیں جب ہورت حیض سے پاک ہو جائے۔

زجاج نے کہا ہے کہ قَرَأَ اَنْ بھی یہیں سے فُعْلَان کے وزن پر مصدر ہے۔ اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قَرَأَ اَنْ کو قَرَأَ اَنْ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سورتوں کو جمع کرتا ہے۔ اور انہیں ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ مکتتاب اللہ کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر قصص، امر، نہی، وعدہ، وعید، اور آیات اور سورتوں کو باہم دگر جمع کر دیا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا نام قرآن اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ عَلَّمْنَا جَمْعَهُ وَقَرَأْنَاهُ فَذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (۱۸: ۱۷)۔ اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جسطرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا۔ ثُمَّ اِنْ عَلَّمْنَا بَيَانَهُ (۱۹: ۱۸)۔ پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہ کی زندگی میں جمع، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہ سے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور اسے بعد میں یک جا کیا گیا تھا۔ علاوہ دیگر شواہد، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ جمع شدہ (مکتتاب کی) شکل میں تھا۔ اَلْقِرَاءَةُ۔ حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے فاتتبع قَرَأْنَاهُ کے معنی اس پر عمل کرنے اور اس کی پیروی کرنے کے بتائے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ قرآً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں*۔ اس اعتبار سے اقترأً بیاسم ربیک (۹۱) کے معنی ہونگے تو اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کر دے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ مدثر میں قُمُ فَاَنْذِرْ۔ وَ رَبِّکَ فَتَکْبِیرُ (۲۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے قرآن کے معنی اعلان عام کے ہونگے۔

قرآن کریم وہ الکتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں ہر بات یقینی ہے اور اس سے ہر قسم کا تذبذب اور نفسیاتی الجھن ختم ہو جاتی ہے (۲)۔ جو کچھ خدا نے حضور پر وحی کیا تھا وہ قرآن کریم میں محفوظ ہے (۱۶)۔ مومنین کو اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے اتباع کی اجازت نہیں دی گئی (۳۰)۔ رسول اللہ کو بھی قرآن کریم ہی کے اتباع کا حکم تھا (۱۱۹)۔ حضور اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے (۵۸)۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، تو ایسے لوگ مومن نہیں کافر ہیں۔ (۵۳)۔ اس میں تعلیم خداوندی مکمل طور پر آگئی ہے اور کوئی شخص اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا۔ (۱۱۱ و ۱۱۲)۔ یہ سابقہ تعلیمات کا مہیمن ہے (۵۸)۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۸۲) اور تمام اختلافات اسی سے رفع ہو سکتے ہیں (۱۲)۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے (۹۹)۔ اسی لئے اسے تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (۱۸۹) کہا گیا ہے۔ ایسا تصریف آیات کی رو سے کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے (۱۶۶ و ۱۶۷)۔ رسول اللہ ہر اختلافی معاملہ کی وضاحت قرآن کریم سے کرتے تھے (۱۶۶)۔ اور اسی سے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے (۵۵)۔ یہ خود روشنی ہے (۵۵) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس روشنی میں سفرِ حیات طے کرے (۱۳۳)۔ اسی لئے اس میں تدبیر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے (۲۴)۔ یہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان ہے (۹۹)۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو انسانی خیالات سے پاک و صاف کر کے اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے (۵۶)۔ قرآن کریم میں غیر قرآنی خیالات و نظریات و تصورات و معتقدات کی آمیزش شرک ہے (۲۴)۔ لیکن جب انسان شخصیت پرستی کا شکار ہو جائے تو اسے یہی بات سخت ناگوار گذرتی ہے (۱۶ و ۳۹ و ۱۲)۔ چنانچہ جو شخص ان کے سامنے قرآن کریم پیش کرے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں (۲۴)۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس کی بات قطعاً نہ سناؤ اور شور مچاؤ تا کہ دوسرے لوگ بھی قرآن کریم کی آواز نہ سننے پائیں (۲۹)۔ اس طرح وہ خود بھی قرآن کریم

سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں (۲۶)۔
قرآن کریم کی مثل کوئی چیز نہیں (۱۶)۔ مخالفین چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ
قرآن کریم میں کچھ تبدیلی کر دیں لیکن حضور ﷺ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔
نہ حضور ﷺ نے ایسا کیا (۱۵)۔

قرن اول کی جماعت مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا
(۳۳)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار
ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرم ﷺ خدا سے کرینگے (۲۵)۔ اس لئے
کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر تھا۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین ہی
چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی الدین سے تمسک ہو سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو
سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین،
قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اور
قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے (۱۵)۔

ق ر ب

قَرِيبٌ بمقابلہ بتعیید (۲۱)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی
بتائے ہیں۔ الْقَرِيبُ - فاصلہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ بمقابلہ بَعْدُ،
اور الْقَرِيبَةُ - رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ اور الْقَرِيبُ
وَالْقَرَابَةُ رشتہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ یعنی رشتہ داری۔ ذی
الْقَرَابَةِ (۲۳) کے معنی ہیں جس سے رشتہ داری ہو۔ یعنی رشتہ دار۔ سورہ
شوریٰ میں ہے۔ قُلْ لَا اسْتِغْنَاكُمْ عَلَيْهِ اجْرًا اِلَّا التَّوَدُّةَ رَفِ
الْقَرَابَةِ (۲۲)۔ اس کے معنی عام طور پر کہے جاتے ہیں کہ (اے رسول) ان
سے کہدو کہ میں پیغام رسالت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، بجز اس کے
کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ یہ معنی نہ صرف یہ کہ قرآن کریم
کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں بلکہ خود لغت کے بھی خلاف ہیں۔ جیسا کہ
اوپر لکھا گیا ہے، الْقَرِيبُ بِلِی کے معنی رشتہ داری ہیں، نہ کہ رشتہ دار۔
چنانچہ لسان العرب میں اس آیت کے معنی لکھے ہیں کہ اے پیغمبر!
کہدو کہ میں تم سے رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر وہ حقوق تو ادا کرو جو
میری قرابت داری کی وجہ سے تم پر حائد ہوتے ہیں*۔

اس کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اِنَّ ذَا الْقَرَابَةِ حَقُّهُ
(۲۶) کے معنی ہیں ”تو اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے“۔ یعنی ذَا قَرَابَتَا کتب۔

اسی طرح آتی التَّامِلَ عَلٰی حُبِّهِ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲۴) کے معنی ہیں ”اس نے اپنے رشتے داروں کو مال دیا“۔ یعنی ذوی قُرباہ۔ اس اعتبار سے لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا التَّوَدُّةَ رَفِی الْقُرْبٰی میں ”تمہارا اپنا رشتہ“ مراد ہوگا۔ یعنی قُرب بآکُوم۔ یعنی تم اپنے رشتے ناطے کے حقوق مؤدت ادا کرو تو یہی میرا اجر ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کے متعلق سورۃ سبا میں کہا گیا ہے کہ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (۳۲)۔ ”ان سے کہہ دو کہ میں تم سے جو اجر مانگتا ہوں تو وہ خود تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہے۔“

بہر حال بات پہلی ہو یا دوسری، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ لوگوں سے اجر رسالت قطعاً نہیں مانگتے تھے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ ہر ایک نبی کا پہلا اعلان یہ ہوتا تھا کہ میں تم سے اجر رسالت کچھ نہیں مانگتا۔ (مثلاً ۲۱۹ : ۲۱۵ ; ۲۱۶ : ۲۱۳ ; ۲۱۷ : ۲۱۴ ; ۲۱۸ : ۲۱۵ ; ۲۱۹ : ۲۱۶)۔

التَّقَرُّبُ کے معنی ہیں کسی کے قریب ہونا چاہنا اور اس سلسلہ میں ذرائع اختیار کرنا *۔ التَّمَقُّرُ بَشَۃً۔ ایک دوسرے کے قریب ہو جانا۔ التَّقَرُّبَانُ۔ وہ چیز جس سے خدا کا قرب چاہا جائے *۔

سورۃ مائدہ میں ”آدم“ کے دو بیٹوں کا ذکر ہے (یعنی دو آدمیوں کا) جن کے متعلق کہا کہ اِذْ قَرَّبْنَا قُرْبٰنًا فَتَقَبَّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا (۵)۔ ”جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی۔ سو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی“۔ قرآن کریم نے اس قربانی کی تفصیل نہیں دی کہ وہ کیا چیز تھی اور کس طرح پیش کی گئی تھی۔ یہ کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے جسے نذرانے کے طور پر پیش کیا گیا ہو، یا کوئی عمل۔ خیر بھی جسے بغرض حصول قرب خداوندی کیا گیا ہو۔

ہمارے ہاں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے قربانی کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔

قُرب۔ الٰہی سے مراد فاصلہ اور مکان کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ہونا نہیں۔ اس لئے کہ خدا کسی خاص مقام پر نہیں جہاں سے قُرب اور بُعد ماپا جاسکے۔ انسان جس قدر اپنے اندر خدا کی صفات منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ”خدا سے قریب“ ہوتا جاتا ہے۔ اور صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرے۔ چنانچہ

سورة علق میں ہے لَا تَطِيعُهُ وَاسْتَجِدُّ وَأَقْتَرِبُ (۱۶) تو اس شخص کی بات نہ مان (جو گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ بلکہ خدا کے قوانین کی) اطاعت کر اور اس طرح (خدا کے) قریب ہو جا۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کئے جا۔ اسی کا نام انسانی ذات کی بیداری اور اس کا استحکام ہے۔ اسی کو قربِ خداوندی کہتے ہیں جو ہر مومن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے ”مقربین بارگاہِ خداوندی“ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا، جس طرح ”اولیاء اللہ“ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوانین خداوندی کا اتباع معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتا ہے۔ تجرد کی خانقاہوں میں یا ویسے ہی انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی خدا کا قرب کسی اور ”اللہ“ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ (دیکھئے ۲۸)۔ اللہ، صرف ایک ہے اور وہ خدائے واحد ہے۔

قَرُبَةً۔ جمع قُرُبَاتُ (۱۶)۔ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ۔ عَرَضًا قَرِيبًا (۲۸)۔ جلدی حاصل ہو جانے والا فائدہ۔ پیش ہوا افتادہ مفاد۔ مفاد عاجلہ۔

زمانہ قدیم میں لوگ جانوروں کو ذبح کر کے اپنے معبودوں کے حضور پیش کرتے تھے تاکہ ان کی خوشنودی حاصل کریں۔ یہودی ان ذبح شدہ جانوروں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ چنانچہ سوختنی قربانی کا ذکر اکثر تورات میں آتا ہے۔ سورة آل عمران میں يَقْرُبَانِ تَاۡكَلُهُ النَّٰسُ (۱۸۴) سے اسی قسم کی قربانی کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ قبول ہو جائے تو اسے آگ بھسم کر دیتی ہے۔

(خدا کے انسان سے قریب ہونے کے متعلق عنوان د۔ ع۔ و دیکھئے)۔

ق ر ح

الْقَرْحُ۔ الْقَرْحُ۔ ہتھیار وغیرہ کا زخم۔ بعض نے کہا ہے کہ الْقَرْحُ زخم کے نشان کو کہتے ہیں اور الْقَرْحُ سوزش اور جلن نیز درد و الم جو زخم کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں بیه قَرْحٌ مین قَرْحٌ۔ اسے زخم کی وجہ سے درد ہو رہا ہے*۔ راعب نے اسکی تائید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ خارجی اثر سے ہونے والا زخم قَرْحٌ* اور اندرونی طور پر ہونے والا پھوڑا پھنسی قَرْحٌ ہے۔

* تاج۔ نیز ابن فارس۔

قرآن کریم میں جنگ میں نقصان ہو جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔
(۱۳۳۹)۔ یا اس نقصان کی وجہ سے جو تکلیف اور پریشانی ہو۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

ق رد

الْقِرَادُ - جھڑ جانے والی یا الجھی ہوئی، ردی اون * جو کاتی نہ جا سکے اور اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جائے۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

أَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں عاجزی و درماندگی کی وجہ سے وہ شخص ساکن ہو گیا۔ ذلیل ہو گیا اور جھوٹ سوٹ مردہ بن گیا *۔ الْقِرَادُ - بندر کو کہتے ہیں۔ اسکی جمع الْقِرَادَةُ ہے۔ اور الْقِرَادُ - چیچڑی کو کہتے ہیں جو اونٹوں وغیرہ کے چمٹ جاتی ہے *۔

قرآن کریم میں ہے کہ جن یہودیوں نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی * انہیں قِرَادَةُ خَسِيسِيْنٌ بنا دیا (۲۸)۔ (خَسِيسِيْنٌ کے معنی ہیں ذلیل۔ کفینہ۔ بیکار۔ دیکھئے عنوان خ۔ س۔ ا)۔ سورہ نساء میں ہے کہ ان پر لعنت کی گئی تھی (۲۷)۔ یعنی وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اسکی تشریح میں (۱۶۳-۱۶۴) میں کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیدیا کہ ان پر ایسے لوگ مسلط رہیں جو انہیں طرح طرح کا عذاب دیتے رہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی عذاب تھا جسے دوسری جگہ ذِلَّةٌ اور مَسْكِنَةٌ کا عذاب کہا ہے (۲۹)۔ سورہ مائدہ میں منافقین کو بھی قِرَادَةُ کہا ہے۔ اور اسکی تشریح عَبَدَ الطَّاغُوتَ سے کر دی گئی ہے (۳۰)۔ یعنی غیر خدائی فوٹوں کے غلام اور محکوم۔ اسی چیز کو ان پر لعنت اور غضب کہا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کُوْنُوا قِرَادَةً خَسِيسِيْنٌ (۲۸) کے معنی یہ نہیں کہ انہیں سچ سچ کے بندر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذلتوں اور رسوائیوں کی مار ماری گئی تھی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ یک نگہی اور یک مرکزی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے باہمی اختلافات کیا کرتے تھے۔ (۱۶۳)۔ اور یہ حالت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جو آئین و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دے۔ اس سے ان میں کھریکڑ ہی نہیں رہتا۔ یہودیوں کا قواعد سبت کی پابندی سے گریز کی راہیں نکالنا اسی عدم کردار کا مظہر تھا۔

ق ر ر

الْقَرَارُ - کسی چیز کا ٹھہرنا، جمانا۔ یا کسی چیز کے ٹھہرنے کی جگہ۔
 الْقَرَارَةُ - نشیبی زمین جہاں پانی ٹھہر جائے۔ اس معنی میں قَرَارٌ بھی
 مستعمل ہے۔ قَرَّرَ بِالْمَكَانِ - کسی جگہ سکونت اختیار کرنا، وہاں ٹھہر جانا
 اور جم کر رہنا۔ لَسْتُ قَرَارٌ - ٹھہر جانا، جم جانا۔ اَقَرَّ کے معنی ہیں کسی
 چیز کو ٹھہرانا اور جما دینا، نیز اس کے معنی اعتراف اور اقرار کرنے کے ہیں۔
 جیسے ثُمَّ اَقَرَّ رُتْمٌ (۲۸) پھر تم نے اقرار کیا۔ مُسْتَقَرَّ الْحَمَلِ - رحم کا
 وہ آخری حصہ جہاں حمل قرار پا جاتا ہے۔ * وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
 (۲۹) تمہارے لئے زمین میں قرار و ثبات کا مقام ہے۔ تم کو یہاں ٹھہرنا اور
 رکنا ہے۔ اس آیت میں الیٰ حیثین (ایک وقت کے لئے) کے اضافہ نے یہ بتا دیا
 کہ زمین ابدی قیام گاہ نہیں۔ صرف ایک وقت تک کے لئے ٹھہرنے اور
 رکنے کی جگہ ہے۔ * [مُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ] (۳۰) کے مفہوم کے لئے
 دیکھئے عنوان و۔ د۔ ع۔ [لِکُلِّ نَبَاتٍ مُسْتَقَرٌّ] (۳۱) کے معنی ہیں ہر
 خیر کا ایک منتہی ہوتا ہے جہاں پہنچ کر اسکی صداقت یا عدم صداقت آشکارا
 ہو جاتی ہے۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر واقعہ ایک خاص حد تک
 جاتا ہے جہاں پہنچ کر وہ رک جاتا ہے اور اس کے نتائج ظہور میں آجاتے ہیں۔
 یہی اس کا مستقر ہوتا ہے۔ اَلشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۸) سورج
 (اپنی محوری گردش کے علاوہ) اپنے نظام کو لے کر ایک مستقر (Destination)
 کی طرف تیزی سے جارہا ہے۔ الْقَرَارُ - کجاوہ اور زمین کے بین بین ایک چیز
 جسے سواری پر رکھ کر اس میں مرد بیٹھتے ہیں۔ نیز ہودہ کو بھی کہتے ہیں *
 جو عورتوں کے اونٹ پر بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔

اَقَرَّ اللهُ عَيْنَهُ کے معنی ہیں خدا اسے اتنا مال دے دے کہ اسکی نگاہ
 ٹھہر جائے اور وہ اپنے سے زیادہ مالدار لوگوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے
 نہ دیکھتا پھرے۔ * اس کا دوسرا مفہوم ہے ”خدا اُسے خوش رکھے“۔
 اس سے آنکھوں کی ٹھنڈک مراد ہوتی ہے۔ یعنی مطمئن و مسرور۔ قَرَّةُ
 الْعَيْنِ - جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ قرآن کریم میں ہے قَرَّةُ
 اَعْيُنٍ (۲۵) - وَقَبْرِي عَيْنًا (۲۶) - اپنی آنکھ کو ٹھنڈک پہنچا۔ الْقَرَّةُ -

* تاج - نیز ابن فارس - ** اس کا یہ مطلب نہیں کہ ”آدم“ پہلے کسی اور جگہ
 (جنت میں) تھا اور اسے پھر زمین پر بھیج دیا گیا یہ ساری داستان اسی زمین (ارض)
 سے متعلق ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ا د م میں لفظ آدم۔

ٹھنڈ - (الْقَرْدُ - سردی کے موسم کی ٹھنڈ کو کہتے ہیں اور بَرْدٌ* ہر ٹھنڈ کو کہتے ہیں خواہ سردی کی ہو یا گرمی کی*) - قَرْدٌ عَلَیْہِ السَّمَاءُ کے معنی ہیں اس پر پانی ڈال دیا - الْقَارُورَةُ* ہر اس برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب رکھی جائے - بالخصوص شیشہ کا برتن - اسکی جمع قَوَارِیرُ ہے (۱۶-۱۷) - پھر خود شیشے کو قَوَارِیرُ کہنے لگ گئے - (۲۴) - اہل عرب مجازاً عورتوں کو بھی قَوَارِیرُ کہہ دیتے تھے* - یعنی آبگینے -

ق ر ش

کنب لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی لکھے ہیں - فَرَاء کا قول ہے کہ قَرَّیْشٌ کا لفظ قَرَّش سے بنا ہے جس کے معنی ادھر ادھر سے چیزیں جمع کرنا اور سمیٹنا ہیں - کہا جاتا ہے کہ قریش چونکہ حرم میں جمع ہوتے تھے اس لئے ان کا یہ نام پڑ گیا - اسی سے تَقَرَّشُ الْقَوْمُ* ہے - یعنی لوگ اکٹھے ہونے - بعض کا خیال ہے کہ وہ سامان تجارت خریدنے میں جلدی اور پہل کرتے تھے اس لئے قریش کہلائے، کیونکہ تَقَرَّش کے معنی ہیں سامان تجارت کو پہلے خریدنا - بعض نے کہا ہے کہ نضر بن کنانہ (قریش کے جہد امجد) ایک دن کپڑے میں لپٹ کر سمٹ گئے اس لئے ان کا نام قریش پڑ گیا - بعض کا خیال ہے کہ ایک دن نضر اپنی قوم کے پاس آنے تو لوگوں نے کہا کہ نَّضْرُہُ جَمَلٌ قَرَّیْشٌ* - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط اونٹ ہے - چنانچہ اس کا لقب قریش پڑ گیا - بعض نے کہا ہے کہ قُصَصِیُّ کو ”قرشی“ کہا جاتا تھا اور اس نے یہ نام قریش کو دیا - یا یہ لفظ قِیرَش نامی دریائی جانور (ویل مچھلی) کی تصغیر ہے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ہیں - یا یہ ”قریش بن مغلہ بن غالب بن فہر“ کی وجہ سے پڑا جو ان کے تجارتی قافلہ کا مالک تھا اور لڑکے کہتے تھے قَدِمَتْ عِیْرُ قَرَّیْشٍ وَ خَرَجَتْ عِیْرُ قَرَّیْشٍ* - قریش کا قافلہ آیا اور قریش کا قافلہ گیا - ازہری وغیرہ نے کہا ہے کہ تجارت اور کاروبار اور تلاش رزق کے لئے سفر کرنے کی بنا پر ان کا نام قریش پڑا ہے - بعض کا قول ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کا دار و مدار ہی تجارت پر تھا اور ان کے پاس گزارا کرنے کے لئے زمین اور سویسی نہیں تھے - اس سے ہے فُلَانٌ یَتَقَرَّشُ الْمَالَ* - فلان شخص مال جمع کرتا ہے* -

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو تولیت کعبہ کے لئے سرزمین حجاز میں بسا دیا - ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے قیدار بڑا

نامور تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں فہر (قریب ۳۲۵ء) اور قُصَیّہ بن کلاب (قریب ۵۷۷ء) بڑے مشہور ہیں۔ نبی اکرمؐ اسی خاندان کے چشم و چراغ (اور تمام دنیا کے لئے سراج منیر) تھے۔

کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش دور و نزدیک کے ممالک میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ تجارت ان کا کاروبار تھا۔ اس کے لئے مختلف قبائل واقوام نے ان سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ان کے قافلے محفوظ رہیں گے۔ قرآن کریم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لَا يُلْفِیْ قُرَیْشٌ بِمِلْفِیْهِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ (۱۰۶)۔ ”اُن عہد و پیمان کی وجہ سے جو (دوسری اقوام نے) قریش سے اس لئے کر رکھے ہیں کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں (ان کے قافلے سردی گرمی میں محفوظ طور پر سفر کرتے ہیں)۔ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں یہ مقام کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، لہذا انہیں چاہئے کہ وہ رب کعبہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں۔ فَتَلْبِثُ عِنْدَ رَبِّکَ هَٰذِیَ الْبَیْتِ الَّذِیْ اٰطَعْتَهُمْ مِّنْ جُنُوْعٍ وَّاَمَنَتْهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۷)۔ وہ رب کعبہ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔

کیسی عمدہ دلیل ہے یہ۔ یعنی یہ لوگ خدا کے نام پر اتنے مفساد حاصل کرتے ہیں لیکن اطاعت خدا کو چھوڑ کر اوروں کی کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی۔ اگر خدا کے نام سے مفاد حاصل کرتے ہیں تو خدا کے قوانین کی اطاعت بھی کریں۔ اور اگر اطاعت کسی اور کی کرنی ہے تو خدا سے اپنی نسبت ختم کریں۔

ق ر ض

اَلْقَرْضُ۔ قطع کرنا۔ کاٹنا۔ قَرْضَ الْمَكَانِ۔ وہ کسی جگہ سے کترا کر نکل گیا۔ قَرْضَ رَفِیْ سَیْرِهِ۔ وہ چلنے میں دائیں بائیں جھکا۔ (۱۰۸) قَرْضُ۔ کوئی چیز جو دی جائے، یا کوئی کام جو کیا جائے، اس امید پر کہ وہ چیز واپس مل جائیگی یا اس کام کا بدلہ ملیگا۔ اَقْرَضَ۔ کوئی چیز دینا، یا کوئی کام کرنا، اس امید پر کہ وہ واپس مل جائیگی یا اسکا بدلہ ملیگا۔ عربوں کے معاورہ میں قَرْضُ حَسَنٌ کے معنی اچھا سلوک اور معاملہ بھی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں بھی اس معنی میں یہ محاورہ آیا ہے (مثلاً ۲۳۵)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نظام ربوبیت کے قیام کے لئے جدو جہد شروع کی جائے تو اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ جماعت میں جس جس چیز کی کمی ہو اسے ملکر پورا کیا جائے۔ ہر قسم کی کوشش، ہر قسم کا جانی اور مالی ایثار جو درکار ہو، اسے بطیب خاطر پیش کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ قرض حسنہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر قرض کے دیگر معنی بھی ملا لئے جائیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ الْقَرْضُ کے معنی ہیں چبانا * الْقَرْضُ یُض * چارے کا وہ گولہ جسے اونٹ اپنے پیٹ میں سے لوٹا کر منہ میں لاتا ہے۔ پھر اسے چباتا رہتا ہے۔ (جگالی کرتا ہے) اور جب وہ ہضم کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے معدہ میں لوٹا دیتا ہے کہ وہ جزو بدن بن جائے *۔ نظام ربوبیت کے قیام میں، فرد جو کچھ معاشرہ کو دیتا ہے اسے ہوں سمجھئے کہ وہ قرض یض کی شکل میں ہوتا ہے۔ معاشرہ اسے مناسب مقامات میں صرف کر کے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ بہترین نتائج کا حامل بن جائے۔ اس طرح افراد نے جو کچھ دیا تھا وہ بہترین شکل میں پھر افراد کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ مَن ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللہَ قَرْضًا حَسَنًا فِیُضَعِفَہُ لَہُ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً (۲۴۵)۔ کوئی ہے جو اللہ کو ”قرض حسنہ“ دے تو وہ اسے اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے! یہ بڑھانا نتائج کے اعتبار سے ہے۔ اللہ کو کوئی قرض نہیں دیا جاتا، اس کے بندوں کو دیا جاتا ہے۔ لہذا وہ معاشرہ جو اللہ کے قانون کے مطابق متشکل ہو وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا نے بندوں کے متعلق اپنے اوپر لے رکھی ہیں، اور ان واجبات کو وصول کرتا ہے جو خدا نے بندوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد معاشرہ جو کچھ ایثار کریں اور جس حسن کردار کا ثبوت دیں، وہ سب ”اللہ کے لئے قرض حسنہ“ ہوگا۔

ق ر ط س

الْقِرْطَاسُ * الْقِرْطَاسُ * الْقِرْطَاسُ * کاغذ۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے *۔ (جمع قِرَاطِیْسُ ۲۴۶)۔ الْقِرْطَاسُ اس کھال کو بھی کہتے ہیں جسے تیر اندازی کے لئے نصب کرتے تھے *۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ الْقِرْطَاسُ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اس پر کچھ لکھا ہو، ورنہ بلا لکھے کو طِیْرُس * اور کاغذ کہتے ہیں۔ (اگرچہ اس کے برعکس بھی ہے) ***۔

* تاج - ** تاج و راعب - *** تاج و محیط -

قرآن کریم میں ہے وَ لَوْ أَنزَلْنَاهُ عَلَىٰ نَكَتٍ كَيْتَابًا رَفِیًّا قِرْطَاسٍ (۲)۔ اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے۔

ق ر ع

الْقَرْعُ*۔ ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔ قَرْعٌ رَأْسُهُ بِالْعَصَا۔ اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ قَرْعُ الثَّابِتِ قَرْعًا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ الْقَرْعَاعَةُ*۔ وہ پتھر (چقماق وغیرہ) جسے رگڑ کر آگ نکالی جائے۔ اَلْمِقْرَاعُ*۔ ہتھوڑا وغیرہ جس سے پتھر توڑے جائیں۔ یہاں سے اس مادہ میں شدت اور سختی یا مصیبت کے معنی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ الْقَرْعَاءُ* اس باغیچے کو کہتے ہیں جسے جانوروں نے چر ڈالا ہو۔ اور رِیَاضٌ قَرْعٌ* ان باغات کو جن میں ہریاں بول قطعاً نہ رہی ہو۔ اور اَلْقَرْعُ* عمدہ تیز تلوار کو**۔

قرآن کریم میں قَارِعَةٌ* کا لفظ سخت مصیبت کے لئے آیا ہے جو قوموں پر ان کی شامتِ اعمال سے (غلط روش کے تباہ کن نتیجہ کے طور پر) آتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے۔ . . . تَصِیْبُهُمْ یَمَآ صَنَعُوا قَارِعَةً* (۱۳)۔ ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی۔ سورۃ حاقہ میں ہے۔ کَذَٰبَتْ ثَمُودُ دُوعَادَۃً بِالْقَارِعَةِ* (۲۹)۔ اس سے مراد وہ تباہی ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ان پر آنے والی تھی۔ یہی الْقَارِعَةُ* تھی جو قریش کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آئی اور یہی وہ قَارِعَةُ* ہے جو ہر سرکش قوم پر ان کے ظلم و استبداد کی بنا پر ہمیشہ آتی ہے۔ اور جو آجکل قوموں کے باہمی تصادم (ٹکراؤ) سے آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے۔ سورۃ القارعہ (۱۰۱) میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے اس دنیا میں واقع ہونے والے تصادمات کے علاوہ اخروی زندگی کا محاسبہ بھی شامل ہے۔

الْقَرْعَةُ*۔ حصہ، نصیبہ۔ اسی سے الْقَتَاۃُ الْقَرْعَةُ* قرعہ اندازی کو کہتے ہیں***۔ اس لئے کہ اس سے حصہ متعین ہو جاتا ہے، یا پھر اس لئے کہ قرعہ اندازی میں کسی سخت چیز (پہانہ) کو دوسری چیز کے ساتھ ٹکرایا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں قرعہ اندازی کے لئے یہ لفظ (قرعہ) نہیں آیا۔ قصہ* حضرت مریم* کے ضمن میں ایک جگہ ہے اِذْ یُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ* (۳۳)۔ ”جب

وہ اپنے تیر یا قلمیں ڈالتے تھے۔“ اس سے قرعہ اندازی مراد لی جاتی ہے۔ یہودی بہت سے امور کے فیصلے قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر انجیل میں ملتا ہے۔ قرآن کریم، عقل و دانش اور فہم و تدبیر سے فیصلے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے، فیصلوں کے لئے ایسے طریق اختیار کرنا جس میں انسان اپنی عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دے، مستحسن عمل قرار نہیں پاسکتا۔

ق ر ف

الْثَّقِرُفُ - درخت کی چھال۔ انار وغیرہ کا چھلکا۔ الْثَّقِرُفُ مِیْنُ الْاَرْضِ - وہ مٹی جو سبزیوں اور ان کی جڑوں کے ساتھ زمین سے اکھڑ آئے۔ الْثَّقِرُفَةُ - کمانے اور حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا خلط ملط ہو جانا اور کسی چیز کو اوپر ڈال لینا، بہن لینا، بتائے ہیں۔ اِثْتَرَفَ کے معنی کمانا ہیں۔ اِثْتَرَفَتِ الْمَمَالُ - اس نے مال جمع کر لیا۔ رَجُلٌ قَرَفَةٌ - کماؤ مرد*۔ رَاغِبٌ لَكَہَا ہے کہ اِثْتَرَفَتْ کے معنی محنت سے کمانا اور کام کرنا ہیں، خواہ اچھا کام ہو یا برا، لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے کے لئے ہوتا ہے**۔

سورة انعام میں ہے - وَلَيَقْتَرِفُوْا مَّا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ (۱۱۲) تاکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کٹے جائیں۔ جن چیزوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں۔

ق ر ن

الْقَرْنُ - جانور کا سینک۔ انسان کے سر کا وہ حصہ جہاں جانور کے سینک ہوتے ہیں۔ سر کا بالائی حصہ۔ الْقَرْنُ مِیْنُ الْقَتُوْمِ - قوم کا سردار*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) وہ چیز جو قوت اور شدت کے ساتھ ابھر آئے اور (۲) ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ اکٹھا کر دینا۔

الْقَرْنُ - زمانہ معینہ۔ اس زمانہ کی مدت میں اختلاف ہے، لیکن عام طور پر ایک سو سال (صدی) کی مدت کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ زمانہ کا کچھ حصہ قَرْنُ کہلاتا ہے جسکی حد نہیں مقرر کی جاتی*۔ یا ہمعصر

ہا ایک امت جو ختم ہو چکی ہو۔ الْقِرْنُ ہم سر، ہم ہلہ*۔ سورۃ انعام میں ہے۔ اَلَمْ يَرَوْا اَكْتَمُ اَهْلَتَكُنَا مَيْنُ قَبْلِهِمْ مَيْنُ قَرْنٍ (۱۶)۔ اس کے معنی اقوام سابقہ ہیں۔ قَرْنٌ کی جمع قُرُونٌ ہے۔

الْقَرْنُ*۔ کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ بالذہ دینا اور ملا دینا۔ دو اونٹوں کو ایک رسی میں باندھ دینا*۔ قَرْنٌ نَتْرٌ اَلَا سَارَىٰ رِی الْحِیْبَالِ۔ قیدیوں کو اکٹھا کر کے رسیوں سے باندھ دیا گیا**۔ قرآن کریم میں ہے مَقَرَّ نَبِیْنِ رِی اَلَا صَفْتَادِر (۱۶)۔ زنجیروں میں اکٹھے جکڑے ہوئے۔

قَرْنٌ الشَّیْطَانِ۔ شیطان کی امت یا اس کی قوت*۔ اَقْرَنَ لَثْلَامُ اسے معاملہ پر قدرت و طاقت حاصل رہی۔ اس نے کسی کام کی طاقت رکھی*۔ قرآن کریم میں مَقَرَّ نَبِیْنِ (۳۳) کے معنی ہیں طاقت اور اقتدار رکھنے والے۔ الْقَرْنِیْنِ*۔ ساتھی۔ رفیق۔ ایک رسی میں بندھے ہوئے یا ایک جوئے میں جتے ہوئے*۔ قرآن کریم میں قَرْنِیْنًا بمعنی ساتھی اور رفیق آیا ہے (۳۸)۔ الْقَرْنِیْنِ*۔ بیوی کو کہتے ہیں**۔

سورۃ کہف میں ذِی الْقَرْنِیْنِ کا ذکر آیا ہے۔ (۱۸)۔ صکتب لغت اور تفاسیر میں اس کے متعلق اتنے مختلف بیانات ملتے ہیں کہ کثرت تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاہنشاہ کی خسرو (خرس یا سائرس) ہے۔ اور اس کے دو سینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جن پر وہ حکمرانی کرتا تھا۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا، اصطخر کے کھنڈرات سے شاہنشاہ خرس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو مینگ ہیں***۔ اس لئے کہ ایران میں مملکت کو قَرْنٌ (سینگ) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہی وہ شاہنشاہ تھا جس نے یہودیوں کو بابل کی المناک اسیری سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیش گوئیاں پوری ہوئی تھیں۔ یہ پیش گوئیاں تورات میں آجکل بھی موجود ہیں۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔ جبریل نے انہیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ یہ، میڈیا اور فارس کی دو سلطنتوں کا شاہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملیگی۔ پنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیش گوئی میں اس ”دو سینگوں“ والے کا نام

* تاج - ** محیط - *** (Sir Percy Sykes) نے اپنی کتاب (A History of Persia) کی جلد اول کے شروع میں (Cyrus) کے اس مجسمہ کا فوٹو دیا ہے۔

خرس لکھا ہے۔ چنانچہ جب خرس نے باہل فتح کر کے یہودیوں کو آزادی دلائی تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیش گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی۔

یہ بادشاہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتا ہوا لیڈیا (ایشیا) کو چمک کی شمال مغربی مملکت کے دار الحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارے تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے (۸۹)۔ پھر اس نے مشرق کی سمت لشکر کشی کی اور باختر کے علاقہ کی طرف گیا (۹۰)۔ اس کی تیسری لشکر کشی سلسلہ سکوه کاکیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درہ سکوه میں ایک دیوار بنائی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل ان لوگوں پر حملہ آور نہ ہو سکیں (۹۱)۔ یہ شاہنشاہ زرتشت کا متبع تھا۔ قرآن کریم کی کشادہ نگہی دیکھتے کہ اس نے اس کی بلندی سیرت و کردار کا کس خوبی سے اعتراف اور ذکر کیا ہے (۹۲)۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”ہرق طور“ میں ذوالقرنین کے عنوان کے تحت ملاحظہ کیجئے) پھر حال، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ وہ قیاسات ہیں جن تک دور حاضر کی تحقیق پہنچاتی ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد مزید تحقیقات سے کچھ اور واقعات بھی بے نقاب ہو جائیں جو قیاسات کو یقین میں بدل سکیں۔ قرآن کریم نے جس مقصد کے لئے ذی القرنین کا ذکر کیا ہے وہ مقصد اس تعین کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس سے کونسی تاریخی شخصیت مراد ہے۔

ق ر ی

الْقَرْيَةِ - بڑا شہر۔ شہر۔ وہ جگہ جہاں ٹھہرنے کے لئے بہت سے مکانات ایک دوسرے سے سائے ہوئے ہوں*۔ بستی۔ اسکی جمع قَرٰی ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ نیز خود جمع ہونے والے آدمیوں کو بھی کہتے ہیں***۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ الْقَرْيَةُ اس شہر کو کہتے ہیں جس کے گرد شہر پناہ ہو۔ اور قَرْيَةٍ اور بَلَدَةٍ اسے کہتے ہیں جس میں یہ نہ ہو**۔ (لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں)۔ قَرْيَةٍ کے معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔ قَرْيَةُ الْمَاءِ فِي الْحَوْضِ۔ حوض میں پانی جمع کر دیا۔ اسی اجتماعیت کے اعتبار سے بستی کو قَرْيَةُ کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمع کرنے اور مجتمع ہونے کے ہوتے ہیں۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

سورہ بقرہ میں قَدْ رَیْتُمْ (۲۵۹) بستی کے لئے آیا ہے۔ اور سورہ انبیاء میں قَدْ رَیْتُمْ (۲۱) سے مراد اہل قریبہ (بستی کے لوگ) ہیں۔ سورہ زخرف میں الْقَرْیَتَیْنِ (۲۳) آیا ہے جس سے مراد مکہ اور طائف کی بستیاں ہیں۔ اہل لغت نے اسکی تصریح کی ہے کہ قریش جب بھی الْقَرْیَتَیْنِ کہتے تو اس سے ان کی مراد مکہ اور طائف کی دونوں بستیاں ہی ہوتیں ***۔

ق س ر

قَسْرَہٗ عَلٰی لَا مَسْرِ۔ اس نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا۔ قَسْرَہٗ۔ وہ اس پر غالب آگیا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ غلبہ اور تسلط کے ہیں۔ الْقَسْوَرۃُ۔ شیر کو کہتے ہیں۔ نیز شکاری اور تیر انداز کو **۔ قرآن حکیم میں ہے فَرَقْتُ مِیْنُ قَسْوَرۃٍ۔ (۶۹) شیر سے بھاگ رہے ہوں (کہ کہیں کھا نہ جائے)۔

ق س س

الْقِیْسُ۔ کسی چیز کو طلب کرنا۔ اسکی تلاش کرنا۔ فُلَانٌ قَسٌّ اِبِلٍ۔ فلان آدمی اونٹوں کا عالم ہے۔ یعنی جو اونٹوں کے ساتھ ہمیشہ رہے * اور ان کی عادات و اطوار سے خوب واقف ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے اصلی معنی کسی چیز کی رات کے وقت جستجو کرنے کے ہیں **۔ الْقِیْسِیُّسُ۔ علم اور شریعت میں نصاریٰ کا سردار (۸۲)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ”شیخ“ کے آتے ہیں۔ کلیسا کے عہدوں میں اس کا درجہ اسقف (Bishop) سے نیچے ہوتا ہے ***۔

ق س ط

الْقِیْسُطُ۔ مبنی بر عدل حصہ **۔ حصہ، نصیبہ، مقدار ***۔ تَقْسِطُوا الشَّیْءَ بَیْنَهُمْ۔ انہوں نے اس چیز کو آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیا ***۔ چنانچہ قِیْسُطًا سِ ترازو کو کہتے ہیں۔ (۲۵۷ : ۲۸۲) بلکہ (صاحب لطائف اللغۃ کے قول کے مطابق) سب سے زیادہ صحیح ترازو۔ اَقْوَمُ التَّمِیَازِیْنِ۔ اَلْقِیْسُطُ عَدْلٌ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِیْسِطِ۔ (۵۲) اور سورہ اعراف میں قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِیْسِطِ۔ (۲۹) اسی سے ہے۔ اَقْسَطُ۔ اس نے عدل کیا، انصاف کیا۔ سورہ حجرات میں ہے کہ فَاَصْلَحُوا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (۲۹)۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔ **** تاج و محیط۔

لیکن قَسَطٌ یَقْسِطُ کے معنی ظلم کرنے اور حق سے ہٹ جانے کے بھی آتے ہیں *۔ (یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے)۔ آیت (۱۵۴) میں قَاسِطُونَ کے معنی ظلم کرنے والے ہیں۔ اس کے مقابل میں مُسْلِمُونَ آیا ہے (۱۵۴)۔ یعنی مسلم وہ ہے جو کبھی ناانصافی نہیں کرتا۔ اَلْقَسَطُ کے معنی ہوتے ہیں گردن کا سوکھ جانا۔

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، قِیْطٌ اور عَدْلٌ دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھئے کہ عَدْلٌ کے معنی ہونگے دو آدمیوں میں برابر برابر کا سلوک کرنا۔ اور قِیْطٌ کے معنی ہونگے کسی کے حقوق و واجبات کا پورا ادا کر دینا۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو آیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَقْسِطُوْا فِی النِّسَابِ (۳) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم دبکھو (تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم) یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کر سکو گے۔ (یعنی معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کر سکو۔ ان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکو)۔ یعنی اس میں کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کا سوال نہیں۔ خود اُن کے حقوق کو پورا کرنے کا سوال ہے۔ اس سے آگے ہے وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اِنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَاءِ (۱۳۹) تمہیں اس کی استطاعت نہیں کہ عورتوں میں عدل کر سکو۔ یہاں مختلف عورتوں میں برابر کے سلوک کا سوال ہے، اس لئے عَدْلٌ کا لفظ آیا ہے۔

ق س م

قَسَمَ - یَقْسِمُ - کسی چیز کے حصے کر دینا۔ بانٹ دینا۔ فَانْقَسَمَ چنانچہ وہ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اَلْقِسْمَةُ - تقسیم، بانٹ **۔ قِیْسَمَةٌ ضِیْزَلِ (۵۳) - بے انصافی کی تقسیم۔ قرآن کریم میں ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیْوةِ الدُّنْیَا (۳۳)۔ ”ہم نے انکی دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کا حاکمانِ زیست تقسیم کیا ہے“۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ خدا یونہی (معاذ اللہ) اندھا دھند رزق کی تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کی تقسیم کے لئے اس کا قانون مقرر ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳)۔ انسان کو وہی کچھ ملیگا جس کے لئے وہ

کوشش کرے۔ یہ جو ہم دنیا میں اس اصول کے خلاف تقسیم رزق دیکھتے ہیں، تو یہ تقسیم، قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔

مَقْسُومٌ - تقسیم کیا ہوا (۱۵/۱) - مَقْسِمٌ - تقسیم کرنے والا۔ (۵۱/۳) - الْمُقْتَسِمِينَ (۱۵/۱) آپس میں ہانٹ لینے والے - اسْتَقْسَمَ - تقسیم چاہنا۔ جاہلیت میں جانور کو ذبح کر کے، تیروں یا ہانسون کے ذریعے اس کے حصے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کے طریق کار کو اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی فہم و بصیرت کی رو سے فیصلے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دیتا ہے جو وجہ تذلّیل انسانیت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی رو سے قمار بازی اور فال لینا ناجائز ہیں (قمار بازی کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر اور فال لینے کے لئے ز۔ ل۔ م)۔

قَسَمَ - دلیل و شہادت** جو حق اور باطل کو الگ الگ کر کے رکھ دے۔ وَ لَآ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَقَسَمَ لَوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (۵۱/۳) اگر تم سمجھ سکو تو یہ شہادت (جسے میں پیش کر رہا ہوں) ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ أَقْسَمَ بِالْغَيْبِ - کسی چیز کو بطور دلیل و شہادت پیش کرنا (۲۱/۳)۔ لیکن یہی لفظ جب عام لوگوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی قسم کھانے کے ہو جاتے ہیں۔ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ (۳۵/۳) مجرمین قسمیں کھائیں گے۔ ابلیس کے متعلق ہے۔ وَقَسَمَ لَهُمَا (۲۱/۳) - اس نے ان دونوں سے قسم کھا کر کہا۔

مومنین کا شیوہ قسمیں کھانا نہیں بلکہ اپنے دھوئے کے ثبوت میں دلائل و شہادات پیش کرنا ہے۔ قسم توڑنے کا جو کفارہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حتی الامکان قسمیں کھائی ہی نہ جائیں تاکہ بعد میں کفارہ ادا نہ کرنا پڑے۔

ق س و

قَسْوَةٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا سخت ہو جانا۔ بھر قَسْوَةٌ سے مراد قَسْوَةُ الْقُلُوبِ ہوتی ہے، یعنی سنگدلی۔ حَجَرٌ قَاسٍ - ٹھوس اور سخت پتھر۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ق۔ س۔ و کا خاصہ

قوت اور اجتماع ہے۔ * - آرض قناسیۃ - سخت زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ لیلۃ قناسیۃ - سخت اندھیری رات -

قرآن کریم میں ہے ثم قسست قتلوا بکم مین بتعد ذالکت فہی کالججارۃ او اشد قسوة (۲۰)۔ ”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر۔“ اس میں قساوت کے معنی واضح ہیں۔ یعنی کالججارۃ۔ پتھر کی طرح سخت۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سورۃ الحج میں ہے والقناسیۃ قتلوا بہم (۲۲)۔ جن کے دل سخت ہیں۔ سورۃ الزمر میں یہ حکم کر اس کی تشریح کردی کہ یہ ان لوگوں کی ضد ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ من شرح اللہ صدۃ رۃ لئلا یسلام (۲۶)۔ اللہ جن کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دے۔ لہذا دل کی قساوت کے یہ معنی ہیں کہ بلا غور و فکر اپنی بات ہر اڑے رہنے، اور دوسرے کی نہ سننے کی وجہ سے انسان میں حق کے سمجھنے اور اس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ اسی کا نام ضد، تعصب، ہٹ دھرمی ہے۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ح اور ص۔ د۔ ر)۔

ق ش رع

القشاعر وہ جو چھوٹے میں درخت اور کھردرا ہو۔ - اقشعرۃ جلدہ - اس کی جلد ہر کپکپی آگئی - اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ اس سے کنایہ خوف بھی مراد لیا جاتا ہے۔

سورۃ زمر میں ہے تقشعرۃ مینہ جلتود۔ (۳۹)۔ اس سے ان کے بدن ہر کپکپی چھا جاتی ہے۔

ق ص د

قصد کے اصلی معنی ہیں ارادہ کرنا۔ توجہ کرنا۔ کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس کے لئے اٹھ کھڑے ہونا۔ خواہ یہ اعتدال کے ساتھ ہو یا نہ ہو۔ القصد فی الامر۔ کسی معاملہ میں ممانہ روی اور اعتدال اختیار کرنا۔ مثلاً قصد فلان فی مشیہ۔ اس نے اپنی رفتار میں ممانہ روی اختیار کی۔ سفر قاصد (۲۴) معتدل سفر۔ چنانچہ القصد والتقصید کے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا یا بیچ سے توڑ کر آدھا آدھا کر دینا۔

* تاج - ** العلم الخفاق ۔

اِقْتَصَدَ رَفِیُّ اَمْرِهِ۔ وہ اپنے معاملہ میں مستقیم، معتدل اور میانہ رو رہا۔
 ادھر ادھر نہیں جھکا۔ اسی سے اِقْتَصَدَ کے معنی ہیں راستہ کا سیدھا اور
 واضح ہونا*۔ قرآن کریم میں ہے عَلٰی اللّٰهِ قَصَدُ السَّبِيْلِ (۱۶)۔ ٹھیک
 سیدھی اور مستقیم راہ کو واضح کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ اس نے ایسا کر دیا ہے
 اور وہی ایسا کر سکتا ہے۔ (لیکن لوگ اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی
 راہیں اختیار کر لیتے ہیں)۔ اگر اس آیت میں علیٰ بمعنی الٰہی لئے جائیں تو
 مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے والا راستہ صرف درمیانی ہے۔ ادھر ادھر کی
 ٹیڑھی راہیں نہیں۔

رغب نے لکھا ہے کہ اَلَا قَتِيصَادٌ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک مطلقاً
 محمود ہوتا ہے جس میں افراط و تفریط کے دو سیرے ہوتے ہیں اور ان کو چھوڑ
 کر درمیانی راہ اختیار کی جاتی ہے، جیسے۔ وَ اِقْتَصِدْ رَفِیُّ مَشِيْكَت (۳۱۹)۔
 اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ یہ محمود ہے۔ اس لئے کہ رفتار میں نہ
 تیزی اچھی ہوتی ہے نہ سستی۔ لیکن دوسری قسم کے اقتصاد کے دو سیروں میں
 سے ایک محمود اور دوسرا مذموم ہوتا ہے۔ مثلاً عدل اور ظلم کے بین بین رہنا۔
 ایسے شخص کو جو ان دو سیروں کے درمیان آتا جاتا رہے مُقْتَصِدٌ
 کہا جائیگا**۔

رغب نے جو کچھ کہا ہے وہ ذرا وضاحت طلب بھی ہے اور غور طلب
 بھی۔ (مثلاً) ایک طرف اسراف ہے اور دوسری طرف بخل۔ یہ دونوں سیرے
 (Extremities) مذموم ہیں۔ محمود راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ یعنی جود
 و سخا۔ نہ بے جا اور فضول خرچ کرنا اور نہ ہی سب کچھ اپنی ذات کے
 لئے رکھ چھوڑنا۔ یہ اقتصاد (درمیانی روی) قابلِ تعریف ہے۔ اب دوسری مثال
 لیجئے۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل۔ ان میں سے صرف ایک سمت
 (حق) ہی محمود ہے۔ دوسری سمت (باطل) محمود نہیں۔ لہذا ان دونوں کے
 بین بین چلنا خوبی کی بات نہیں۔ قابلِ ستائش وہی ہے جو حق پر چلے، نہ وہ
 جو حق اور باطل کی درمیانی راہ چلے۔ حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ جو شخص
 اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جاتا ہے وہ باطل پر چلا جاتا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طرف عدل ہے اور دوسری طرف ظلم ہے۔
 قابلِ ستائش وہ ہے جو عدل پر چلے۔ لیکن ایک شخص عدل اور ظلم کی درمیانی
 راہ چلتا ہے۔ یعنی کبھی عدل کرتا ہے کبھی ظلم کرتا ہے۔ یا نہ عدل کرتا ہے

نہ ظلم کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں (Indifferent) رہتا ہے۔ اس شخص کو اگر عدل کے پیمانہ سے ماپا جائے تو اس کا یہ عمل محمود نہیں۔ لیکن اگر ظلم کے پیمانہ سے ماپا جائے تو یہ بہر حال، ظالم سے بہتر ہوگا۔ اس کی مثال ہمیں سورۃ فاطر میں ملتی ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے وراثت کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا۔ قَمِینُہُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِیہِ وَمِنْہُمْ مَّقْتَصِدٌ۔ وَمِنْہُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ..... (۳۵)۔ ”سو ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے“۔ (نیز دیکھئے ۶۶)۔ ظناہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابل ستائش (اور قرآنی معیار کے مطابق) سابق بالخیرات کا گروہ ہے۔ اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں۔ لیکن ان کے بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار گروہ اول میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ، گروہ اول سے ذرا اونچا ہوگا اور تیسرے گروہ سے بہر حال نیچے۔ لیکن اس کی اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابل ستائش نہیں کہا جاسکتا۔ قرآنی معیار پر وہی پورے اتسار کے جو ”سابق بالخیرات“ ہونگے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے اور اُمّۃٌ وَسَطٌ وہ قوم ہے جو درمیان کی راہ چلتی ہے، تو یہ صحیح نہیں۔ اسلام، حق کا راستہ ہے، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ۔ اور اُمّۃٌ وَسَطٌ، حق پر چلنے والی جماعت ہے، نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت۔ (وسط کے لئے دیکھئے عنوان و۔ س۔ ط) البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہوں (مثلاً اسراف اور بخل) وہاں اسلام درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے۔

ق ص ر

الْقَصْرُ۔ الْقِصْرُ۔ طویل نہ ہونا۔ کوتاہ اور مختصر ہونا۔ الْقَصْرُ۔ روکنا، بند کرنا (کسی حد میں محدود رکھنا)۔ قَصَرَ الشَّیْءُ۔ کسی چیز کی لمبائی میں کمی کرنا۔ قَصَرَ الشَّعْرُ۔ بال چھوٹے کر دئے۔ سورۃ نساء میں ہے اَنْ تَقْصُرُوْا مِنْ الصَّلٰوۃِ (۱۶:۱) تم صلوٰۃ کو مختصر کر دو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اپنی انتہا یا مقررہ حد تک نہ پہنچنا اور (۲) روکنا۔ قید کرنا۔ اَمْرٌ اَوْ مَقْصُوْرٌ۔ پردہ نشین ہورت۔

* تاج و راغب ۔

الْمَقْصُورَةُ - محفوظ دیواروں سے گھرا ہوا وسیع گھر یا چھوٹا کمرہ*۔
 قرآن کریم میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے متعلق ہے مَقْصُورَاتٌ رَفِیْ
 الثَّیْبِیَّاتِ (۲۴) - خیموں میں بہ حفاظت رکھی ہوئیں - دوسری جگہ انہیں
 قاصِرَاتُ الطَّرْفِ کہا ہے (۳۸) - اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سٹا کر
 رکھنے والیاں* - جو نگاہوں کو بے ہاک نہ ہونے دیں - الْقَصِیْرُ - موٹی
 موٹی (جلانے کی) لکڑیاں - بڑے درختوں کی جڑیں* - قرآن کریم نے جہنم کے
 شعلوں کو اس سے تشبیہ دی ہے (۴۴) - قَصَرَ عَنْ الْأَمْرِ - کسی بات سے
 باز رہنا - ابن السکیت نے کہا ہے کہ قَصَرَ عَنْهُ اس وقت بولتے ہیں جب
 کوئی شخص کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو - یعنی اسے کرنے کی قدرت نہ
 رکھے، اور أَقْصَرَ عَنْهُ - جب اُسے کرنے کی قدرت تو رکھے لیکن اسکی باوجود
 باز رہے* - سورة اعراف میں ہے ثُمَّ لَا یُقْصِرُونَ (۴۴) - وہ رکتے نہیں،
 کمی اور کوتاہی نہیں کرتے -

سورة فتح میں مَقْصِرِیْنِ آیا ہے (۴۸) - یعنی بال کتروانے والے -
 قَصَرَ سَهْمُهُ عَنِ الْهَدَفِ - اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا* - اس
 سے تَقْصِیْرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جس کا استعمال ہمارے ہاں عام
 طور پر ہوتا ہے - اور "قصور" کے معنی بھی -

ق ص ص

قَصَّ آثَرَهُ یَقْصُ قَصْصًا وَقَصَصًا - کسی کے پیچھے پیچھے اس
 کے نقوش قدم پر چلنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی
 کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوئے ہیں - قرآن کریم میں
 دیکھئے (۱۸/۱۱) (۲۸/۱۱)

قَصَّ عَلَیْهِمُ الْمُخْبِرَ قَصَصًا - اسے وہ خبر بتا دی - اسے اس پر مطلع کر
 دیا* - قرآن کریم میں ہے - نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ
 (۱۲) - ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں - الْقَصَصُ - قصہ گو -
 ایک حدیث میں ہے إِنَّ بَنِي إِسْرَآئِیْلَ لَمَّا قَصَصُوا هَلَکُوا - بنی
 اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے - یا جب انہوں نے
 (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو
 ہلاک ہو گئے* - (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا) - الْقِصَّةُ - معاملہ -
 خبر - واقعہ* -

قَصَّ الشَّعْرَ - اس نے بال کاٹے۔ اَلْقِصَصُ - قینچی کو کہتے ہیں*۔
 اَلْقِصَاصُ - مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا
 مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا۔ قانون عدل کا مجرم کے
 پیچھے پیچھے چلنا۔ راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ)
 کا آنا کئے ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں
 استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق
 ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس
 نے کھدیا کہ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ
 فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّفْسَ جَمِيعًا - جس نے کسی متنفس کو ماری ڈالا، بجز
 اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا
 ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے
 تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ وَمَن أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّفْسَ
 جَمِيعًا (۲۴)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے
 گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم
 کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے، یا ملک میں
 فساد برپا کر دے، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (۲۴) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن
 چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر
 انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے
 کہ كَتَبَ عَلَیْكُمْ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ (۲/۱۷۸)۔ ”تم ہر مقتولین
 کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے“۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے
 مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ
 پہلے کہا جا چکا ہے، قِصَاص کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔
 لہذا قصاص کا مطلب عوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اُسے ایسے
 ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز متول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کمر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ ہر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ”قابل دست اندازی پولیس“ قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs....)۔ لہذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے الْحَرُّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل، مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداهت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں ہم اصول مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عَفِيَ لَهٗ مِّنْ أَخِيهِ شَيْئًا فَتَابَسَّاعٌ بِالْعَمَلِ وَفِرَّ وَادَّاعٍ إِلَيْهِ بِلَا حَسَنَانٍ ذَا لِيكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكَمْ وَرَحْمَةٌ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دیدی جائے تو اسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ”کچھ معاف کر دینا“۔ (شی) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ”کچھ معاف کر دینے“ (اور کچھ باقی رہنے دہنے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ”کچھ معاف کر دینے“ کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دبت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔ جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَا۔ کسی مومن کے یہ شایاں ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مَّشُورَةٌ وَقَدْ بَيَّنَّاهُ مَشْهُورَةً لِلْأَعْلَىٰ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا۔ ”اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائیگا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے، مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عَفِيَ لَهٗ مِّنْ أَخِيهِ شَيْئًا کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خوں بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقیماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہوگی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (۳۴) اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس

کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب ہے ، اور اس کی لعنت - اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے ۔ ”۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خون بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائیگی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیور میں آکر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی۔ جرم کی نوعیت اور احوال و ظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جزاؤں، جہنم کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور۔ قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم کر دینا (Disqualify) لعنت کے بھی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم، موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے قَتَلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ فَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوَلِيِّهِ سُلْطٰنًا۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں، اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں، مجھے کوئی ہوجھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعم بباطل میں نہیں رہنا چاہیئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو ”سلطان“ بنایا ہے۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا ہشت پناہ ہوگا۔ اِنَّهٗ كَانَ مَسْنُوْرًا (۱۱۴)۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ

قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ قَتْلًا یُسْرِفُ فی القَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ”اسراف فی القتل“ ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَتَقَدَّرُ جَعَلْنَا لِيُوكَلِّمُهُمُ سُلْطَانًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے۔ افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم، معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہذا قَتْلًا یُسْرِفُ فی القَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

۱۔ وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا سَیْءًا وَاضِحًا ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں۔ قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً، نادانستہ، بھول چوک میں، غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمدہ قتل کیا ہو۔

۲۔ معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا، اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار بنے گا۔

۳۔ قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور ”اللہ کا غضب و لعنت اور عذاب عظیم“ وغیرہ اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، یا اس سے نچلے درجہ پر، دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل، افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہذا، مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا، مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل ہلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خوں بھیا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکل معاف کر دیں یا خوں بھیا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ ”کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے“۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے۔ قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن، کسی باشد، ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۳۳)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خوں بھیا ادا کرنا ہوگا تا کہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمدہ قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی اس قدر قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جا سکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو، یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر، یا دشمن سے جنگ میں، یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے، وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ

افراد از خود) کہ بالحق کسی قتل کیا جا سکتا ہے۔ لہذا مقتولِ مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں۔ یہ ہے وہ قیصاص جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (۲/۹۹)

ق ص ف

قَصِفَ يَقْصِفُ - قَصِفْنَا - کسی چیز کو توڑنا - رَعْدٌ قَاصِفٌ - سخت آواز والی گرج - الْقَصِيفُ - درخت کے خشک ہو کر ٹوٹ جانے والے ٹکڑے - نیز ہر وہ چیز جو آدموں آدم سے دو حصوں میں ٹوٹ گئی ہو - عَصَفَتِ الرِّيحُ فَتَقْصِفَتِ السِّفِيْنَةُ - تیز آندھی چلی اور اس نے کشتی کو توڑ دیا * - قرآن کریم میں قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ (۱۹۹) انہی معنوں میں آیا ہے - یعنی ایسی تیز ہوا جو (کشتی کو) توڑ ڈالے - صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ الْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں ہیں جو میدانوں اور صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور الْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں تلاطم پیدا کر دیں -

ق ص م

قَصَمَ يَقْصِمُ - قَصَمْنَا - کسی چیز کو توڑ دینا (ابن فارس) ، خواہ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے یا نہ ہو * - هُوَ أَقْصَمُ الشَّيْءِ - اس کا سامنے کا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے - سَيْفٌ قَصِيمٌ - وہ تلوار جس کی دھار ٹوٹی ہوئی ہو * - اسی سے کہتے ہیں قَصَمَهُ اللَّهُ - خدا اسے ذلیل کرے * - سورہ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ - کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ذلیل و خوار کر دیا - یعنی انہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا - ان کا شیرازہ بکھیر دیا (ان کے جرائم کی پاداش میں) -

ق ص و

قَصَا عَنْهُ - وہ اس سے دور ہوا - قَصَا الثَّمَانُ - جگہ دور ہو گئی (ابن فارس) - قَصِيٌّ - دور، بعید - جَمْعُ أَقْصَاءَ - الْقُصُوفِ - آخری حد تک دور - انتہائی بعید * - بِالْعُدْوَةِ الْقُصُوفِ (۲/۲۱) - دور کے کنارے پر - مَكَانًا قَصِيًّا (۱/۲۲) - دور جگہ * - الْمَسْجِدُ لَا قُصَا (۱/۲۳) - بہت دور کی مسجد - عام طور پر اس سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے - لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد

مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے قریب تین سو میل دور ہے، اور جس کی طرف نبی اکرمؐ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی مسجد گاہ بننا تھا۔ یعنی ان کے نظام اطاعت و فرمان پذیری کا مرکزی مقام۔

ق ض ب

قَضَبَتْہ - اس نے اسے کاٹ دیا۔ فَانْقَضَتْہ - چنانچہ وہ کٹ گیا۔ قَضَابَةُ الشَّيْءِ - جو حصہ کسی چیز سے کاٹ دیا جائے۔ جو کچھ درخت کی شاخوں سے کٹ کر گرے۔ انْقَضَبَ - وہ شاخیں جو کسی درخت سے تیر اور کمان بنانے کے لئے کاٹی جائیں۔ یا ایک درخت جس کی لکڑی تیر کمان بنانے کے کام آتی ہے۔ یا ہر لمبا اور پھیلا ہوا درخت *۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ درخت کی شاخوں کو قَضِيبٌ اور سبزیوں ترکاریوں کی شاخوں کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے **۔ چنانچہ قرآن کریم میں عِنَبًا وَقَضْبًا (۸۸) آیا ہے، تو اس کے معنی ترکاریوں کے ہیں۔ فراء نے کہا ہے کہ اہل مکہ ایک چارہ (قَتَّ) کو قَضْبٌ کہتے تھے *۔

ق ض ض

قَضَضَ يَقْضِضُ - قَضَضًا - کسی چیز کو کوٹنا اس میں سوراخ کرنا۔ قَضَضَ الْوَتِيدَ - اس نے میخ کو اکھاڑ لیا۔ انْقَضَقَتْہ - چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ کنکریوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گرتا ہے۔ انْقَضَضَ الْجِدَارُ - دیوار میں شکاف آگیا مگر وہ ابھی تک گری نہیں ***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے اور خود تاج میں بھی ہے کہ اس کے معنی ہیں دیوار گر گئی۔ قرآن کریم میں ہے جِدَارًا يُسْرِدُ اَنْ يَنْقَضَضَ (۱۱۱) دیوار جو گیرا ہی چاہتی تھی۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تین ہیں۔ (۱) کسی چیز کا نیچے کی طرف گرنا۔ (۲) چیز میں کھردرا پن اور نا ہمواری ہونا۔ (۳) چیز میں سوراخ کرنا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے سورہ کہف میں یہ لفظ گرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ق ض ی

انْقِضَاءُ کے مختلف معنی آتے ہیں۔ لیکن ان تمام معانی کی اصل کسی چیز کا منقطع ہونا، ختم ہو جانا، اور مکمل ہو جانا ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے

* تاج ** راغب - *** تاج و محیط و راغب ۔

کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا اور اسے اُس کی جہت پر نافذ کرنا ہیں۔ یعنی جس طرف اسے جانا چاہیے اُدھر لے جانا۔ راغب نے القضاء کے معنی جدا کرنا اور قطع کرنا لکھے ہیں۔ قَدْ قَضٰی دَیْنَهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے قرض کو پورا پورا چکا دیا اور اس طرح قرض خواہ کا جو معاملہ اس کے ساتھ تھا اسے ختم کر دیا۔ اسی لئے اس کے معنی حتمی اور آخری فیصلہ کے آتے ہیں۔ چنانچہ الْقَضٰی سَوْت کو کہتے ہیں۔ قَضٰی الَیْہ کے معنی ہیں معاملہ کو اس تک پہنچا دیا *۔

الْقَضَاءُ کے معنی کسی چیز کو پورے طور پر بنا دینا اور اس کا اندازہ مقرر کر دینا بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی بات کو بالکل واضح کر دینا بھی ہیں *۔

الْتَقَضٰی کے معنی، طلب کرنے کے ہیں *۔

قرآن حکیم میں خدا کے متعلق ہے۔ اِذَا قُضِيَ اَمْرًا (۲/۱۱۷)۔ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ سورہ طہ میں ہے کہ دربارِ فرعون کے ساحرین نے فرعون سے کہا کہ قَاتِلْ مَا اَنْتَ قَاتِلُ (۲۰/۲۴) جو کچھ تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر دے۔

سورہ فصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو مسکامارا۔ لَقَضٰی عَلَیْہِ (۲۸/۱۵)۔ اس کا کام تمام کر دیا۔ ذرا آگے ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے خسر سے کہا کہ اِبْسَمًا لَا جَلٰلَیْنِ قَضٰیْتُ (۲۸/۲۸)۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں۔ سورہ زخرف میں یہ لفظ مَثٰکُث کے مقابلہ میں آیا ہے جس کے معنی بتا رہنے کے ہیں۔ اس لئے یَقْضُ (۲۳/۲۳) کے معنی ختم کر دینے کے ہوں گے۔

چونکہ انسانی دنیا کے متعلق خدا کے فیصلے انسانوں تک وحی کے ذریعے پہنچتے ہیں اس لئے وَقَضٰیْنَا الَیْہِ (۱۶/۱۶) کے معنی ہیں ”ہم نے اس کی طرف وحی کی“ یا وحی کے ذریعے اپنا قطعی فیصلہ بتا دیا۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ قَضٰیْنَا الٰی بنی اسرائیل اِسْرَآئِیْلَ فِی الْکِتَابِ (۱۷/۱۷) ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اس فیصلہ کو بذریعہ وحی، کتاب میں بھیج دیا تھا۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے۔ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاہَ اِلَّاہًا (۱۷/۱۷) تیرے رب نے وحی کے ذریعے اپنے اس حکم کو انسانوں تک پہنچا دیا کہ اس کے قانون کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہ کریں۔

سورہ قصص میں ہے ۔ اِذْ قَضَيْنَا اِلٰی مُوسٰی (۲۸) ۔ جب ہم نے موسیٰ کی طرف وسی کی ۔

سورہ حم سجدہ میں ہے فَتَضَلَّھُنَّ سَبْعَ سَمَوٰتٍ (۱۱) ۔ ”سو انہیں متعدد کُڑے بنا دیا“ ۔ یہاں اس کے معنی ، بنانا ، مکمل کرنا ، اور اندازہ مقرر کرنا ہیں ۔ سورہ انعام میں ہے ۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا (۲) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی اور پھر ایک میعاد ٹھہرا دی ۔ یعنی اس کا فیصلہ کر دیا کہہ نوع انسان کو زمین پر ایک مدت تک رہنا ہے ۔ [وَلَکُمْ فِیْہِ الْاَرْضُ مَسْتَقَرًّا وَمَتَاعٌ اِلٰی حَیْثُ] (۶) ۔ تمہارے لئے زمین میں ایک مدت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ۔

سورہ مومن میں ہے وَاللّٰهُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ (۲۰) ۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے ۔ سورہ مریم میں ہے ۔ اَمْرًا مُّقْضِیًّا (۱) فیصلہ شدہ بات طے شدہ معاملہ ۔ مقررہ قانون ۔

ق ط ر

الْقَطْرِ ۔ بوندیں ۔ قطرے (واحد قَطْرۃ* ہے) یا جو چیز قطرہ قطرہ جمع ہو کر بنے ۔ بارش (کا ہانی) ۔ مَحَاب* قَطُور* ۔ بہت بوسنے والا بادل ۔ الْقَطِیْر* ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ یا تانبہ کی کوئی قسم * (۱۶) ۔ الْقَطِیْرَان* ۔ الْقَطِیْرَان* ۔ رال ۔ ایک قسم کا چکنا سیال مادہ جو صندوبر وغیرہ کے پھلوں سے نچوڑے ہوئے رس کو ہکا کر تیار کیا جاتا ہے * (۱۷) ۔

الْقَطِیْر* ۔ کنارہ ۔ جانب ، جمع اَقْطَار* (۵۵) ۔ اطراف و جوانب ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے الفاظ کسی قاعدے کے ماتحت نہیں ہیں ۔

ق ط ط

الْقَطَط* ۔ کسی چیز کو چوڑائی میں کاٹنا (ابن فارس نے اس میں تیزی سے کاٹنے کا اضافہ کیا ہے) ۔ طول میں کاٹنے کو قَطَط* کہتے ہیں ۔ اِنْقَطَع* الشَّیْءُ* ۔ چیز کٹ گئی ۔ اَلْقِیْط* ۔ معین حصہ (کاٹ کر الگ کیا ہوا) ۔ صحیفہ جس پر کسی آدمی کو دیا جائے والا انعام لکھا ہو ۔ ہر لکھا ہوا صحیفہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ کتابِ محاسبہ کو قِیْط* کہتے ہیں ** ۔

* تاج ۔ ** تاج و راعب ۔

قرآن کریم میں ہے - رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَتَا (۳۸) - جہاں اس کے معنی حصہ یا حساب نامہ کے ہیں - یعنی ”اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہمارا حساب چکا دے - یعنی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے - اس میں عجلت کر دے“ -

ق ط ع

قَطَعَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں - جیسے قَطَعَ اللَّحْمُ - گوشت کاٹنا - اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کاٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِيلُ - ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا - قَطَعَ لَيْسَانَهُ - کسی پر احسان کر کے اس کی زبان بند کر دینے * کو بھی کہتے ہیں ** - قرآن کریم میں يَنْقُطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يَشَوْصَلْ (۱۰۴) میں، یہی معنوی انقطاع مراد ہے - یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملانے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں - نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں -

قَطَعَ خَصْمَهُ بِالْحَبْجَةِ - اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو لا جواب کر دیا * - قَطَعَ رَحِمَتَهُ قَطِيعَةً - اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے - چنانچہ أَفْطُوْهُ عَنَّا اس چیز کو کہتے ہیں جو قطع تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس) - قَطَعَ عُنُقَ دَابَّتَيْهِ کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا - بلکہ مجازاً اس کے معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا * - قَطَعَتْ لَيْسَانَهُ کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی * - قَطِيعَتُ يَدِهِ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں حکوفی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ پیکار ہو گیا * - چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قَطَعْنِ أَيْدِيَهُنَّ (۱۲۱) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر

* تاج - ** غزوہ حنین کا واقعہ ہے کہ حضور ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو چالیس اونٹ دئے - وہ بہت غصہ ہوا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور جس طرح ہو سیری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو - صحابہ رضی اللہ عنہم اور وہ جتنے میں راضی ہوا اسے دیکر راضی کر لیا - یہ تھا مطلب قطع لسان کا - (بحوالہ اصح السیر عبدالرؤف دانا پوری - صفحہ ۲۹۶) -

الگ کر کے پھینک دئے۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رک گئے۔ (یا فرط حیرت میں انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے)۔ اسی طرح قُطَّاعُ الطَّارِقِ یُقْرِ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں*۔ قرآن کریم نے (قوم لوط کے ضمن میں) اسے قُطَّعُ السَّبِيلِ کہا ہے (۲۶)۔ یا اس آیت میں تَقُطَّعُونَ السَّبِيلَ کے معنی ہیں خلاف وضع فطری سے افزائش نسل انسانی کے راستے بند کر دینا۔ قُطَّعَ بَیْہ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی۔ وہ مایوس ہو گیا۔

قُطَّعَ مِیْنُ اللَّیْلِ سے مراد رات کا حصہ ہے جو شروع رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں*۔ (دیکھئے ۸۱)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے۔

قُطَّعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی نا امید ہو گیا اور عاجز رہ گیا**۔ قُطَّعَ الْأَمْرُ کے معنی ہیں کسی بات کا آخری فیصلہ کرنا۔ اسی سے آیت (۲۴) میں ہے مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں.....

سورة المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا (۳۸) جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن لفظ قُطَّعَ اور قُطَّعَ بَدَلِ کے مذکورہ صدر معانی کے پیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی مساندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے ”جَزَاءُ يَحَا كَسَبَتْ نَكَالًا“ مِیْنُ اللَّهِ (۳۸)۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانون خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک کے۔ (نَكَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ ک۔ ل)۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ اس لئے کہ اس سے آگے ہے فَمَنْ تَابَ مِیْنُ بَعْدِ ظُلْمِهِ، وَاصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ (۳۸)۔ اور جو مجرم ارتکاب جرم کے بعد پشیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اسے قانون خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی۔ لیکن اگر سزا میں اس کے

ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اُسے معافی مل جائے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر آبدی کے معنی اختیار اور قدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی) تو قطع ید کے معنی ہونگے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس قدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے۔ اس میں چوری کے علاوہ ہر قسم کی خیانت بھی آ جاتی ہے۔

اسی سورۃ مائدہ میں نظام مملکت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے متعلق ہے اَنْ يُّقْتَلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعْ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ اَمِنْ خِيَلَيْبٍ اَوْ يُنْفَتَوْا مِنْ اِلَاَرْضٍ (سۃ)۔ انہیں قتل کر دو۔ یا صلیب پر لٹکا دو۔ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے قطع کر دو یا انہیں جلا وطن کر دو۔ اس میں قتل کرنے، صلیب دینے، اور جلا وطن کرنے کے علاوہ ایک سزا قطع آبدی و ارجل کی بھی ہے۔ اس کے معنی الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر قید کر دینے کے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ یہی الفاظ ساحرین دربار فرہون کی سزا کے بارے میں آئے ہیں۔ بناء پر یہی قطع ید کے معنی یہ بھی لئے جاسکتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ تم نے دستخط کر کے (یا فلاں بات کر کے) اپنے ہاتھ کٹوا دئے۔ یعنی تم بے بس ہو گئے۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے۔ اور اگر قطع ید سے مراد سچ مچ ہاتھ کاٹ دینے کے ہیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اُس وقت دی جاسکتی گی جب یہ جرائم ایسے عام ہو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی اور کوئی صورت نہ رہے۔ جیسے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں (Smuggling) اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اسکی روک تھام کے لئے انتہائی اقدامات ناگزیر ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بارڈر پولیس کو اجازت ہے کہ وہ (Smuggler) کو موقع پر گولی مار کر علاقہ کر دے، حالانکہ ظاہر ہے کہ ہم حالات میں موت کی سزا، قتل عمد یا بغاوت کے جرم میں دی جاسکتی ہے، اور وہ بھی اس وقت جب پوری تحقیقات (اور مجرم کو اپنی مدافعت کا موقع دینے کے بعد) جرم ثابت ہو جائے۔ لہذا، ایسے حالات میں چوری کی سزا، قطع ید ناگزیر ہو جائیگی۔

یا مثلاً جب ملک میں نظام خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ہو تو ایسی صورت * بعض کے نزدیک ان میں ڈاکو اور رھزن بھی شامل ہیں۔

میں کسی کی چیز چرانے کی واقعہ ایک سنگین جرم ہوگا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہئے۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو قطع ہد کی سزا دینا، کل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے، جس کا نتیجہ (۱۸۸) میں مذکور ہے۔

ق ط ف

قَطَفَ*۔ کسی چیز کو (بالخصوص پھلوں کو) توڑ لینا یا کاٹ لینا۔ (ابن فارس)۔ الْقِطْفُ*۔ انگور کا خوشہ جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو۔ اسکی جمع قَطُوفٌ* ہے*۔ قرآن کریم میں قَطُوفُهَا ذَانِیۃٌ* (۱۸۹) آیا ہے۔ ان کے خوشے قریب قریب ہیں۔ الْقِطْفُ اس درانتی کو کہتے ہیں جس سے پھل کاٹتے ہیں*۔

ق ط م ر

الْقِطْمِیۡرُ*۔ کھجور کی گٹھلی میں جو شکاف ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ایک نشان ما ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا اس باریک سی جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے۔ اس لفظ کو تھوڑی سی چیز کے لئے بطور مثال بولتے ہیں**۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ مَا یَحْمِلُکُمْ مِّنَ الْقِطْمِیۡرِ*۔ (۱۹۰)۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اتنا بھی نہیں جتنی اُرد پر سفیدی۔

ق ع د

الْقَعَوْدُ*۔ بیٹھنا۔ نیز یہ الْقَاعِیۡدُ کی جمع ہے۔ یعنی بیٹھنے والے۔ الْقَعَوْدُ*۔ بیٹھنا نیز بیٹھنے کی جگہ۔ اسکی جمع مَقَاعِیۡدُ* ہے۔ قَعَوْدٌ* اور جُلُوسٌ* ہم معنی الفاظ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کھڑے سے بیٹھ جانے کو قَعَوْدٌ* کہتے ہیں اور لیٹنے سے بیٹھنے، یا سجدہ سے الٹ کر بیٹھنے کو جُلُوسٌ* کہتے ہیں۔ بعض علماء لغت نے کہا ہے کہ قَعَوْدٌ* اسے بیٹھنے کو کہتے ہیں جس میں دیر اور ٹھہراؤ پایا جائے۔ اسی لئے گھر کی بنیادوں کو قَعَوْدُ الْعِمَارِۃِ کہتے ہیں، جو الْبَیۡتِ نہیں کہتے۔ الْقَاعِیۡدَةُ*۔ وہ جڑ جس پر عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اسکی جمع قَوَاعِیۡدُ* ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ قَوَاعِیۡدُ الْبَیۡتِ ان ستونوں کو کہتے ہیں جن پر عمارت استوار کی جاتی ہے***۔ قرآن کریم میں (۱۹۲) میں، الْقَوَاعِیۡدُ مِّنَ الْبَیۡتِ ہے۔

*تاج و راغب۔ **تاج۔ معجم۔ راغب۔ ***تاج۔

أُقْعِدَ الرَّجُلُ* - وہ صاحب فراش ہو گیا، اور بیماری کی وجہ سے اس میں اٹھنے بیٹھنے اور چلنے بھرنے کی طاقت ہی نہ رہی۔ قرآن کریم میں قَعَدَ، اِنْبِغَاثُ* کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶۶)۔ قَعَدَ لِلْيَحْرُبِ کے معنی ہوئے ہیں اس نے جنگ میں لڑنے والے بہادروں کو تیار کیا*۔ سورہ بروج میں ہے۔ اِذْ هُمْ عَلَىٰ نَهِبِهِمْ فَتَعَوَّدُوا* (۹۹)۔ جب وہ لوگ (جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے) بالکل تیار بیٹھے تھے۔ راغب نے کہا ہے کہہ کسی کام میں مستی کرنے والے کو قَاعِدُ* کہا جاتا ہے**۔ سورہ النساء میں الْقَاعِدُونَ، الْمُجَاهِدُونَ کے مقابلہ میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۹۵)۔ اَلْقَعِيدُ*۔ وہ شخص جو تمہارے ساتھ بیٹھتا ہو۔ محافظ۔ نگران*۔ (۱۶۷) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔

اَلْقَاعِدُ* (مِنْ اَلنِّسَاءِ) اُس معمر عورت کو کہتے ہیں جو اولاد، حیض، اور شوہر سے مایوس ہو چکی ہو۔ اسکی جمع القَوَاعِدُ* (مِنْ اَلنِّسَاءِ) ہے (۲۴۰)۔ مَقَاعِدُ*۔ مرکزی مقامات (۱۳۰)۔ سورہ قمر میں ہے رَفِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ۔ (۵۵)۔ ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں۔ (دیکھئے عنوان ص۔ د۔ ق)۔ لیکن یہ مقام (جنت) محض بیٹھنے کی جگہ، یعنی تھوڑی دیر تک مستانے کا مقام ہے۔ آخری منزل نہیں۔ سورہ جن میں کاهنوں اور نجومیوں کی رصد گاہوں کے لئے مَقَاعِدُ اَللَّسْمِیْعِ (۹۴) آیا ہے۔

ق ع ر

اَلْقَعْرُ*۔ کسی چیز کی انتہائی گہرائی۔ قَعْرُ الثَّيْتْرِ*۔ کنوئیں کی تہ۔ قَعْرُ النَّخْلَةِ*۔ اس نے کھجور کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ فَاَنْقَعَرَتْ*۔ پس وہ جڑ سے اکھڑ گئی***۔

قوم عاد پر جو آندہ ہی کا سخت طوفان آیا تھا اس کے متعلق ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح اپنے مقام سے اکھاڑتا چلا جاتا تھا، کَانَتْهُمْ اَعْنَاجُ نَخْلٍ مَّنْقَعِرٍ (۵۲)۔ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اس طرح اکھڑتے چلے جاتے تھے گویا وہ ایسی کھجوروں کے تنے تھے جو پہلے ہی جڑوں سے اکھڑی ہوئی پڑی تھیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اس طرح اکھڑ رہے تھے جس طرح ایسی کھجوریں اکھڑیں جن کی جڑیں بڑی گہرائی تک زمین میں گھسی ہوئی ہوں۔ یعنی وہ قوم اپنے

*ناج۔ **راغب۔ ***ناج و راغب۔

آپ کو بڑی مستحکم سمجھتی تھی۔ وہ خیال کئے بیٹھی تھی کہ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اس لئے اسے کون اکھیڑ سکتا ہے۔ لیکن اسے اپنی ہی آندھی کے طوفان نے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ سورہ حاقہ میں اَعْبَازُ نَخْلٍ خَاوِیَّةٍ (۱۶) کہا گیا ہے۔ یعنی کھوکھلی کھجوروں کے تنے۔

ق ف ل

قَتْلٌ - يَقْتُلُ و يَقْتُولُ - قَتُّوْا - کسی کا سفر سے واپس آ جانا۔
بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قَتُّوْا جہاد اور جنگ سے فوج کے واپس
آنے کو کہتے ہیں۔ اَفْتَلَّ النَجِيشُ - لشکر واپس آ گیا۔ اَلْقَاتِلَةُ -
وہ رفقائے سفر جو سفر سے واپس آرہے ہوں (ابن فارس)۔ لیکن سفر پر جانے
والوں کو بھی کہتے ہیں، اس فالِ نیک کے اعتبار سے کہ - یہ سلامت روی
و باز آئی۔ یعنی ان کی خیریت سے واپسی کی آرزو کے لحاظ سے انہیں جانے وقت
بھی اَلْقَاتِلَةُ ہی کہتے ہیں *۔ قَتْلُ الطِّغَامِ - اس نے کھانے کی
چیزوں کا ذخیرہ کر لیا۔ قَتْلُ الشَّقِيئِ - اس نے چیز کا اندازہ اور تخمینہ
لگایا۔ اَفْتَلَ الْجَبَابَ - اس نے دروازہ کو بند کر لیا۔ اَلْقَتْلُ - تسلا جس
سے دروازہ بند کیا جاتا ہے *۔ قرآن کریم میں ہے - اَمْ عَلٰی قَتْلُوْبٍ
اَفْتَاثِمَا (۳۴)۔ کیا ان کے دلوں پر ان کے تسالے پڑے ہوئے ہیں جو وہ
قرآن کریم میں غور و خوض نہیں کرتے۔ اِسْتَخْفَلَ الرَّجُلُ - آدمی نے
بغل کیا۔

ق ف و

الثَّقَفَا - الثَّقَائِيَّةُ - گندئی - گردن کا پچھلا حصہ - الثَّقِفُوۃُ - دم - اسی سے اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں - قَفَوْتُہُ - قَفُوۃً - میں اس کے پیچھے چلا - قَفَّيْتُہُ زَيْدًا - ویزید نے اس کے پیچھے پیچھے زید کو بھیجا - هُوَفَيْتُہُمْ - وہ ان کا جانشین و ہمسامندہ ہے - ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے پیچھے پیچھے چلنے کے لکھے ہیں - الثَّقِيۃُ برتری کو بھی کہتے ہیں -

سورۃ حدید میں ہے **ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا (۲۷/۴۶)۔**
 پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے۔ (نیز ۲۷/۸)۔

*** تاج و راغب -**

سورة بنی اسرائیل میں ہے۔ وَلَا تَقْنُفُ مَالِیْسَ لَكَ بِہِ عِلْمٌ * اِنْ السَّمْعُ وَ الْبَصَرُ وَ الْفُؤَادُ كُلُّ اُولَئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْنُونًا (۱۶)۔ ”اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ (یاد رکھو) سماعت، بصارت اور قلب سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا“۔ قرآن کریم نے اس آیت میں عظیم حقائق بیان کئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ محض قیاس و گمان کی بنا پر، تقلیداً اور رسماً کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہئے۔ اس کے متعلق خود تحقیق کرنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے عِلْم کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اس میں سماعت و بصارت و قلب کی شہادت موجود ہونی چاہئے۔ سماعت و بصارت میں علم بذریعہ حواس (Per-ceptual Knowledge) آجاتا ہے، اور قلب (Mind) میں (Conceptual Knowledge) نیز یہ بھی کہ حواس کے ذریعے جو معلومات تم تک پہنچیں، ان سے نتیجہ مستنبط کرنے میں اپنے جذبات کو دخل مت دینے دو (اس لئے کہ فؤاد میں جذبات کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے)۔ ہر معاملہ کے متعلق پوری پوری خارجی معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر جذبات سے الگ ہو کر، اس سے نتیجہ نکالو۔

راغب نے بھی اس آیت کی شرح میں لکھا ہے کہ محض قیافہ اور گمان کی بنا پر کسی بات کا فیصلہ نہ کرو۔ وہ لکھتا ہے کہ قِیَافَةٌ دراصل اِقْتِیَافٌ کا مقلوب ہے۔

ق ل ب

قَلْب کے بنیادی معنی ہیں الٹنا پلٹنا۔ لوٹ پوٹ کرنا۔ کسی چیز کو ادا لتے بدلتے رہنا۔ چنانچہ قَلْبَ الشَّیْءِ یَقْلِبُہ کے معنی ہیں کسی شے کو الٹ پلٹ کر دینا۔ یعنی اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا۔ قَلْب کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ۔ تَقَلَّب کے معنی ہیں الٹ پلٹ ہونا، جیسے تیز گرم ریت پر سانپ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ قَلْبَ الْخُبْرِ۔ اس وقت کہتے ہیں جب روٹی اوپر سے پک جائے اور اندر سے پکانے کے لئے اسے الٹ پلٹ کیا جائے۔ مِقْلَب اس لوہے کو کہتے ہیں جس سے کسان کھیتی کرنے کے لئے زمین کی مٹی کو الٹ پلٹ کرتا ہے*۔

چونکہ انسان کا دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی قَلْب کہتے ہیں۔ اور (چونکہ عقل و بصیرت

کا کام یہ ہے کہ وہ اشیاء اور اس کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لئے (عقل کو بھی قَلْب کہا دیتے ہیں*۔

ابن ہشام نے قَلْب کے معانی میں سے چار بیان کئے ہیں (۱) دل (۲) عقل (۳) ہر چیز کا خلاصہ اور (۴) ہر چیز کا بہترین حصہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ میں دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا خالص اور گراں قدر حصہ (۲) کسی چیز کو ایک رخ سے دوسرے رخ پر پھیرنا۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں۔ هَذَا عَرَبِيٌّ قَلْبٌ۔ یہ شخص خالص عرب ہے۔ کھجور کے درخت میں ایک سفید سا مغز (گاہا) ہوتا ہے جو اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ اسے قَلْبُ الشَّجَرَةِ کہتے ہیں*۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ہر خالص شے کو قَلْب کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں قَلْب اور قُلُوب دو لفظ آئے ہیں (قُلُوبٌ - قُلُوبٌ - قُلُوبٌ سے جس کے معنی بھوننے کے ہیں، یعنی تپش و خلش - سوز و گداز - درد و داغ) ان دونوں لفظوں میں ایک موٹا سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ قَلْب فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے اور قُلُوب جذباتِ سوز و گداز کا منبع۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۱۶۹)۔ قلب تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ سورۃ کہف میں ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ (۱۸۵) یعنی ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح سورۃ حج میں بتایا گیا ہے کہ قَلْب سے عقل و فکر کا کام لیا جاتا ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا (۲۲)۔ سورۃ النحل میں ہے قُلُوبُهُمْ مُّزَكَّرَةٌ (۲۴)۔ فریب کار یا بے ہاک عقلیں۔ (دیکھئے عنوان ن - ک - ر) نیز قلب کے سرچشمہ عقل و فکر ہونے کے لئے (س - م - ع) اور (ب - ص - ر) کے عنوانات بھی دیکھئے۔

سورۃ بقرہ میں منافقین کے ضمن میں ہے فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ (۲)۔ اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور ذہنی کیفیت کی طرف بھی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے ان کے متعلق کہا ہے وَمَا يَتَّخِذُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۱)۔ ”وہ اپنے آپ کے سوا اور کسی کو

دھوکا نہیں دیتے لیکن اسے سمجھتے نہیں۔“ اس میں دونوں (نفسیاتی اور ذہنی) کیفیات کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے قَلْبٌ کا لفظ عقل اور جذبات دونوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان کا لفظ (Mind) قَلْبٌ اور قُؤَادٌ دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی قَلْبٌ اور قُؤَادٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے (نیز دیکھئے عنوان ف۔ ا۔ د)۔

تَقَلَّبٌ۔ جد و جہد کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (۱۱۶: ۲)۔
سورة شعراء میں ہے الَّذِي يَسْرُكُ حَيْثُ تَقُومُ وَتَقَلَّبُكَ فِي السَّاجِدِ (۱۱۹: ۲۱۸)۔ ”تو جب ان لوگوں میں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، کھڑا ہوتا ہے یا مصروفِ تگ و ناز ہوتا ہے، تو خدا تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ سورة بقرہ میں ہے قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (۲۳۳: ۲)۔ جب تو بار بار بے تابانہ اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتا تھا تو ہم تیرے اضطراب کو دیکھ رہے تھے۔“ لہذا تَقَلُّبٌ میں جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی جد و جہد آجائیگی۔ مُتَقَلِّبٌ کے معنی ہیں لوٹنے کی جگہ (۱۱۹: ۲)۔ مُتَقَلِّبٌ۔ ہلٹا کھانے والا۔ سورة توبہ میں ہے وَتَقَلَّبُوا فِي الْأُمُورِ (۲۸: ۲)۔ یہ لوگ تیرے لئے الٹ پھیر کی تدبیریں کرتے رہے۔ یہ لوگ سوچ بچار کرتے رہے کہ کس طرح تیرے معاملات میں بگاڑ پیدا کیا جاسکتا ہے (انہیں الٹایا جاسکتا ہے)۔ سورة کہف میں ہے يَتَقَلَّبُ كَتَفَيْهِ (۱۸: ۱)۔ وہ اپنے ہاتھ ملتارہ گیا۔ سورة محمد میں مُتَقَلِّبُكُمْ (۱۹: ۲) آیا ہے۔ یعنی معاملات میں سرگرداں رہنے کی جگہ یا وقت۔

قل د

قَلَدَ الْحَبْلُ۔ رستی کو پٹ دیا۔ اَلْأَقْلِيدُ۔ اونٹنی کی ناک کی تنہی جس میں نکیل کی رسی ڈالی جاتی ہے۔ اَلْمِقْلَادُ (جمع مَقْلَائِدُ)۔ کنجی۔ نیز خزانہ*۔ قرآن کریم میں ہے کہ۔ مَقْلَائِدُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ (۹۳: ۱)۔ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کے خزانے سب خدا کے لئے ہیں۔ اَلْقِلَادَةُ۔ ہار جو گردن میں ڈالا جائے (اس کی جمع اَلْقِلَائِدُ آتی ہے)*۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا الْهُدَى وَلَا الْقِلَائِدُ (۵: ۲)۔ راغب نے لکھا ہے کہ قِلَادَةُ کے معنی بٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہیں جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کر لے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے لے۔

اس سے تقلید^۱ کے معنی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ یعنی نکیل کی نتھنی جسے ناک میں، یا پٹا جسے اپنے گلے میں، ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے، اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے۔ چنانچہ اسی نہج سے کہتے ہیں تقلید^۲ الثولاق^۳ الاعمال^۴۔ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا *۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ التقلید^۵۔ یہود اور نصاری کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مسدود نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح متواتر چلا آ رہا ہے **۔

قرآن کریم اس لئے آیا تھا کہ نوع انسانی کے گلے سے وہ تمام زنجیریں اتار دے جو اس نے اشخاص پرستی کی رو سے پہن رکھی تھیں اور جن میں وہ غلاموں کی طرح جکڑے چلی آرہی تھی (۱۵۶)۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے ذریعے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن مسلمانوں نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مڑگانہ عقیدت سے اکٹھا کیا، اور پہلے سے بھی زیادہ کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں جس سے انسانیت کا جوہر حریت فکر و عمل جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ قرآن کریم، قانون خداوندی کی اطاعت اور ساری کائنات پر حکومت کا سبق دیتا ہے، نہ کہ انسانوں کی غلامی کا سبق۔ تقلید، غلامی کی بدترین شکل ہے۔ امت لئے کہ غلامی میں انسان کا صرف جسم مقید ہوتا ہے، لیکن تقلید میں اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم، قدم قدم پر تدبیر و تفکر کا حکم دیتا ہے اور اسلاف کی اندھی تقلید کو منکرین کا شیوہ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی رسول نے خدا کی طرف دعوت دی تو یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی گئی کہ تمہاری یہ دعوت اُس مسالک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثۃً آبا و اجداد سے آ رہا ہے۔ حضرت نوحؑ کو یہی جواب ملا (۲۳)۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا (۱۱۳)۔ یہی حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا (۲۵)۔ یہی حضرت شعیبؑ سے (۸۷)۔ اور حضرت موسیٰؑ سے (۱۸)۔ یہی رسول اللہؐ سے کہا گیا (۳۸)۔ غرضیکہ ہر رسول کی مخالفت یہی کہہ کر کی گئی (۲۳، ۲۴)۔ قرآن کریم کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل اور برہان نہیں لائی گئی۔ محض یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا گیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسالک کے خلاف ہے (۱۵۰، ۱۵۱)۔ قرآن کریم کہتا ہے

کہ یہ روش ، انسانی سطح زندگی کی نہیں ، حیوانی سطح کی ہے ۔ لہذا جہنم کی زندگی (۶۶) - اس میں انسان کی آنکھیں پیچھے کی طرف رہتی ہیں (۳۳) - وہ سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتا (۸۶) - یعنی اس مسلک کی ”روئے اُس قوم کو اپنا ماضی تو درخشندہ نظر آتا ہے لیکن مستقبل تاریک ۔ غور کیجئے کہ کیا آج ہماری بھی بعینہ یہی حالت نہیں ! کیا قرآن کریم کی دعوت کی ہر جگہ یہی کہہ کر مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ آواز اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثۃً چلا آ رہا ہے ؟ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہئے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ان سے ورثہ میں ملا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لینا چاہئے ۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھنا چاہئے ۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط ۔ یہ دلیل کہ اُن بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا قرآن کو سمجھ کر ہی کہا تھا ، بڑی کمزور ، بلکہ باطل ہے ۔ قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا تھا ، اور ہر نسل کو اس پر غور و تدبر کا حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات کو خود قرآن کریم کے آئینے میں دیکھے ۔ یاد رکھئے ، ہم قرآن کریم پر ایمان لانے کے مکلف ہیں ، اس لئے ہمارے لئے حق و باطل کی سند صرف خدا کی کتاب ہے ۔ اسلاف کا احترام بجا اور درست ۔ لیکن وہ ہمارے لئے سند نہیں قرار پا سکتے ۔

ق ل ع

قَلْعٌ قَلْعٌ اقْتُلْعْ - کسی چیز کو اس کی بنیاد سے اکھیڑ دینا اور اسے اسکی جگہ سے ہٹا دینا ۔ اَلْمَقْلُوعُ - معزول شدہ امیر ۔ اَلْقَلْعُ - وہ محفوظ جگہ جہاں چرواہا اپنا سامان رکھتا ہے ۔ اَلْقَلْعَةُ - کھجور کا وہ پودا جسے کھجور کے درخت کی جڑ سے اکھیڑ لیا جائے ۔ اَلْقَلْعُ - عَنِ الْاَمْرِ - کسی کام سے رک جانا * - قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ذکر کے بعد ہے ۔ يَسْمَعُ اَقْلِيْعِي (۱۶۸) - بارش سے کہا گیا کہ تو رک جا ۔ تھم جا ۔

ق ل ل

اَلْقَتْلُ - تھوڑا ۔ قَلِيلٌ - اَلْقِيَاةُ - کثرت کی ضد ہے ۔ کمی ۔ قَتْلٌ - يَقْتُلُ - کم ہونا ۔ قَلِيلٌ - کم ۔ اَفْتَدَتْهُ قَتْلَانَهُ - اسکو کم کر دیا ۔ اَلْقَتْلُ - بہت کم ** ۔

* تاج و محیط ۔ ** تاج ۔

اَلْقَتْلَةُ - سر یا کوہان یا پہاڑ کا بالائی حصہ - جماعت * - اَلْقَتْلَةُ -
 غصہ یا طمع کی وجہ سے جو کچھ کسی سی آتی ہے * - اَسْتَقْتَلُ الرَّجُلُ - وہ
 آدمی فرط غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا - اَسْتَقْتَلَهُ - اسکو اٹھا لیا ، بلند
 کر دیا - اَسْتَقْتَلَتِ السَّيْمَاءُ - آسمان بلند ہو گیا - اَلْاِسْتِقْلَالُ - بلند
 ہو جانا - اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا - کسی چیز کو اپنے لئے خاص کر لینا -
 هُوَلَا يَسْتَقِيلُ بِيَهْلًا - اسے اسکی قدرت حاصل نہیں - وہ اسے اٹھا نہیں
 سکتا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کا کم ہونا ،
 اور (۲) ایک جگہ نہ ٹھہرنا لکھے ہیں -

قتل - تھوڑا ہونا - مَتَاعٌ قَتِيلٌ (۳۶) - قَتِيلٌ - تھوڑا کرنا - کم
 کرنا (۸) - اَقْتَلَ - اٹھا لینا * (۹) - یعنی اسے ہلکا سا سمجھ کر اٹھا لینا -

ق ل م

قَتَلْتُمْ - کسی چیز کو چھیل کر اور درست کر کے ہموار کر دینا -
 (ابن فارس) - اَلْقَتَلْتُمْ - قلم جس سے لکھا جاتا ہے - قینچی - بے پھل اور
 بے ہر کا تیر - تیروں میں وہ بھی شامل ہیں جن سے جوا کھیلا جاتا تھا -
 (اسکی جمع اَقْلَامٌ ہے) * - سورہ آل عمران میں ہے کہ ہیکل کے ہجاری
 حضرت مریمؑ کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کرتے تھے - يُمْلِئُوْنَ
 اَفْئِلًا مِّمَّكُمْ (۳۳) - اس میں اَفْئِلَامٌ کے یہی معنی ہیں - دوسرے مقامات
 پر قَتَلْتُمْ سے مراد وہ قلم ہے جس سے لکھا جاتا ہے - مَثَلَانِ وَالْقَتْلَامِ
 وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸) يَا الَّذِي عَتَقْتُمْ بِاَلْقَتَلَمِ (۹۶) - صاحب محیط نے
 لکھا ہے کہ قَتَلْتُمْ - کہو قلم صرف اس وقت کہتے ہیں جب اسے تراش کر
 لکھنے کے قابل بنا لیا جائے ، ورنہ اس سے پہلے کلک کو يَرَاعَةُ یا قَصَبَةُ
 کہتے ہیں ** - یہ الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ اُس زمانہ میں عربوں میں
 لکھنے کا رواج تھا - خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ
 عام لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو - (۲۸۴)

سورہ العلق کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ الَّذِي
 عَتَقْتُمْ بِاَلْقَتَلَمِ (۹۶) ”اللہ وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو سکھایا“ -
 اس میں ایک تو تحریری علم کی اہمیت واضح ہے - دوسرے یہ کہ خدا ،
 انسان کو براہ راست قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا - اس لئے اس آیت (اور اس

قسم کی دیگر آیات) سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اس طرح علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ اس نقطہ کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جائیں گے۔

ق ل ی

الْقَلْبِی - شدت بغض کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے اس کے معنی کسی چیز سے دور ہٹنا اور اس کے پاس سے چلا جانا لکھے ہیں۔ قَلْبِی یَقْلِبُ - کسی سے بغض رکھنا اور انتہائی ناہمسندیدگی ظاہر کرنا اور اسے جھوڑ دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ قَلْبِی یَقْلِبُ جھوڑ دینے کے معنوں میں آتا ہے اور قَلْبِیہ یَقْلِبُ - بغض رکھنے کے معنوں میں۔ اصل میں قَلْبِی کے معنی ہوتے ہیں گوشت وغیرہ کو بھوننا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے اور تیز ہونے کے ہیں۔ قَلْبُہ اس نے اسے کڑھائی میں بھونا یا تلا۔ الْقَلْبِی - کڑھائیاں بنانے والا۔ الْقَلْبِی - الْقَلْبِی - ہٹل یا مٹی کی بنی ہوئی کڑھائی جسمیں گوشت وغیرہ تلا جائے۔ *

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلْبِی (۹۳) - تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ تجھ سے ناراض ہے۔ سورہ شعراء میں حضرت لوطؑ کا یہ قول مذکور ہے کہ اِنِّی لِعَمَلِیْکُمْ مِّنَ الْقَالِیْنِ (۲۶۸) - میں تمہارے ان کدورتوں سے سخت بیزار ہوں۔ میں تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔

ق م ح

قَمَحَ الْجَعْرِ قَمَحًا - اونٹ نے حوض ہر سر اونچا کر لیا اور پانی پینے سے باز رہا۔ قَمَحَتْ اِبِلُکَ - تمہارے اونٹوں نے حوض ہر آنے کے باوجود پانی نہیں پیا اور وہ سر اٹھائے کھڑے رہے۔ اَقَمَحَ الرَّجُلُ - آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اَقَمَحَ الْغُلَّ الْاَسِیْرَ - بیڑیوں نے تنگ ہونے کی وجہ سے قیدی کے سر کو اٹھا ہوا رہنے دیا۔ * اس زمانہ میں بیڑیوں کے ساتھ گردن میں طوق ڈالے جاتے تھے جو اگر سخت یا تنگ ہوتے تو سر اونچے کا اونچا اٹھا رہ جاتا۔ قرآن کریم میں انہی کے متعلق ہے۔ فَهَمُّ مُقْمَحُونَ (۳۶) - ان کے سر کھنچے ہوئے اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔

دراصل قَمَحٌ گہہوں کو کہتے ہیں اور جو ستو اس گہہوں سے بنایا جاتا ہے اسے قَمَحِ حَہ کہتے ہیں۔ ستو پھانکنے کے لئے سر کو اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ اسے الْقَمَحُ کہتے ہیں۔ اس کے بعد محض سر اٹھانے کو (خداہ کسی وجہ سے ہو) قَمَحُ کہنے لگے۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ (گہہوں کے معنوں میں) خلاف قیاس استعمال ہوتا ہے۔

ق م ر

الْقَمَرُ۔ ہر مہینے کی تیسری رات سے پچیس کی رات تک کا چاند۔ پہلی دوسری اور چھبیس سنائیس تاریخ کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔ **۔ تَقَمَّرَ الْقَمَرُ آء۔ عورت سے شادی کر لی اور اسے لے گیا۔ نیز چاند رات میں شب زفاف بسر کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ **۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے یہ معنی قَمَرٌ سے ماخوذ ہیں جس کے معنی غالب آجانے کے ہیں۔ لہذا چاند کو قَمَرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی روشنی دوسرے ستاروں پر غالب آجاتی ہے۔ ***۔ قَمَرٌ فَلَانٌ۔ میں نے فلاں آدمی کو دھوکا دے دیا۔ ***۔ (چاند کے ساتھ جنون کا تعلق قدیمی تصور ہے۔ انگریزی زبان میں Lunatic کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے)۔ اسی سے الْقِمَارُ جوئے کو کہتے ہیں۔ الْقَمِيْرُ۔ مُقَامِرٌ۔ جوا کھیلنے والا۔ ****۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایام جاہلیت میں عربوں کا قومی نشان قَمَرٌ تھا۔ جیسے ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ تھا۔ اس اعتبار سے جہاں قرآن کریم نے کہا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَالْاِنْسَانُ الْقَمَرَ (۵۴)۔ تو اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مومنین اور قریش میں آخری تصادم کا وقت قریب آ رہا ہے۔ (دیکھئے عنوان م۔ و۔ ع)۔ اس وقت عرب جاہلیت کا تمام اقتدار ختم ہو جائے گا اور اسلام کا پرچم بلند ہو جائے گا۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ق۔ ق)۔ وَجَمِيعَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ (۹۵) میں عربوں اور ایرانیوں کے اکٹھے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد ہوا۔

لیکن اگر ان آیات میں شَمْسٌ اور قَمَرٌ کے حقیقی معنی سورج اور چاند کے لئے جائیں تو ان میں طبعی کائنات کے بعض ہونے والے تغیرات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اس وقت متعین طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ق م ص

قَمَمَصَ الْفَرَسُ يَتَمَمَصُ وَيَقْمِصُ قَمَمَصًا وَ قِمَمَصًا - گھوڑے کا اپنے دونوں ہاتھوں کو یکبارگی اٹھانا اور پھر ان کو ایک ساتھ زمین پر پٹک دینا۔ الْقِمَمَصُ - اچھلنا - کودنا - نیز قلق و اضطراب کو بھی کہتے ہیں۔ الْقَمَمُوصُ - وہ جانور جو اپنے سوار کو لے کر کودنے لگے۔ الْقَمَمِیصُ - بہت اچھلنے کودنے والا خچر*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں۔ ایک تو کسی چیز کو پہننا اور اس میں لیٹ جانا۔ اور دوسرے کسی چیز کا اچھلنا اور ہلنا۔ قَمَمَصَ الْبَحْرُ بِالسَّيْفِیْنَتَہِ - دریا نے موج کے ذریعے کشتی کو اچھالا**۔

الْقَمَمِیصُ کرتے کو کہتے ہیں جو پہننا جاتا ہے۔ عربی میں یہ لفظ مذکر استعمال ہوتا ہے اگرچہ کبھی کبھی مؤنث بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس کی جمع قَمَمِصٌ - اقْمِصَتَہُ اور قَمَمِصَانٌ آتی ہے۔ ابن الجری نے کہا ہے کہ الْقَمَمِیصُ اس سلعے سے کہتے ہیں جس میں دو آستینیں ہوتی ہیں اور نیچے سے کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ کپڑا روئی یا کتان کا ہونا چاہئے۔ اگر یہ کپڑا اون کا ہو تو پھر اسے قَمَمِیصٌ نہیں کہتے۔ لیکن ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کپڑا زیادہ تراون کا نہیں ہوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اون کا ہو ہی نہیں سکتا۔ الْقَمَمِیصُ - غلاف قلب کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں ہے۔ اِذْ هَبُوا بَقَمَمِیصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰی وَجْہِ اَبِیْ یٰسَاقِ بَصِیْرًا (۱۲۱)۔ (حضرت یوسفؑ نے کہا) میرے اس کردار کو کدولے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے رکھ دو۔ اس پر ساری بات کھل جائے گی۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) ان لوگوں کا لباس امتیازی نشان رکھتا تھا جو بلند مناصب پر فائز ہوں۔ حضرت یوسفؑ کی قمیص ان کے جاہ و مرتبت کا نشان تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی قمیص کو باپ کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اس سے ان کے مقام بلند کا اندازہ کر کے سمجھ لیں کہ ان کا بیٹا (یوسفؑ) کہاں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے اس سے پہلے (۱۲۰) میں) کہا گیا ہے وَ اَبِیْضَتْ عَیْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ یوسفؑ کے غم سے یعقوبؑ کی بینائی کم ہو گئی، غم و حزن کا یہ نتیجہ ہو جایا کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے سامنے حضرت یوسفؑ کی قمیص آئی تو فرط مسرت سے ایسا نفسیاتی اثر ہوا کہ ان کے اعصاب میں

تقویت آگئی اور کمزور بینائی پھر سے اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ فوری خوشخبری سے ایسی کیفیت عام طور پر پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

داستان حضرت یوسفؑ میں پہلے آپ کی قمیص کا ذکر اس وقت آتا ہے جب آپ کے بھائی اسے ”جھوٹے خون“ میں لت پت کر کے باپ کے پاس لے آئے تھے (۱۸)۔ دوسری دفعہ آپ کی قمیص آپ کی ہا کد امنی کی شہادت بنکر سامنے آتی ہے (۲۱-۲۲)۔ اور اب تیسری مرتبہ انکی زندگی اور جاہ و منصب کی خوشخبری بن کر۔ قَمِيصًا قَتَمَ قَتَمًا۔ اس نے اسے کرتہ پہنایا اور اس نے وہ کرتہ پہن لیا۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اگر کرتہ کا گریبان سینہ پر ہو تو اسے دِرْع کہتے ہیں اور اگر گریبان مونڈھے پر ہو تو اسے قَمِيص کہتے ہیں*۔ اَلْقَمَاصُ۔ اونٹ کی ایک بیماری کہو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکتا بلکہ بے چین و بے قرار رہتا ہے**۔

ق م ط ر

اَلْقَمَطَرُ۔ اس لکڑی کی بیڑی کو کہتے ہیں جو مجرموں کے ہاؤں میں ڈال دی جاتی تھی تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں***۔ اس سے انہیں چلنے پھرنے میں سخت اذیت پہنچتی تھی۔ پھر اس سے یہ لفظ تکلیف، پریشانی، سختی اور اذیت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ سختی کی وجہ سے آنکھوں اور ابرؤں پر جو شکنیں پڑ جاتی ہیں، انہیں بھی قَمَطَرِ بَر کہتے ہیں۔ اَلْقَمَطَرُ الْيَوْمُ۔ دن سخت ہو گیا، شَرٌّ مَقْمَطِرٌ کے معنی ہیں، شدید شر***۔ قرآن کریم میں ظہور نتائج کے دن کو يَوْمًا عَبَسًا قَمَطَرِ بَرًا (۹۱) کہا گیا ہے۔ بڑی سختی اور پریشانی کا زمانہ۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی بنیادی معنی دئے ہیں۔

ق م ع

اَلْمَقْمَعَةُ۔ لوہے کا گرز۔ یا آنکس جس سے ہاتھی کو مارا جاتا ہے۔ اس کی جمع مَقَامِيعُ آتی ہے***۔ قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ وَ لَهُمْ مَقَامِيعٌ مِّنْ حَدِيدٍ (۲۴)۔ ان کے لئے لوہے (حدید) کے گرز ہونگے۔ یہ وہی حدید (فولاد) ہے جسے اللہ نے نظام عدل قائم رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ (۲۵)۔ یعنی قانون اور اس کے ساتھ تنفیذی قوت۔ مَقْمَعٌ قَمْعًا۔ وہ اس پر غالب آگیا اور اس نے اسے ذلیل کر دیا۔ قَمَعَ فُلَانًا۔ اس نے فلان آدمی کو اس کے ارادہ سے روک دیا۔ اَلْمَقْمُوعُ۔ ذلیل۔ مردود مقہور***۔ لِهَذَا مَقَامِيعُ (۲۶) اس فوت کا نام ہے جس سے کسی سرکش کو

* محیط۔ ** راغب۔ *** تاج و محیط و راغب۔

اس کی سرکشی سے روک دیا جائے۔ مستبد اور ظالم کو مغلوب کر کے اسے برے بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کسی کو ذلیل اور مغلوب کرنا اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔

ق م ل

الْقَمَلُ جوں۔ الْقَمَلُ (قَمَلٌ)۔ چھوٹی چھوٹی چوٹیاں۔ چبچڑی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ایک کیڑا ہے جو فصل میں لگ جاتا ہے اور اسے بالکل خراب کر دیتا ہے*۔ کشاف میں اس کے معنی پستو اور گھٹن بھی دئے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ چھوٹی مکھیاں ہوتی ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ سے چند الفاظ آتے ہیں جو حقارت اور ذلت پر دلالت کرتے ہیں۔

ق ن ت

قَنَتَ کے معنی ہیں کھڑا ہونا اور بات کرنے سے رک جانا۔ چنانچہ زجاج نے کہا ہے کہ قَنَائِمٌ بیتا سر اللہ کو قَنَائِتٌ کہتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا۔ احکام خداوندی کو لیکر کھڑا ہو جانے والا*۔ اور سِقَاءٌ قَنِيئٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو*۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو الْقَنُوتُ کہتے ہیں*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ الْقَنُوتُ سے مراد ہوتا ہے کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا***۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے مَلٌ لَہُ قَنَائِتُونَ (۱۶۶)۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتی اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرتی ہے۔ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ تمام کی تمام نظام کائنات کو قائم رکھنے کے لئے کھڑی ہیں۔ یہی خصوصیت مومن مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہے۔ الْقَنَائِتِينَ وَالْقَنَائِتَاتِ (۳۳)۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ كَانَ أُمِّيًّا قَنَائِتِ اللَّهِ (۱۶۷)۔ وہ ایک فرد نہیں تھا بلکہ اس کی ذات میں پوری کی پوری امت سمویٰ ہوئی تھی۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

ایسی امت جو دعوت خداوندی کو لیکر کھڑی ہو اور اپنی تمام قوتوں کو اسی مصرف میں لانے کے لئے روکے ہوئے ہو۔ کامل اطاعت گذار اور فرمان پذیر امت۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی اطاعت کے دئے ہیں۔
اس مضمون کے لئے دیکھئے تتمہ میں مادہ "ام"

ق ن ط

الْقَنْطُ - روکنا۔ قَنْطَ مَاءً عَتَقًا - اس نے ہم سے پانی روک لیا۔
اسی سے الْقَنْطُوطُ - معنی ہیں بھلائی سے ناامید ہو جانا۔ قَنْطَ يَقْنُطُ -
(نیز قَنْطَ يَقْنِيطُ - اور قَنْطَ يَقْنُطُ) سخت مایوس ہو جانا۔ قَانِيطُ -
مایوس ہو جانے والا * - (۵۶-۵۷)۔

سورۃ "حم" سجدہ میں بِقُرْسٍ قَنْطُوطٌ (۳۹) اکھٹا آیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفْتُمْ عَلٰی اَنْفُسِہِمُ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ - اِنَّ اللّٰہَ بِغَفِیْرِ الذَّنُوْبِ جَمِیْعًا - اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الْرَحِیْمُ (۳۹) - (اے رسول) میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہہ دو کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ (کا یہ قانون کہ حسنات، سیئات کو بھالے جاتی ہیں) تمہاری تمام لغزشوں کے تخریبی اثرات سے تمہاری حفاظت کریگا۔ یقیناً وہ حفاظت اور رحمت کا مالک ہے۔ مسلمانوں نے اس آیت کو گناہوں کے لئے لائسنس سمجھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کرو اور خوب گناہ کرو۔ خدا کی رحمت ان سب کو معاف کر دیگی۔ جو شخص گناہ کر کے سمجھتا ہے کہ خدا اسے معاف نہیں کریگا وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ تصور قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم اور دین کی اساس و بنیاد (یعنی قانون مکافات عمل) کے جس قدر خلاف ہے اسکی تشریح کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت (۳۹) میں عیسائیت کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اسکی رو سے ہر انسانی بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ مٹ ہی نہیں سکتا۔ اسکی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان رکھے۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جو گناہ ایک دفعہ سرزد ہو جائے، کوئی عمل اس کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے انسان کو تناسخ کے چکر میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف نے (گوسالہ ہرستی کا) جو گناہ کیا تھا اس کی

ہاداش میں انہیں کچھ دنوں کے لئے جہنم میں رہنا ہوگا۔ قرآن کریم نے پہلے تو اس غلط عقیدہ کی تردید کی کہ انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ۔ یا سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر انسان سے کبھی لغزش ہو جائے تو اس سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے باز آفرینی کے مواقع ماری عمر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جو خدا کی رحمت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے اسے کبھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر رحمت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کے دروازے کھلتے کس طرح ہیں؟ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دوسری جگہ دیدیا ہے کہ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا مِّنْ رَّحْمَتِهِ رَبِّهِ، إِلَّا الضَّالُّونَ (۱۵۶)۔ رحمت کے دروازے ان پر بند رہتے ہیں جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں۔ لہذا اسکی رحمت کا مستحق وہ ہوگا جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا۔ اس کے سوا رحمت خداوندی سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ جتنی اور صورتیں ہم نے اپنے ذہن سے تراش رکھی ہیں وہ فریب نفس کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۵) برائیوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے بھلائی کے کام کرو۔ بھلائیوں کا زندگی بخش نتیجہ، لغزشوں کے تخریبی اثر کو زائل کر دے گا۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ ح۔ م دیکھئے)۔

سورہ روم میں قَنِيطٌ۔ قَرِحٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۱)۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ يَتَّسُّ عَمُوسِي معنوں میں آتا ہے اور قَنُوطٌ خصوصى معنوں میں۔ یعنی یہ، یاس سے زیادہ خصوصیت رکھتا ہے۔

ق ن ط ر

الْقَنْطَرَةُ۔ پُل یا بلند عمارت۔ قَنْطَرَةٌ عَلَيْنَا۔ وہ ہمارے پاس طویل عرصہ تک جم کر مقیم رہا *۔ لہذا اس لفظ میں کثرت کا تصور نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے راغب نے لکھا ہے کہ الْقَنْطَرَةُ مِّنَ الثَّمَالِ۔ مال کی اس مقدار غیر متعین کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے کافی ہو **۔ (اسکی جمع الْقَنْطَارِيُّ آتی ہے)۔ اَلْقَنْطَارِيُّ الثَّقَنُطَرَةُ۔ (۳۳) وہ سال جو قنطار قنطار کر کے جمع کیا گیا ہو **۔ اس میں مسالغہ پایا جاتا ہے ***۔ یعنی بہت زیادہ۔

اس آیت (۳۱) میں باقی چیزوں کے علاوہ ، سال و دولت کو انسان کے لئے وجہ جاذبیت بتایا گیا ہے ۔ قرآن کریم ، دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا ۔ وہ ہر فرد سے کہتا ہے کہ وہ اکتساب دولت میں ہوری کوشش کرے ۔ لیکن اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنی ذات کے لئے مجبوس نہ کر لے ۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے اور باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا چھوڑ دے ۔ چنانچہ اسی آیت کے تسلسل میں (۳۲) مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ الْمُتَنَفِّیْمِینَ ہوتے ہیں ۔ یعنی اپنی دولت کو کھلا رکھنے والے ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے سونے چاندی کے ڈھیر (۳۳) کا مقصد ۔ یعنی اسے نوع انسان کی پرورش کے لئے عام رکھا جائے ۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے (۳۴) ۔ یعنی اس طرح سے (Hoard) کی ہوئی دولت ، جہنم کی آگ بن جاتی ہے ۔

ق ن ع

قِنَاعٌ * ۔ اس اوڑھنی کو کہتے ہیں جس سے ہورتیں اپنا سر ڈھانپتی ہیں * ۔ راغب نے کہا ہے کہ جس چیز سے سر ڈھانکا جائے وہ قِنَاعٌ ہے ۔ اس سے قَنَعٌ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنے فقر کو چھپانے کے لئے سر پر کچھ اوڑھ لیا * * ۔ لہذا قَنَاعٌ وہ شخص ہوگا جو اپنی احتیاج کو دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دے ۔ اور الْقِنَاعِیۃٌ اخفائے حاجت کا نام ہوگا ۔ اس کے ساتھ ہی راغب نے لکھا ہے کہ قَنَعٌ کے معنی ہیں اس نے اپنی اوڑھنی کو اٹھا دیا اور اپنا سر کھول دیا ۔ یعنی اپنی احتیاج کو لوگوں پر ظاہر کر دیا * ۔ لیکن قَنَعٌ * اسے بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنے حصے پر راضی رہے اور تھوڑی سی بخشش پر خوش ہو جائے * ۔ چنانچہ الْقَنَاعِیۃٌ اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے ساتھ رہے ، اس کا بچا کھچا کھا کر گزارہ کرے ، اور اس سے زیادہ کچھ نہ مانگے ۔ اس سے قَنَاعِیۃٌ کے معنی تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہونگے * ۔ قَنَاعٌ اس سائل کو بھی کہتے ہیں جو باصرار نہ مانگے اور جو کچھ مل جائے اس پر راضی ہو جائے * * (۳۵) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنی ضرورت کے لئے کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ہیں ۔

سر سے کپڑا اٹھانے کی جہت سے سر کو اٹھا کر چلنے کو بھی اِقْنَاعٌ کہتے ہیں ۔ چنانچہ اِقْنَعُ رَأْسَهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے سر کو اونچا کیا ۔ لیکن یہ اضداد میں سے بھی ہے ۔ یعنی اس کے معنی نیچا کرنا بھی ہیں ۔

اَفْتَنَعْتُ* اَلَا نَعَاۤءَ فِی السَّهْوِ کے معنی ہیں میں نے اپنے برتن کے منہ کو ندی کے بہاؤ کی طرف کر کے رکھ دیا (ٹیڑھا کر دیا) تاکہ اس میں پانی بھر جائے۔ اس اعتبار سے کسی کی طرف مائل ہونے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَتِيعَتِ اَلْاِبِلِ کے معنی ہیں اونٹ اپنی چیراگاہ، یا باڑے کی طرف مائل ہو گئے*۔

سورة ابراہیم میں قرآن کریم نے اس بد حواسی کا نقشہ کھینچا ہے جو جنگ میں شکست خوردہ قوم پر چھا جاتی ہے اور اس سے اس میں افرا تفری پھیل جاتی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ مَهْطِعِیْنَ مَقْنِیْعِیْ رَوْسِیْهِمْ (۱۴۰)۔ مَهْطِعِیْنَ کے معنی ہیں بد حواس بھاگے جانا (دیکھتے ہ۔ ط۔ ع)۔ مَقْنِیْعِیْ رَوْسِیْهِمْ کے معنی بعض نے کئے ہیں سر اٹھا کر بھاگے جانا۔

ق ن و

اَلْقِنِیْوَةُ*۔ اَلْقِنِیْوَةُ*۔ کمانی۔ قَنَوْتُہ*۔ میں نے اسے کمایا، حاصل کیا اور اپنے لئے جمع کیا۔ اَلْقِنِیْوَةُ اَلْمَالِ۔ مال حاصل کرنا اور جمع کرنا۔ اَلْقِنِیْوَةُ*۔ ذُنْدَا۔ قَنَآءُ اَلْحَمَائِطِ۔ دیوار کی وہ جانب جس پر سایہ آجاتا ہو۔ نِز قَنَآءُ* اُس کظیمہ (نالی) کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے**۔ اَلْقِنِیْوُ و اَلْقِنِیْوُ۔ خوشہ (کھجور کا)۔ جمع اَلْقِنِیْوَانُ و اَلْقِنِیْوَانُ*۔ قرآن کریم میں قِنِیْوَانُ دَانِیْہَ* (۱۴۱) قریب جھکے ہوئے خوشوں کے لئے آیا ہے۔

ق ن ی

اَلْقِنِیْیَہُ*۔ اَلْقِنِیْیَہُ*۔ جو کچھ آدمی کما کر حاصل کرے۔ نِز جمع کیا ہوا مال۔ قَنَیَ اَلْمَالِ یَقْنِیْ*۔ وہ مال کماتا ہے۔ اَقْنَاہُ اللہ۔ خدا نے اسے وہ چیزیں دیدیں جن کے حاصل ہو جانے کے بعد اسے سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا۔ ان سے اس کی فوری ضروریات بھی پوری ہو گئیں اور وہ انہیں جمع کر کے بھی رکھ سکا۔ اَرْضُ مَقْنَاہُ* اس زمین کو کہتے ہیں جو اترنے والے کے لئے بالکل موافق ہو جائے۔ جس میں اُسے سب کچھ مل جائے اور اس طرح وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اسی اعتبار سے اَقْنِی کے معنی راضی کرنے کے بھی آتے ہیں**۔

*تاج۔ **تاج و راعب۔

قرآن کریم میں ہے - 'وَ اِنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی (۵۳/۸) - خدا ہی غنی کرتا ہے اور وہ کچھ دیتا ہے جس سے انسان کو سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے اور اس طرح وہ راضی ہو جائے۔

ق ق ر

اَلْقَاهِرَةُ - ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں ، جیسے ہنسی اور سینہ وغیرہ ۔ اسی سے اس کے معنی بلندی کے آتے ہیں ۔ جیسے جِبَالٌ " قَوَاهِرٌ " - بلند پہاڑ - اور غلبہ کے معنی بھی - اَلْقَهْرُ " - کسی کو مغلوب کرنے کے لئے اوپر سے ہکڑ لینا - لہذا اس کے معنی تسلط - اقتدار - غلبہ - گرفت کے ہیں - قَهْرٌ " - وہ اس پر غالب آگیا - نیز اس کے معنی تابع کرنے کے بھی آتے ہیں - لَحْمٌ " مَقْهُورٌ " - وہ گوشت جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے اور اس میں سے ہنوز پانی رس رہا ہو " -

قرآن کریم میں خدا کی ایک صفت اَلْقَهَّارُ بھی آتی ہے۔ (۱۲)۔
جَبَّارُ کے معنی پہلے لکھے جا چکے ہیں (عنوان ج - ب - ر)۔ یعنی جو
ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قانون کے شکنجے میں کسکر جوڑ دے۔ اور اَلْقَهَّارُ
کے معنی ہونگے وہ جس کا قانون سب پر غالب ہو۔ جسے کوئی شکست نہ
دے سکے۔ جسے کوئی مغلوب نہ کر سکے۔ سورۃ انعام میں ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ
فَوْقَ عِبَادِهِ (۱۸)۔ وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ یہ قہارت خدا کے تو
شایان شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ و اقتدار ہے۔ لیکن جب
کوئی انسان اس قہارت کا دعویٰ کرے تو اس کا نام فرعونیت ہوتا ہے۔ چنانچہ
قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ
(۱۴)۔ ”اور ہم ان (بنی اسرائیل) پر غالب ہیں“۔ یہ خالص استبداد ہے
جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے جب کہا ہے کہ فَاتَمَسَّ الْيَتِيمَ فَلَا
تَقْهَرْ (۹۳)۔ جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے، اسے بے یار و مددگار سمجھ
کر اس پر سختی نہ کرو۔ نہ ہی اسے ذلیل سمجھو۔ یتیموں پر سختی نہ کرو۔
اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اشیائے کائنات کو اپنے تابع تسخیر
کرنا تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کسی انسان کا دوسرے انسان پر استبداد کرنا
یا اسے ذلیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔ مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا
نہایت ضروری ہے۔ ان معنوں میں یہ صفت جماعت مومنین کے لئے محمود صفت
ہوگی اور صفت خداوندی کا عکس۔ یاد رکھئے۔ قوت فی ذاتہ شر نہیں ہے۔

* تاج - ** راغب -

(خدا کی کدوئی صفت بھی ، معاذ اللہ ، شر نہیں) ۔ اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے ۔ اگر اسے کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرو تو وہ شر ہے ۔ اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کرو تو عین خیر ۔ خدا چونکہ خیر ہی خیر ہے ، اس لئے اس کی ہر قوت ، حسن اور تعمیر کے لئے ہوتی ہے ۔ یہی صورت جماعت مومنین کی ہوتی ہے ۔

ق و ب

قَابٌ* ۔ کمان کے درمیانی حصے (دستے) اور ایک کنارے کا درمیانی

فاصلہ ۔ نیز مقدار* ۔

قرآن کریم میں مقام نبوت کے متعلق ہے ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ ۔ اَوْدُنِیْ۔ (۹۳) ایام جاہلیت میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے سے محکم عہد باندھتے تو وہ دو کمانیں لیتے ۔ ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے اور اس طرح ان دونوں کا قَابٌ ایک کبر دیتے ۔ پھر ان دونوں کمانوں کو اکٹھا کھینچ کر ایک تیر چلائے ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں ۔ ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے ۔ جو ایک چاہتا ہے وہی دوسرا چاہتا ہے ۔ ہم دونوں ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں** ۔ قرآن کریم نے نبی کے متعلق بتایا کہ وہ احکام اللہ کا اس قدر متبع ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو قوانین خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اس کا اور خدا کا تعلق گویا ان ساتھیوں کا سا تعلق ہو جاتا ہے جنہوں نے قَابَ قَوْسَيْنِ والا عہد کیا ہو ۔ اَوْدُنِیْ ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب تر تعلق ۔ یہی وجہ ہے کہ حق کا استحکام جو نبی کی قوت بازو سے ہوتا ہے اسے خود خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے ۔ فَلَمَّ تَقَاتَلُوا هُمْ وَلَکِنَّ اللہَ فَتَلَهُمْ ۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلَکِنَّ اللہَ رَمٰی (۹۴) ۔ بدر کے میدان میں مخالفین حق کو تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا تھا ۔ تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے ، اللہ نے چلائے تھے ۔ نبی اور خدا کا تعلق اسی قسم کی رفاقت اور ہم آہنگی کا تعلق ہے ۔ غالب کے الفاظ میں ۔

تیر قضا ہر آئینہ در تر کش حق است

امسا کشادر آن ز کمان محمدؐ است

یہ مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے ۔ اور نبی پھر اس مقصد کے لئے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کرتا ہے ۔ اس طرح انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام

* تاج و راغب ۔ ** بحوالہ روح المعانی ۔

اس جماعت کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے وجود میں آئی ہے۔ حق کا عہد نامہ انہی کے ہاتھوں سے بلند ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو وحی خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے فیصلے اور عمل دنیا میں خیر و شر کا معیار بن جاتے ہیں، اور ان کی ”تیر اندازی“ خود خدا کی تیر افگنی ہو جاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق، جو حضورؐ نے اپنی حیات ارضی کے آخری سانس میں فرمایا تھا، خدا رفیقِ اعلیٰ ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے۔ خدا کے ساتھ اسی عہد کا نام ایمان، اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ”خدا کا قرب اور رضا جونی“ ہے۔ یعنی خدا کے پروگرام سے ہم آہنگ ہو جانا۔

ق و ت

الْقُوتُ (جمع اقْوَات) - اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے*۔
قرآن کریم میں ارض کے متعلق ہے۔ وَتَدَارِ فِيْهَا اقْوَاتُهَا (۲۱)۔ اس میں خوراک پیدا کرنے کے پیمانے مقرر کر دئے۔ ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے وہ مختلف موسموں میں خوراک پیدا کرتی چلی جائے۔

الْمُقَيَّمَتُ - محافظ - نگران۔ وہ جو ہر شخص کو اس کی روزی یا ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے۔ وہ جو مخلوقات کو ان کا رزق دیتا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو کسی چیز کی نگرانی و حفاظت کرے اور اس کی خوراک کا بند و بست کرے**۔ قرآن کریم میں ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ مُّقَيِّمًا (۲۵)۔ اس کے معنی ہوں گے کائنات کی ہر شے کو اسبابِ زیست بہم پہنچانے والا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی محافظ اور قادر کے بھی ہیں۔

ق و س

الْقُوتُ - کمان***۔ اِن کریم میں قاتِبَ قُوتِ مَسِيْنِ (۹۳) آیا ہے۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوانِ رن - و - ب) دیکھئے۔

قاسَ الشَّيْءُ بِغَمْرِهِ - کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے اندازہ کرنا* (نیز ابن فارس)۔ رہا اس قاسَ بِقُوتِ كُوتِ قاسَ بِقِيَمِيسَ پر قیاس کر لیا
* تاج - * راغب - *** تاج و راغب

جائے گا۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ اَلْمِثْوَسُ - وہ جگہ جہاں سے گھوڑے گھوڑ دوڑ کے لئے چھوٹتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ وہاں ایک رسی کمان کی شکل کی باندھ دی جاتی ہے اور اس رسی کے پیچھے سے گھوڑوں کو چھوڑا جاتا ہے*۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق - و - س) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے۔ قَتُوْسُ (کمان) میں سختی بھی پائی جاتی ہے اور اس کے دونوں سروں کے ملے ہوئے ہونے کے اعتبار سے اجتماعیت بھی**۔

ق و ل

قَوْلٌ - زبان سے کچھ کہنا، خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ ہو۔ جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قَوْلٌ کہتے ہیں۔ نیز عقیدے، خیال اور رائے کو بھی۔ جیسے قُلَانٌ یَسْقُوْلُ بِقَوْلِ الشَّافِعِیِّ وغیرہ***۔

اس کے مجازی معنی بہت سے آتے ہیں۔ مثلاً مارنا۔ غالب آنا۔ مرجانا۔ راحت پانا۔ متوجہ ہونا۔ وغیرہ***۔

تَقْوَالَ عَلَیْہِ قَوْلًا کے معنی ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا (۶۹)۔

دل میں خیال کرنے کے لئے قرآن کریم میں ہے وَ یَقْوُلُوْنَ رَفِیْ اَنْفُسِہِمُ (۹۸)۔ قَوْلٌ کی جمع اقْوَالٌ اور اس کی جمع اقْوَالِیْلٌ ہے (۶۹)۔ قِیْلٌ - کہنا۔ بات چیت۔ دل کی پکار (۳۳)۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق - و - ل) کا خاصہ حرکت کرنا اور پھڑ پھڑانا ہے۔ قَوْلٌ میں زبان یا ہونٹوں کی حرکت موجود ہوتی ہے**۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ اس کے ابتدائی اور حقیقی معنی ہیں۔ مجازی طور پر تو دل کے عقیدہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ مادہ بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کا مفہوم آسانی سے متعین ہو جائے گا۔ اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

*تاج و راغب - **العلم الخفاق - ***تاج -

ق و م

قَامَ - قِيَامًا - کھڑا ہونا - متوازن ہونا - کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا - محکم اور استوار ہونا - ثابت اور دائم رہنا - کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا - رک جانا - کسی جگہ ٹھہر جانا - بارونق ہونا* - اَقَامَ - درست اور سیدھا کیا - کھڑا کیا* -

قَامَ الرَّجُلُ الْمَرَاةَ وَقَامَ عَلَيْهِمَا - مرد نے عورت کی کفالت کی، اسکی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا - اس کے لئے رسد لایا - قَوَّامٌ - سامان رزق مہیا کرنے والا، کیونکہ رزق سے معاشقہ زندگی کا توازن قائم رہتا ہے* - اَلشَّرُّ جَالٌ قَوَّامٌ مَوْنٌ عَلَى النَّبِيِّ (۳۳) کے یہی معنی ہیں - یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے - اس کے معنی حاکم یا داروغہ نہیں ہیں - نِزْرٌ قَوْمٌ الشَّيْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا* -

قَوَّامٌ - عدل و توازن - وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے - اتنا کچھ جس سے صرف ضروریات زندگی پوری ہو سکیں - قِوَامٌ - وہ چیز جس پر کسی معاملہ کا دارو مدار ہو - وہ جس کے سہارے کوئی معاملہ کھڑا رہ سکے - اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے - چنانچہ قُلَانٌ قِوَامٌ اَهْلٍ بَيْتِهِ کے معنی ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہے* -

قَامَۃٌ - آدمی کا قد - قد کا متوازن طول - حسن قامت* - قِيَمَۃٌ - کسی چیز کا بدل* - جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی جائے اور وہ اس کے برابر تصور کر لی جائے، تو وہ اسکی قِيَمَۃٌ ہو جائیگی - اِسْتَقَامَ اَلْاَمْرُ - کسی معاملہ کا معتدل و متوازن ہو جانا* - مَسْتَقِيْمٌ - معتدل و متوازن - ٹھیک ٹھیک توازن و تناسب لئے ہوئے* - تَقْوِيْمٌ - عدل و توازن برقرار کرنا* - (تَقْوِيْمُ الْبِلَادِ) - جغرافیہ کے نقشہ کو کھینچنے ہیں - اور اَجَلٌ تَقْوِيْمٌ کا لفظ کیلنڈر، جنتری، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے** - مَقَامٌ - کھڑے ہونے کی جگہ* - قِيَامٌ - وقایہ* - اپنی مخلوق کے معاملات کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ انکی پیدائش، اور روزی بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے رہنے کے مقاصد کا علم رکھے - جو ہر چیز

ہر نگران ہو۔ نیز قِيَّوْم کے معنی قائم بالذات بھی ہیں۔ یعنی جو اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو، لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جاسکے۔ (۲۵۵: ۱۱۱) ***۔ اَمْرٌ قَيِّمٌ کے معنی ہیں مستقیم و مستوی امر۔ معتدل و متوازن کام *۔ خَلْقٌ قَيِّمٌ *۔ متوازن اخلاق۔ دَرِیْنٌ قَيِّمٌ *۔ ایسا دین جس میں ہر شے متوازن و متناسب ہو۔ کَتَبَ قَيِّمَةً *۔ وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں *۔ قَوْمٌ *۔ مردوں اور عورتوں کی جماعت۔ یا صرف مردوں کی جماعت جس میں عورتیں نہ ہوں *۔

مفردات امام راغب میں ہے کہ قِیَّامٌ لِلشَّیْءِ سے کسی چیز کی رعایت اور حفاظت مقصود ہوتی ہے اور کبھی قِیَّامٌ عَزْمٌ اور پختہ ارادے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور قِیَّامٌ اور قِیَّوْمٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز مضبوط اور مستحکم رہ سکے۔ قِيَّوْمٌ *۔ ہر چیز کا نگران۔ نیز اسے استحکام و توازن بخشنے، حفاظت کرنے اور وہ تمام چیزیں مہیا کرنے والا جو اسکی بقا و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔

قِیَّامَةٌ کا اصلی مفہوم ہے انسان کا یکبارگی اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ لفظ قِیَّامٌ کے آخر میں ”ة“ کے اضافہ سے بنا ہے جس سے مطلب ہے یکبارگی ہونا۔ القِیَّامَةُ سے مراد اس خاص گھڑی کا واقع ہو جانا ہے جس میں انسان اس طرح یکبارگی کھڑا ہو جائے۔

إِقَامَةُ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا پورا پورا حق ادا کر دینا۔ نیز الْإِقَامَةُ فِي الْمَكَانِ کسی جگہ جم کر رہنے کے معنوں میں آتا ہے **۔ اس سے مَقِیْمٌ، ہمیشہ رہنے والے کے لئے آتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی توازن قائم رکھنے کے ہیں۔ لہذا اس سادہ سے جتنے الفاظ آئیں گے ان میں یہ بنیادی مفہوم ضرور موجود رہے گا۔ خواہ یہ توازن جسمانی ہیئت و پیکر کا ہو، یا معاشرتی اور تمدنی توازن، یا نفسیاتی توازن۔ جس چیز کا توازن بگڑ جائے وہ قائم (کھڑی) نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ قصہ حضرت موسیٰ کے ضمن میں یتیم بچوں کی دیوار کے متعلق ہے۔ جِدَّارًا یُرْبِدُ أَنْ یَنْقَضَ فَاَقَامَتْهُ (۱۸: ۱۸) وہ دیوار گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے قائم (کھڑا) کر دیا۔ اسی سورہ (کہف) کے شروع میں قِیِّمًا کے پہلے لَمْ یَجْعَلْ لَہٗ عِوَجًا (۱۸: ۲) سے واضح کر دیا کہ قِیِّمٌ وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ اسی سے دَرِیْنٌ الْقَیِّمَتَہِ (۹۸) اور کَتَبَ قَیِّمَةً *۔ (۱۸: ۱۸) کے معنی واضح ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے کہ وہ ایسی راہ بتاتا ہے جو

اَقْوَمُ* (۱۶) ہے۔ یعنی سب سے زیادہ سیدھی اور معتدل۔ اور انسان کے متعلق ہے کہ اسے اَحْسَنَ تَقْوَرِیْمِ* (۱۷) میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی بہترین توازن کا حامل۔ اَلْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ* (۱۸) ”سیدھی ترازو“ سے مُسْتَقِیْمِ* کے معنی واضح ہیں۔ یعنی سیدھی راہ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسقدر متوازن کہ ذرا سی افراط و تفریط بھی اس کا توازن بگاڑ دے۔ جس طرح سورہ فرقان میں افراط و تفریط کی دو راہوں کے درمیان، اعتدال کی روش کو کَانَ بَیْنَ ذَٰلِکَ قَوَامًا* (۱۹) کہا گیا ہے۔

سورہ بقرہ میں مَسْئِیٰ* کے مقابلہ میں قَامَ* لاکر (۲۰) بنا دیا ہے کہ اس کے معنی رک جانے اور ٹھہر جانے کے ہیں۔ نیز ظَعْنُ* (کوچ) کے مقابلہ میں اِقَامَۃ* سے اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے (۲۱)۔ اسی طرح سورہ ہود میں اجڑی ہوئی بستیوں (حَصِیْرٌ*) کے مقابلہ میں قَنَائِمِ* (۲۲) لاکر بہ واضح کر دیا ہے کہ اس کے معنی آباد اور ہر رونق کے ہیں۔ نیز سَبِیْلِ مُقِیْمِ* (۲۳) کے معنی بھی بارونق اور چلتے ہوئے راستے کے ہیں۔ سورہ تکویر میں لَیْمَنَ شَاءَ مِیْنُکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ* (۲۴) سے صِرَاطُ مُسْتَقِیْمِ* (۲۵) ہر چلتے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

قیامۃ* کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ہے جن کا مفہوم بڑا جامع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، (ابام راغب کے قول کے مطابق) اس کا مفہوم ہے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔ اس دنیا میں قیامۃ* کسی قوم کی وہ نشاۃ ثانیہ (حیات جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ہو۔ اور مرنے کے بعد دوسری زندگی نو ہے ہی ایک انقلابی ظہور۔ قیامت، آخرت، مساعت، بعث، وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آ جاتا ہے۔ ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃ ثانیہ ہیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام۔ [شاہ ولی اللہؒ - حجة الله البالغہ - کتاب الفتن میں لکھتے ہیں کہ ”زبان شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک ملک شام میں لوگوں کا جمع ہونا۔ قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (جنگ) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے*۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد اکٹھا

* غالباً مغلوں کے شام پر حملہ کی طرف اشارہ ہے جو تیمور کی زہر سر کردگی ہوا تھا۔ خود شاہ صاحب نے اس کا ذکر چند مطوّر آگے چل کر کیا ہے۔

ہونا“۔ [اسی طرح قیامت کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور موت کے بعد کے قیام کے لئے بولا جائیگا۔

قوم - قومیت - جب انسان نے انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر تمدنی اور اجتماعی زندگی شروع کی تو اس کا آغاز لامحالہ خاندان اور قبیلہ سے ہونا تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (اور خاندان سے آگے بڑھ کر ایک قبیلہ) کے افراد ایک وحدت قرار پا گئے جن میں وجہ جامعیت خون کا رشتہ (یا نسبی تعلق) تھا۔ جب مختلف گروہوں میں باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا۔ اس طرح ایک قبیلہ کے افراد میں باہمی عصبیت اور دوسرے قبیلہ کے افراد کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ اور یوں انسانی وحدت (مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر) پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے قومیت یا نیشنلزم کہتے ہیں، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس میں صرف اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ بعض ممالک میں (ایک نسل کے بجائے) ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والے افراد کو ایک قوم قرار دیدیا جاتا ہے۔

اسلام نے انسانوں کی تقسیم کا یہ اصول بدل دیا اور کہہ دیا کہ ایک نظریہ زندگی کے مانتے والے انسان (بلا لحاظ نسل - زبان - وطن) ایک برادری کے افراد ہیں اور اس کے برعکس نظریہ کے قائل، دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ایمان اور کفر کی تفریق، اور دور حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی تمیز کہتے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآنی ضابطہ حیات کو صحیح مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے خلاف کسی اور مسلک حیات کے قائل ہیں (۱۳)۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ خود تیرا بیٹا بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں (۱۴) کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، تو وہ اسی اصول کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب حضرت لوطؑ سے کہا تھا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں کیونکہ وہ ان کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی، تو وہ بھی اسی اصول کی بنا پر تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم سے کہہ دیا تھا کہ تم میرے اپنے نہیں ہو سکتے جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ، تو وہ بھی اسی حقیقت کا اظہار تھا (۱۵)۔ اس کے برعکس انہوں نے اس اصل عظیم کا اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں جو میرا اتباع کرتے ہیں (۱۶)۔ اسی معیار کے مطابق، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جب کہا کہ لَنَقُومَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ (۱۷) ”سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں“ خواہ ان کا رنگ، نسل، زبان، وطن، کوئی بھی ہو۔

یہ ہے صحیح قومیت کا معیار جس کی رو سے قرآن کریم ، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے ۔ اب دنیا ، قومیت کے غلط اصول سے تنگ آکر خود اس حقیقت کی معترف ہو رہی ہے کہ انسانوں کے لئے صحیح وجہ جامعیت ہم آہنگی فکر و نظر (آئیڈیالوجی کی یکسانیت) ہے ، نہ کہ اشتراک رنگ و وطن ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا قرآنی اصول زندگی کو اختیار نہیں کرتی عالم انسانیت میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا ۔ اسی سے وہ عالمگیر برادری وجود میں آسکتی ہے جو انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر، وحدت انسانیت کے اصول کی حامل ہوگی ۔ یہی قرآنی معاشرہ کا مقصود و منتہی ہے ۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے مسلک اور روش زندگی کو ”صراط مستقیم“ سے تعبیر کیا ہے (۱) ۔ یعنی سیدھی اور توازن بدوش راہ ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے ۔ قرآن کریم سے پہلے ، ارباب فکر اور اہل مذاہب ، زندگی کی حرکت کو دوری (Cyclic) تسلیم کرتے تھے ۔ حکمائے یونان نے جب دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصود فطرت ”دائرہ“ ہے ، سیدھا چلنا نہیں ۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دوری ہے ۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے ، آگے نہیں بڑھ رہی ۔ اسی سے فیثاغورث نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا ۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح ، جوں بدل بدل کر ، بار بار اس دنیا میں ، مختلف قالبوں میں آتی ہے ۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جاتا ، مقصود حیات ہے ۔ یہی تصور ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے ۔ یعنی انسانی روح درحقیقت خدا کی روح (ہم آتما) کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر ، زندگی کے چکر میں بھنس چکی ہے ۔ اس کا ان چکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے ”کل سے جدا ملنا، مقصود زندگی ہے ۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی سے ”وحدت الوجود“ کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے جو ہمارے تصوف کی بنیاد ہے ۔ یہی ”چکر“ عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کا گناہ ، پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے ۔ اگر وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ اس سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے ۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لئے (گوسالہ ہرستی کی) غلطی ہو گئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑے گا ۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہی اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے جو وہ پہلے تھے۔ یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں۔ (As you were) ہو جانا مقصودِ حیات ہے۔ دوری حرکت (Cyclic Movement) سے بھی مراد ہے۔ یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا۔

قرآن کریم نے اربابِ فکر اور اہلِ مذاہب کے اس غلط نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کو لہو کے بیل کی طرح، ایک دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں۔ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے۔ خدا، کائنات کو صراطِ مستقیم پر لئے جا رہا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱۱)۔ اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ يَزِدُّ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۵)۔ اور انسان کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کی ممکنات (Possibilities) ودیعت کر دی گئی ہیں اور جدوجہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے۔ جو شخص، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، اس کی ممکنات، مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفرِ زندگی میں آگے بڑھتا جائیگا۔ اس طرح اس کا سفر، ایک دائرے میں نہیں، بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا۔ اس سے اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائیگا۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنّ طَبَقٍ (۴۲) ”تم ضرور منزل بہ منزل۔ درجہ بہ درجہ۔ بلند ہوتے چلے جاؤ گے“۔ اس لئے، خدا صرف صراطِ مستقیم (میدہی اور توازن بدوش) راہ ہی کا مالک نہیں۔ وہ ذیُّ السَّعَادَاتِ (۳۳) بھی ہے۔ یعنی ”سیڑھیوں والا“۔ بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، زندگی کا منتہی (As you were) ہو جانا نہیں۔ بلکہ ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانونِ ارتقاء کارفرما ہے۔

زندگی کی دوری حرکت کا تصور، عہدِ کھن کے انسانی ذہن ہی کا مغالطہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں بھی جہاں انسانی فکر نے وحی سے روشنی نہیں لی، وہ اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیشے کا ”تکرارِ ازل“ (Eternal Recurrence) کا نظریہ اسی مغالطہ کا رہین منت ہے۔ ہیگل کا نظریہٴ اضداد بھی اسی کا مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر جب یہ دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس

کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ تصورات (Ideas) کا بھی چکر ہے جو کائنات میں کارفرما ہے۔ ہیگل (Hegel) کے متبع سارکس (Marx) نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں نہیں بلکہ نظامہائے زندگی (Social Orders) میں کارفرما ہے۔ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے نظام کے لئے پیغام مرگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد، نظام اشتراکیت پیدا ہو گیا۔ اب اس کی باری ہے۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریہ زندگی عطا کر سکتی ہے۔ اور وہ نظریہ زندگی ہے ”صراطِ مستقیم“ پر چلنا۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے رہ کر جامد اور متصلب (Static) ہو جانا، اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور ہموار راستے پر چلتے جانا اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جانا۔ ”حرکت اور ارتقاء“ یہ ہے قرآنی نظریہ زندگی کا ماحصل جسے اس نے ”صراطِ مستقیم“ سے تعبیر کیا ہے۔

ق و ی

تَوَاتُ - دراصل رسی کے ایک بٹ کو کہتے ہیں۔ (جس کی جمع اَلتَّوَاتُیٰ ہے)۔ حَبْلٌ تَوَاتُ - مختلف بٹوں والی رسی۔ یہیں سے اَلتَّوَاتُیٰ کے معنی قدرت کے ہیں۔ یہ ضَعْفَت کی ضد ہے، خواہ جسمانی ہو یا عقلی۔ اسکی جمع قِوَاتُ اور قُوَاتُ ہے۔ اَلقُوَاتُ طاقتور اور قوت والے کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اس لئے کہ حکمال قوت اور ہر قسم کی طاقت کا وہی تنہا مالک ہے (۱۶۱)۔ فَرَسٌ مَّقْوٍ - طاقتور گھوڑا*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے ایک بنیادی معنی تو سختی، قوت اور زور کے ہیں لیکن دوسرے بنیادی معنی قلتِ خیر۔ یعنی مال و دولت اور عمدہ چیزوں کی کمی کے ہیں۔ اس اعتبار سے اَلقُوَاتُ ویران زمین کو کہتے ہیں اور اَلتَّوَاتُیٰ بھوک کو کہتے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔

* تاج و محیط - ** بٹ کے معنی بھی سمجھ لئے چاہئیں۔ مثلاً تین باریک رسیوں کو بٹ دیکر ایک موٹی رسی بنائی جائے۔ تو ان تین رسیوں میں سے ہر ایک کو اس موٹی رسی کا بٹ کہہ سکتے ہیں۔

أَقْوَاتِ الدَّارِ۔ گھر خالی ہو گیا۔ اس اعتبار سے چٹیل میدان کو بھی الْقَوَاءُ کہتے ہیں جو سبزی سے خالی ہو چکا ہو۔ الْقَوَائِیْتُ۔ انڈے کے خالی چھلکے کو کہتے ہیں جس سے بچہ نکل چکا ہو۔ الْقَوَائِیْتُ الْقَوَائِیْتُ۔ اُس سال کو کہتے ہیں جس میں بارش بہت کم ہوئی ہو۔ أَقْوَى السَّرَّاجِلِ۔ بے آب و گیاہ زمین میں اس کا توشہ ختم ہوا۔ وہ بھوکا اور نادار ہوا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا، خواہ وہ ایسی ناداری کی حالت میں اپنے گھر اور اپنی قوم کے درمیان ہی کیوں نہ ہو*۔

قرآن کریم نے زمین کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ وہ مَتَاعًا لِلْمُتَوَرِّثِينَ (۵۶) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ کے ان افراد کے لئے ہے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ یعنی زمین کی پیداوار انسانی پرورش کے لئے ہے نہ کہ ذاتی اسلاک بنا لینے کے لئے۔ صاحب محیط نے مَتَوَرِّثِينَ کے معنی لکھے ہیں وہ جن کے پیٹ یا توشہ دان کھانے سے خالی ہوں**۔ یا وہ لوگ جو بے برگ و گیاہ میدان میں اتریں جہاں کھانے کو کچھ نہ ہو۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورت مند افراد۔ اسی کو دوسری جگہ سَوَاءٌ لِّلْیَسَّائِلیْنِ (۱۶) کہا گیا ہے۔ یعنی زمین کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ قُوَّةٌ۔ کے لئے قرآن کریم میں ہے۔ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ (۱۲)۔ اس ضابطہ خداوندی کو نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ پختہ عزم کرو کہ اس کی تعمیل کرو گے۔ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِّیْنِ (۵۸)۔ زہر دست قوت والا۔ خدا۔ شَدِيدُ الْقُوَّةِ (۵۳)۔

لہذا، موس بھی (حد بشریت کے اندر) صاحب قوت ہوتا ہے۔ کمزور اور ناتواں نہیں ہوتا۔ جو قوم کمزور اور ناتواں ہو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق جماعت مومنین نہیں ہے۔ لیکن ان کی قوت دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ہوگی، نہ کہ کمزوروں کو لوٹنے کھسولنے اور ناتوانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے۔ قوت جب ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کی جائے تو خیر ہوگی اور جب مظلوم کو لوٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو شر ہو جائیگی۔

ق ی ض

الْقَيْضُ۔ انڈے کے اوپر کا خشک اور سخت جھلکا۔ قَيْضٌ۔ کسی کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح لگا دینا کہ وہ اس کے ساتھ چپکی بھی رہے* تاج و محیط۔ ** ابن قتیبہ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں (القرطبی - ج ۲/ صفحہ ۱۵۵)

اور اس پر غالب بھی رہے ، جس طرح انڈے کا چھلکا اس کی زردی و سفیدی پر مستولی رہتا ہے * - قرآن کریم میں ہے وَقَدْ يَفْضُنَا لَهُمْ قُرْنَاءَ (۲۵) - اور ہم نے ان کے لئے ان کے ساتھی لازم کر رکھے ہیں جو ان پر مستولی رہتے ہیں -

ق ی ع (ق و ع)

الْقَاعُ * - ہموار نشیبی زمین جو وسیع ہو اور اس میں نشیب و فراز نہ ہو - نہ اس میں کنکریاں ہوں نہ پتھر اور نہ ہی اس میں درخت پیدا ہوتے ہوں - صاف چٹیل میدان جس میں ٹیلے اور پہاڑ نہ ہوں - قَاعَةُ الدَّارِ - گھر کا صحن یا میدان - صاغانی نے کہا ہے کہ ق - و - ع کی ترکیب کسی جگہ میں پھیلنے پر دلالت کرتی ہے * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جگہ میں کشادگی کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۶) - صاف چٹیل میدان جسکی تمام اونچ نیچ ختم ہو جائے - اس کی جمع قِيعَةٌ آتی ہے - ویسے قِيعَةٌ قَاعُ کے ہم معنی بھی ہے - سورۃ نور میں ہے - كَسْرَابٍ بِقِيعَةٍ (۲۷) - چٹیل میدان میں مراب کی طرح -

ق ی ل

قَالَ - يَقِيلُ * - قَيْلًا - قَيْلُولَةً * - دوپہر کو سونا - یا دوپہر کے وقت محض استراحت کے لئے لیٹنا ، خواہ اس میں سویا نہ جائے - الْقَيْلُ * - دودھ جو دوپہر کو پیا جائے - یا دوپہر میں کوئی چیز پینا - الْقَيْلُولَةُ * - قیلولہ کرنے کی جگہ * * - (۲۸) - قرآن کریم میں ہے أَوْ هُمْ فَنَائِلُونَ (۲۹) - یا جبکہ وہ دوپہر کو آرام کر رہے ہوں -